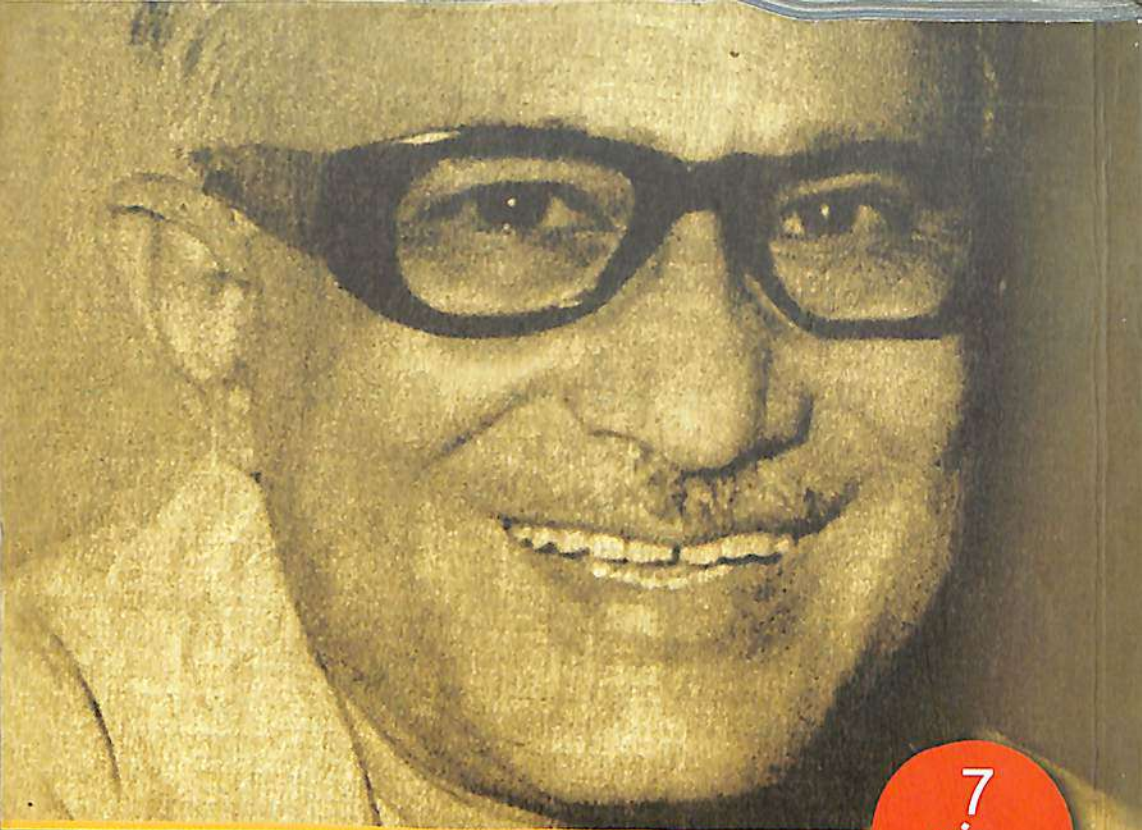

7
جلد ہفتم

کلیات

خواجہ احمد عباس

کلیات خواجہ احمد عباس

(جلد ہفتم)

سوانح اور سفرنامے

مرتب

ارتضیٰ کریم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2017

تعداد : 550

قیمت : -/195 روپے

قیمت سیٹ : -/1935 روپے

سلسلۂ مطبوعات : 1965

Kulliyat-e-khwaja Ahmad abbas (Vol.VII)

Compiler: Prof.Irteza Karim

ISBN No :978-93-87510-30-2

Set ISBN: 978-81-934243-9-1

ناشر: ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر:49539000، فیکس:49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر:26109746

فیکس:26108159 ای۔میل:ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، ڈی 31، ایس ایم اے انڈسٹریل ایریا، نزد جہانگیر پوری میٹرو اسٹیشن، دہلی۔110033

اس کتاب کی چھپائی میں 80GSM_Natural Color کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

خواجہ احمد عباس اردو کے اہم اور منفرد ادیب رہے ہیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے اور مضامین بھی۔ صحافت سے بھی وابستہ رہے۔ انہوں نے فلمیں لکھیں، ڈائریکٹ بھی کیں، کئی اسکرپٹ بھی لکھے علاوہ ازیں مضامین، سفرنامے اور سوانح بھی ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے معاصر ادیبوں میں ان کا قد نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ راقم نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔

یہ کلیات آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی، دوسری اور تیسری جلد خواجہ احمد عباس کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ پہلی اور دوسری جلد میں ان کے افسانوی مجموعے 'ایک لڑکی'، 'پاؤں میں پھول'، 'زعفران کے پھول'، 'میں کون ہوں'، 'کہتے ہیں جس کو عشق'، 'گیہوں اور گلاب'، 'دیا جلے ساری رات'، 'نئی دھرتی نئے آسمان'، 'نیلی ساڑی' اور 'سونے چاندی کے بت' کے افسانے شامل ہیں۔

'سونے چاندی کے بت' خواجہ احمد عباس کا دسواں افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں کل نو کہانیاں دس خاکے اور چھ شخصی مضامین شامل ہیں۔ چنانچہ دوسری جلد میں صرف نو کہانیوں کو ہی

شامل کیا گیا ہے۔ خاکے اور مضامین کو آٹھویں جلد میں شریک کیا گیا ہے۔

تیسری جلد میں خواجہ احمد عباس کی وہ انتالیس کہانیاں شامل ہیں جو ان کے کسی مجموعے میں شریک نہیں ہیں اور پہلی بار کتابی شکل میں سامنے آ رہی ہیں۔ ان میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اردو اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ جیسے اس انتخاب میں ایک کہانی ''اچھن کا عاشق'' بھی شامل ہے۔ جو ہندی میں ''شونیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں کے حوالے سے یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے کئی افسانوں کے عنوان بدل کر ہندی میں بھی شائع کرایا ہے۔ اس ضمن میں ''کولڈ ویو/سرد لہر'' مایا نگری/پنچھی، پنجرہ اور اڑان، ہاتھ کا میل/بھکارن، اسپرٹ/رلس، چمتکار/معجزہ۔ بعض کہانیاں مثلاً ''ہاتھ کا میل'' اور ''بھکارن'' متن کے اعتبار سے بھی مختلف دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ متن کی یہ تبدیلی آیا خواجہ احمد عباس نے کی ہے یا اردو سے ہندی ترجمہ کرتے وقت یہ آزادی مترجم نے لے لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہانی ''ہاتھ کا میل/بھکارن'' اپنے دو مختلف متون کے ساتھ یہاں شریک کر لی گئی ہے۔ تاکہ قارئین کو اس کے اختلاف متن کا اندازہ ہو سکے۔ نیز تحقیق کے طالب علموں کو اس سے کچھ رہنمائی حاصل ہو سکے۔

چوتھی، پانچویں اور چھٹی جلد ان کے ناولوں پر محیط ہے: چار دل چار راہیں، شیشے کی دیواریں، بمبئی رات کی بانہوں میں، اندھیرا اجالا، انقلاب، دو بوند پانی، فاصلہ، تین پہیے، ساحل اور سمندر، چار یار۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ناول ''چار یار'' ماہنامہ بیسویں صدی دہلی میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اب اس شکل میں پہلی بار منظر عام پر آ رہا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور ناول جو 'ایک اور پریم کہانی'، 'ساحل اور سمندر'، 'ہیلو مس مالتی' جیسے مختلف عنوان سے بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ یہ ناول بھی پہلی بار اس کلیات میں شامل ہوا ہے۔ ایک جاسوسی ناول جس کی پہلی قسط طبی دنیا دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کلیات میں شریک ہے۔ اس کی وضاحت بھی مقدمے میں کر دی گئی ہے۔

ساتویں جلد سوانح اور سفرنامے پر مشتمل ہے جس میں: مسولینی فاشیت اور جنگِ حبش، مولانا محمد علی، خروش چیف کیا چاہتا ہے؟ فلمیں کیسے بنتی ہیں؟ جیسی تحریریں شامل ہیں۔ خواجہ احمد

عباس کے چین، جاپان اور دوسرے ممالک کے سفر کی روداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس سفرنامہ کچھ اس اسلوب میں لکھتے ہیں کہ قاری بھی ان کا شریک سفر ہو جاتا ہے۔

آٹھویں جلد میں ان کے ڈرامے 'زبیدہ'، 'اناس' اور 'ایٹم بم' وغیرہ شامل ہیں۔ کئی ڈراموں کی اشاعت اور اسٹیج ہونے کی خبر بھی اس زمانے کے رسائل اور جرائد میں نظر آتی ہے۔ مگر تحقیق کے طالب علم کو اس کی دستیابی میں مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔ مثلاً ڈراما 'یہ امرت ہے' یا 'پرچم' تک رسائی نہ ہوسکی۔ 'لال گلاب کی واپسی'، بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا اور اس شکل میں پہلی بار سامنے آرہا ہے۔ ان ڈراموں کے مضامین بھی متنوع رہے ہیں۔ فلمی دنیا سے لے کر ادبی شخصیات پر انہوں نے مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین کو بھی اس کلیات میں شامل کرلیا گیا ہے۔

میں یہاں قومی اردو کونسل کے جملہ ممبران اور اراکین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت کی سبیل پیدا کی۔ ڈاکٹر شمس اقبال جو قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ہیں۔ انھوں نے بطور خاص اس کلیات بلکہ ضخیم کلیات کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ ہر چند کہ میں اس کے لیے راضی نہیں تھا کہ یہ کلیات قومی کونسل سے شائع ہو لیکن ان کا یہ اصرار کہ آپ صرف قومی کونسل کے ڈائریکٹر نہیں ہیں بلکہ آپ کی بنیادی حیثیت اردو کے ایک محقق اور تنقید نگار کی ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس کلیات کی اشاعت کا سب سے زیادہ حق قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ہی حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی محبت کے طفیل کلیات خواجہ احمد عباس کی یہ آٹھ جلدیں آپ کے مطالعے کے لیے حاضر ہیں۔

اگر اس کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو اس کی نشان دہی فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں اسے دور کیا جاسکے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسند کی جائے گی۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

فہرست

○ پیش لفظ iii

○ اعتذار ix

سوانح

-1 مسولینی فاشیت اور جنگ حبش 3

-2 مولانا محمد علی جوہر 47

-3 خروشچیف کیا چاہتا ہے؟ 85

سفرنامے

-4 سرخ زمین اور پانچ ستارے 204

-5 مسافر کی ڈائری 239

اعتذار

خواجہ احمد عباس اپنے موضوعات، اسلوب اور آہنگ کے باوصف اردو کے منفرد فکشن نگار (افسانہ نگار، ناول نویس، ڈراما نگار) ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ ان کے فکشن کے سرمایے کے تجزیے کے لئے اردو فکشن کی تنقید کو نئے محاورے کی ضرورت پیش آئے گی کیوں کہ ان کا ''سرمایۂ فکشن'' اپنے معاصرین کے فکشن سے مختلف بھی ہے اور منفرد بھی۔

خواجہ احمد عباس کو اس بات کا احساس تھا کہ:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے، مسلماں ہوں میں

چنانچہ اپنی تخلیقات کے حوالے سے مفتیان اردو ادب یا اپنے نکتہ چینوں کی رائے انہوں نے بار بار نقل کی ہے، ان کے الفاظ ہیں:

''ادیب اور نقاد کہتے ہیں: خواجہ احمد عباس ناول یا افسانہ نہیں لکھتا۔ وہ محض صحافی ہے، ادب کی تخلیق اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ فلم والے کہتے ہیں: اس کے فیچر فلم بھی محض ڈاکومنٹری ہوتے ہیں۔ وہ کیمرے کی مدد سے صحافت کرتا ہے۔

آرٹ کی تخلیق نہیں۔ اور خواجہ احمد عباس خود کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے: مجھے کچھ کہنا ہے...اور وہ میں ہر ممکن طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا ہوں کبھی بلٹز میں ''آخری صفحہ'' (Last Page) اور ''آزاد قلم'' لکھ کر، کبھی دوسرے اخباروں اور رسالوں کے لیے مضمون لکھ کر، کبھی افسانے کی شکل میں، کبھی ناول کی، کبھی ڈاکومنٹری فلم بنا کر، کبھی دوسروں کی فلموں کی کہانی یا ڈائیلاگ لکھ کر، کبھی کبھی خود اپنی فلم ڈائرکٹ کر کے۔

اور جو مجھے کہنا ہے وہ صرف یہی ہے کہ انسان کی اندرونی زندگی، اس کے ذاتی نفسیاتی مسائل اور اس کی بیرونی، سماجی اور اقتصادی زندگی میں ایک گہرا تعلق اور رشتہ ہے جو کچھ دنیا میں اس کے اپنے ملک اور اس کے سماج میں ہوتا ہے، اس کا اثر اس کے اپنے کردار پر اور اس کے افعال پر پڑتا ہے، جیسے جیسے دنیا، سماج، ملک کا اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظام بدلتا جاتا ہے اسی طرح انسان بھی بدلتے رہتے ہیں۔''

(خواجہ احمد عباس نمبر، ایوان اردو دہلی، دسمبر 1987ء، ص:66)

خواجہ احمد عباس کی تحریریں اور تخلیقات، عوامی ادب کا بہترین اور قیمتی اثاثہ ہیں۔ عوامی ادب، ممکن ہے ادب عالیہ کا حصہ کبھی نہ بنے لیکن ادب عالیہ کو حیات بخشنے، اسے اعتبار اور اعتماد بخشنے میں اس کا اساسی کردار ہوتا ہے۔ عوامی ادب نہ ہو تو ادب عالیہ کے سوتے خشک پڑ جائیں گے۔ کمال یہ ہے کہ عوامی ادب اگر لامحدود ہوتا ہے تو ادب عالیہ کے قارئین بہت محدود بلکہ مخصوص ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا اثر بھی سماج کی تبدیلی اور تعمیر میں بہت کم ہوتا ہے۔

میر نے کہا بھی ہے کہ:

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

خواجہ احمد عباس بھی عوام سے ہو کر خواص تک اپنی بات پہنچانا چاہتے تھے اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں، جتنا لکھا ہے ان کو پڑھنے کے لئے وقت

درکار ہے۔ پھر یہ لکھنا اگر محض قلم سے لکھنا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، مضامین، تبصرے، کالم، خاکے کے علاوہ سیلولائڈ، گویا قلم سے کام نہ بنا، یا مطمئن نہ ہوئے تو ''فلم'' کا سہارا لیا۔ غالب کو تو صرف غزل ہی سے شکایت تھی۔

بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مگر خواجہ احمد عباس کاغذ اور قلم پر بھی قناعت نہ کر سکے اور سماج کی تنگی دامانی کے علاج کے لئے ''اظہار کے مختلف پیرائے'' کا سہارا لیا۔ خواجہ احمد عباس کی ادبی فتوحات کے اتنے رنگ ہیں کہ کسی ایک مضمون میں ان تمام پہلوؤں پر اجمالاً تو کیا مفصل گفتگو بھی ممکن نہیں ہے۔ تادمِ تحریر خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کی قلمی اور فلمی خدمات کا ایماندارانہ جائزہ نہیں لیا جاسکا ہے۔ ان پر لکھی جانے والی زیادہ تر کتابیں تشنہ ہیں۔

●

خواجہ احمد عباس جو ایک متوسط طبقے کے ہر نوجوان کی طرح پڑھ لکھ کر ڈاکٹر یا انجینئر بننا چاہتے تھے اور خود ان کے والدین کی بھی یہی خواہش اور کوشش تھی۔۔ لیکن علی گڑھ میں ان کے چچازاد بھائی خواجہ غلام السیدین کی ایک تقریر نے ان کے نہ صرف زاویۂ نظر کو بدل دیا بلکہ زندگی کا رخ بھی موڑ دیا۔ انھوں نے اسی پل یہ فیصلہ لے لیا کہ انھیں اپنے بھائی جان کی طرح صحافی ہی بننا ہے۔ خواجہ احمد عباس کے ہی الفاظ ہیں:

> ''1925 کا ذکر ہے... کوئی پانچ چھ ہزار کا مجمع ہوگا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح، سر آغا خاں، سر محمد اقبال، سر علی امام، ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ ''ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہیے، اپنی سیاسی تنظیم علاحدہ نہیں کرنی چاہیے۔'' یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی... اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رخ موڑ

دیا۔ اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا... اب صحافی اور مقرر اور
سیاست داں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔"

(غبارِ کارواں، آجکل جولائی 1971)

یہ ایک طویل مضمون کا حصہ ہے جسے میں نے ادھر اُدھر سے حذف کر کے آپ کے سامنے اس لیے رکھا ہے کہ میری بات کو تقویت ملے۔ کوئی چاہے تو تفصیل کے لیے ان کی انگریزی میں موجود سوانح "I am not an Island" سے بھی رجوع کر سکتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے زمانہ طالب علمی میں ہی علی گڑھ سے ہی ایک اخبار Aligarh Opinion کے نام سے جاری کیا، جسے آج بھی کسی یونی ورسٹی کے طالب علموں کا پہلا ہفتہ وار اخبار کہا جا سکتا ہے۔ Aligarh Opinion نکالنے کی پاداش میں اس زمانے کے نائب شیخ الجامعہ نے انھیں یونی ورسٹی سے اخراج کی دھمکی بھی دی تھی۔ مگر اقبال کے اس شعر:

میں کہاں رکتا ہوں عرش و فرش کی آواز سے
مجھ کو جانا ہے، بہت اونچا، حد پرواز سے

کے مصداق دورانِ تعلیم ہی انھوں نے 'ہندوستان ٹائمز' اور 'بمبئی کرانیکل' کے لیے نامہ نگار کی خدمات انجام دیں۔ بی اے کے فوراً بعد دہلی کے ایک اخبار 'National Call' کے دفتر میں تین مہینے بحیثیت کارآموز (apprentice) کام کیا۔ خواجہ احمد عباس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

Let me record here that three months period in the
'National Call' really made me into a journalist

(I am not an Island: P 72)

خواجہ احمد عباس بنیادی طور پر ایک صحافی تھے مگر ایک ایسے صحافی جو باکردار تھے، جو کسی کے استحصال یا کسی کو استعمال کرنے کے پیش نظر قلم نہیں اٹھاتے تھے بلکہ حق اور سچائی کی آواز بلند کرنے کے لیے، نہایت بے باک انداز میں اپنی بات کہتے تھے۔ صحافت کے راستے سے ہی وہ فلم کی دنیا میں داخل ہوئے تھے، یعنی پہلے پہل وہ فلم پر تبصرہ لکھتے تھے اور اپنی بے باک رائے کی بنیاد پر ہی انھوں نے 'فلم مبصر' کا ایک معتبر مقام حاصل کر لیا تھا۔ قلم سے فلم تک کا ان کا سفر نہایت دلچسپ رہا ہے۔ وہ خود یہ بات کہتے تھے کہ میں نے اپنا سفر دو نقطے سے شروع کیا تھا اور 'ایک

نقطے پر مکمل کیا۔ اگر چہ اس میں ان کو مالی اعتبار سے نقصان ہی اٹھانا پڑا، لیکن ان کی تشفی اس امر میں تھی کہ وہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکے۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ صحافت اور فلم میں کچھ وصف قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے یعنی دونوں کا سروکار ہمارا عصری سماج، ہمارا اپنا زمانہ ہوتا ہے، نیز دونوں کی رسائی عام انسان تک ہوتی ہے۔ خواجہ احمد عباس کی تحریروں کا تعلق اسی لیے عام سماج کے عام آدمی سے ہوتا ہے اور ان کا مقصد حیات بھی یہی تھا کہ ان کی بات، ان کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے، اس حوالے سے ان کو خاطر خواہ کامیابی بھی ملی۔۔ بلٹز کا آزاد قلم/ رجحان ساز اور عہد ساز کالم کہا جا سکتا ہے۔۔ 'بلٹز' سے زیادہ قارئین کو اس کے آخری صفحے پر شائع کالم 'آزاد قلم' کا انتظار رہتا تھا۔ اردو صحافت کی تاریخ کہتی ہے کہ کالم نگاری کے حوالے سے یہ سب سے طویل عرصے تک لکھا جانے والا کالم تھا۔ 'بلٹز' میں انھوں نے کم و بیش 40 برسوں تک 'آزاد قلم' لکھا اور انھوں نے یہ وقت تقرری ہی یہ بات انتظامیہ کے پیش نظر رکھ دی تھی کہ وہ اپنے نظر اور نظریے کے اعتبار سے جو کچھ لکھیں گے، اسے بلٹز من و عن شائع کرے گا، کسی طرح کی کتر بیونت نہیں ہوگی، انھوں نے یہ بھی کہا کہ معاوضہ تو کم ہو سکتا ہے مگر میری یہ شرط باقی رہے گی۔ چنانچہ پوری زندگی وہ ملک میں رہے ہوں یا ملک سے باہر۔۔ بلٹز کے لیے 'آزاد قلم' کا لکھنا، کبھی نہیں بھولے۔ راج نرائن راز جو شاعر بھی تھے اور آجکل کے مدیر بھی۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''جب ہفتہ وار اردو بلٹز جاری ہوا، تو وہ ہندی اور اردو دونوں کے لیے لکھنے لگے۔ آزاد قلم کا آخری صفحہ بلٹز کے لاسٹ پیج کا ترجمہ نہیں بلکہ جداگانہ کالم ہوا کرتا تھا، ہندی اور اردو میں آزاد قلم کا کالم محض چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ زبان بیشتر سہل ہوا کرتی تھی۔ خواجہ صاحب کے اپنے الفاظ میں: ''گویا کہ یہ کالم ایک ہی سانچے میں ڈھلتے ہیں جو اتر پردیش، مدھیہ پردیش، اور راجستھان میں پڑھے اور سمجھے جاتے تھے گویا یہ بھارت کی دھرتی کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔''

لاسٹ پیج، صحافت کی تاریخ میں اس اعتبار سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کہ یہ 39 برس تک ایک تواتر سے شائع ہوتا رہا۔ یہ دنیائے صحافت کا سب سے

زیادہ عرصے تک شائع ہونے والا کالم ہے اور شاید یہی بات آزاد قلم کے آخری صفحے کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔''

(خواجہ احمد عباس: افکار، گفتار، کردار، ص 230)

یہاں مجھے صرف یہ اضافہ کرنا ہے کہ شاید نہیں بلکہ یقیناً 'آزاد قلم' اردو صحافت کی تاریخ میں لکھا جانے والا 'طویل العمر' یا طویل مدتی کالم ہے۔

بلٹز کے 'آزاد قلم' کا آج اگر تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو کچھ دلچسپ نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ 'آزاد قلم' کا موضوع بالکل آزاد ہوتا تھا— خواجہ احمد عباس نہایت آزادانہ طور پر قومی، بین الاقوامی، سیاسی اور سماجی، تہذیبی اور ثقافتی ادبی اور لسانی موضوعات پر بے باکانہ اسلوب میں اظہار خیال کرتے تھے۔ دوسرا اہم پہلو 'آزاد قلم' کا یہ تھا کہ اس کے صفحے کے بائیں ہاتھ کے کونے پر کبھی کسی فلمی ہیرو، ہیروئین یا ادیب کی تصویر ہوتی تھی، اور اس تصویر کے ساتھ کوئی شعر یا کوئی اطلاع ہوتی تھی مثال کے طور پر 'قاضی سلیم' کی تصویر کے ساتھ یہ شعر:

ہر قدم پر لٹا کر متاعِ نظر
میں نے گھر گھر سے آنسو اکٹھے کیے

منفرد شاعر قاضی سلیم جواب ممبر پارلیامنٹ بھی بن گئے، درج ہے۔''

(بلٹز، 12 جنوری 1980)

پرویز شاہدی کی تصویر کے ذیل میں یہ عبارت درج ہے:

''رقصِ حیات اور تثلیث حیات کے خالق، جن کی شاعری میں مخدوم اور جاں نثار اختر کی طرح تخلیقی صلاحیتوں کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔''

(بلٹز، 10 مئی 1980)

بلٹز کے آزاد قلم کا مطالعہ ہمارے سامنے ہندوستان کے عوامی اور عام مسائل کا پورا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ اس کے ذریعے اس عہد کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، ملی اور ادبی صورت حال بھی سامنے آتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کے یہاں انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی نیز معلومات عامہ پر ان کی نظر کتنی گہری تھی۔ یہاں بلٹز کے 'آزاد قلم' کے چند

عناوین بطور مشتے نمونہ از خروارے درج کرتا ہوں کہ لفافے سے بھی مضمون تک پہنچا جاسکتا ہے:

''کیا کوئی کلچر اور زبان مر سکتی ہے؟''

(بلٹز 10 مئی 1980)

''یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ: گاندھی جی کے ساتھی مظہر الحق''

(بلٹز 24 مئی 1980)

''حیدر آباد کا 'شہر اور سپنا' کب بسایا جائے گا؟

کہاں بسایا جائے گا؟

''کیا اسمبلیوں کے چناؤ دوبارہ ہوں گے''

(بلٹز، 31 مئی 1980)

''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''

(بلٹز، 27 مارچ 1965)

''روٹی نہیں ہے تو کیک کھاؤ!''

(بلٹز، 17 فروری 1965)

سامراج، سوراج، کامراج، رام راج؟

(بلٹز، 21 فروری 1963)

''رہتا ہے دل وطن میں!''

(بلٹز، 8 فروری 1964)

جھوٹا سچ یا سچا جھوٹ

(بلٹز، 11 مارچ 1964)

''نئی سیتا، نئی زلیخا، نئی مریم''

(بلٹز، 14 مارچ 1964)

ایسے کئی مضمون کے عنوان یہاں نقل کیے جاسکتے ہیں۔ مگر آخری عنوان سے لکھے جانے والے کالم کی چند سطریں، آپ ملاحظہ فرمائیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ کیا 1964 کے

ہندوستان اور 2014 کے ہندوستان کی تصویر بدلی ہے؟؟ خواجہ احمد عباس لکھتے ہیں:

''آج وہ سب باہر نکل آئی تھیں اور بمبئی کی سڑکوں پر کندھے سے کندھا ملا کر مارچ کر رہی تھیں۔

سیتا، ساوتری، عائشہ، خدیجہ، میری

سلمہ، سوشی، جولیٹ، پدمنی

لیلیٰ، لیلا، للی

موہنی، محمودہ، مارگریٹ

ملوں میں کام کرنے والی نوگز کی ساڑی پہننے والی مہاراشٹری عورتیں...

دفتروں میں کام کرنے والی لڑکیاں، اسٹینوگرافر، ٹائپسٹ گرلز، کلرک، پلاسٹک کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں۔

دواؤں کے کارخانوں میں کام کرنے والی لڑکیاں، بیڑی بنانے والیاں، بسکٹ بنانے والیاں...

ساڑیاں، فراک، شلوار، لمبی چوٹیاں، کٹے ہوئے بال۔ کسی کے ماتھے پہ بندی، کسی کے ہونٹوں پر لپ اسٹک، کسی کے ہاتھوں میں کھنکتی ہوئی چوڑیاں، کسی کی انگلی پر شادی یا منگنی کی انگوٹھی، کسی کی گود میں بچہ، مگر ہر ایک کے ہاتھ میں ایک انقلابی سرخ پھریرا۔ ہر ایک کے دل میں ایک نئی امنگ، ایک نیا جوش، ہر ایک کی زبان پر ہندوستان کی کام کرنے والی نئی عورتوں کے نعرے—

''مہنگائی کا خاتمہ کرو!

کام کرنے والی عورتوں کو برابر کے حقوق دو

چولہا جلانے والی گیس کی قیمت کم کرو، تیل کی کمپنیوں کو عوام کی ملکیت بناؤ،

کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بال گھر Creche بناؤ—

شادی شدہ کام کرنے والیوں پر سے پابندیاں ہٹاؤ۔''

مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خواجہ احمد عباس کی فکر کیا تھی؟ ان کے

تیور کیا تھے؟ ان کی نگاہ کتنی دور رس تھی؟ وہ ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی منظرنامے پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے؟ دراصل خواجہ احمد عباس اپنے انھیں موضوعات اور اسلوب کے اسی بے باکانہ انداز کی بنیاد پر صحافت اور ادب کی تاریخ میں ایک الگ عنوان کے تحت یاد کیے جاتے رہیں گے۔

افسانہ

خواجہ احمد عباس کا پہلا افسانہ 'ابابیل'' تھا، (اس افسانے کی سنہ اشاعت کے سلسلے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ راقم السطور نے اسی لیے رسالہ جامعہ کے مشمولات کا عکسی صفحہ پہلی جلد میں شامل کردیا ہے تاکہ کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔) گویا یہیں سے ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ تادم تحریر حتمی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انہوں نے کل کتنے افسانے لکھے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً سوا سو کہانیاں ہونی چاہئیں۔ لیکن ایک بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد دس ہی ہے۔ بقیہ افسانوی مجموعے انہیں دس مجموعوں کی بنیاد پر اردو کے پبلشرز اپنے اپنے طور پر تیار کرتے رہے اور بازار میں لاتے رہے، جنہیں جعلی ایڈیشن بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان مجموعوں میں بھی بعض افسانے اشاعت مکرّر کی حیثیت رکھتے ہیں، کچھ میں کہانیوں کے علاوہ خاکے، مضامین اور دیگر نوعیت کی تحریریں بھی شریک کردی گئی ہیں۔ اس سے ہمارے ناقدین کو مغالطہ بھی ہوا ہے کہ وہ ان کے بعض مضامین کو افسانہ تصور کرتے ہوئے افسانے کے زمرے میں شریک کرلیتے ہیں۔ رام لعل نے اپنی کتاب ''خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے'' میں ''آئینہ خانہ میں'' کو افسانے کے زمرے میں شامل کردیا ہے۔ یہی سہو پروفیسر صغریٰ مہدی کی مرتبہ کتاب ''اگر مجھ سے ملنا ہے'' (خواجہ احمد عباس کے افسانے) میں بھی نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ افسانہ نہیں بلکہ مضمون ہے۔ 'آئینہ خانہ میں' ادبی تحریر کا ایسا سلسلہ ہے۔ جس کے تحت ماہنامہ ''افکار'' کراچی میں کرشن چندر، بیدی، اور دوسرے قلم کاروں نے اپنی شخصیت اور فکروفن پر خود روشنی ڈالی تھی۔ خواجہ احمد عباس کا یہ سوانحی مضمون افکار (دسمبر 1963ء) میں شائع ہوا تھا۔

ان کے بعض افسانوں کو عنوانات بدل بدل کر بھی شائع کیا گیا ہے۔ الف لیلیٰ 1956/الف لیلیٰ 1980، الف لیلیٰ 1952، مسوری 1952/مسوری 1953، پنجرہ/پنچھی، پنجرہ اور اڑان، آج کے

لیلیٰ مجنوں ربیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں، اجنتا راجنتا کی اُور، کیپٹن سلمیٰ ربھوپال کی کیپٹن سلمیٰ، ایک بچے کا خط مہاتما گاندھی کے نام ربچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام، رفیق رمیجر رفیق مارا گیا وغیرہ وغیرہ۔ان کے علاوہ ایسے کچھ افسانے بھی ہیں جو کسی مجموعے میں نہیں ملتے بلکہ اردو رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔

اردو کی طرح ہندی والوں نے بھی خواجہ احمد عباس کی تحریروں پر بڑا ظلم کیا ہے۔جس پبلشر نے جیسے مناسب سمجھا، ان کی کہانیوں اور ناولوں کو شائع کیا اور اپنی تجارت کو فروغ دیا۔اس کی وجہ یہ تھی اور ہے کہ خواجہ احمد عباس کی تحریریں اپنے موضوع، مواد اور اسلوب کی بنیاد پر عوام میں خوب مقبول ہیں اور تھیں۔اردو کی کہانیوں کا اگر سخت سے سخت انتخاب بھی کیا جائے تو خواجہ احمد عباس کی کہانیاں ان میں جگہ بنالیں گی۔ان کے افسانوں کے انفراد پر آئندہ سطور میں گفتگو ہوگی۔سردست ان کے افسانوں کے مجموعوں کی تفصیل حاضر ہے۔

پہلا افسانہ '**ابابیل**' رسالہ: جامعہ، جلد 26، شمارہ 6 جون 1936

ایک: پہلا افسانوی مجموعہ: **ایک لڑکی** (1942)

مشمولات: (1) فیصلہ (2) ایک لڑکی (3) سرکشی (4) ناگن (5) پہلا پتھر (6) ابابیل (7) تین عورتیں (8) داروغا اور لڑکی (9) معمار (10) رادھا۔

دو: **پاؤں میں پھول** (1948)

مشمولات: (1) پاؤں میں پھول (2) چڑھاؤ اتار (3) بارہ گھنٹے (4) ایک پائلی چاول (5) ماں (6) آزادی کا دن (7) میں اور وہ (8) موت کی شکست۔

نوٹ: تعارف کے طور پر کرشن چندر کی تحریر شامل ہے۔

تین: **زعفران کے پھول:** (مارچ۔1948) کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی

مشمولات: (1) زعفران کے پھول (2) اجنتا (3) اندھیرا اور اجالا۔

چار: **میں کون ہوں**، (1949)، نو ہند پبلشرز لمیٹڈ، ممبئی۔

مشمولات: (1) چڑیا چڑے کی کہانی (2) دھوئیں کی زنجیر (3) جاگتے رہو (4) رفیق

(5) میں نے کہانی کیوں نہیں لکھی (6) میرے بچے (7) میری موت (8) ایک بچے کا خط مہاتما گاندھی کے نام (9) انتقام (10) شاعر کی آواز (11) میں کون ہوں؟

نوٹ: کہانی کی کہانی کے عنوان سے ایک مضمون بھی شامل ہے۔

پانچ: کہتے ہیں جس کو عشق، (1953)، پروین بک ڈپو، الہ آباد۔

مشمولات: (1) کہتے ہیں جس کو عشق (2) شکر اللہ کا (3) سوری 1952

چھ: گیہوں اور گلاب، (1955)، ایشیا پبلشرز، دلی۔

مشمولات: (1) گیہوں اور گلاب (2) میرا بیٹا میرا دشمن (3) آسمانی تلوار (4) لال پیلا (5) نئی برسات (6) معجزہ (7) مونتاژ۔

سات: دیا جلے ساری رات، (1959)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دلی۔

مشمولات: (1) دیا جلے ساری رات (2) روپے آنے پائی (3) چراغ تلے اندھیرا (4) بچوں کا خط مہاتما گاندھی کے نام (5) کچی کچی (6) تین تصویریں (7) ڈیڈ لیٹر (8) الف لیلیٰ 1956۔

نوٹ: اس مجموعے میں کرشن چندر کی یہ تحریر بھی شامل ہے: کرشن چندر اور احمد عباس کا آپس کا مقدمہ۔

آٹھ: نئی دھرتی نئے انسان، (1977)، مکتبہ جامعہ، دہلی۔

مشمولات: (1) نیا شوالہ (2) ہنومان جی کا ہاتھ (3) سبز موٹر کار (4) ٹڈی (5) بھولی (6) نئی جنگ (7) تین بھنگی (8) پانی کی پھانسی (9) تیسرا دریا (10) سونے کی چار چوڑیاں (11) یہ بھی تاج محل (12) ٹیری لین کی پتلون (13) چٹان اور سپنا (14) خزانہ (15) دو ہاتھ (18) ایک لڑکی۔ سات دیوانے۔

نوٹ: اس مجموعے میں ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے ایک تحریر شامل ہے۔

نو: نیلی ساڑی، دسمبر (1982)، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی۔

مشمولات: (1) ایک کہانی کا سوال ہے (2) تین مائیں ایک بچہ (3) سردی گرمی (4) بھوک (5) فین (8) نیا انتقام (7) نیلی ساری۔

دس: سونے چاندی کے بت،(1986)،کلاسیک انٹرنیشنل،بمبئی۔

اس کتاب میں فلمی شخصیات پر دس خاکے اور چھ ایسے مضامین شامل ہیں جن کا تعلق فلمی دنیا سے ہے ان کے علاوہ درج ذیل نو کہانیاں شریک کتاب ہیں۔

(1) ماں کا دل (2) فلمی شگون (3) پرنیتا کماری کے پان (4) دو پرچھائیاں (5) کایا کلپ (6) اچھن کا عاشق (7) رین مشین (8) ایک لڑکی تین چہرے (9) ایکٹریس۔

ان کے علاوہ جو افسانوی مجموعے ہیں انہیں مندرجہ بالا افسانوی مجموعوں کا BY PRODUCT کہا جانا چاہئے۔ اِلّا یہ کہ کسی نے کسی رسالے میں شائع شدہ کوئی افسانہ شریک کر دیا ہو۔ چند مجموعے جو درج ذیل عنوانات سے شائع ہوئے ہیں:

(1) پیرس کی ایک شام (2) بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں (3) چراغ تلے (4) اداس دیواریں (5) پھول اور دوسری کہانیاں (6) اندھیرا اجالا (7) اگر مجھ سے ملنا ہے (مرتبہ: صغریٰ مہدی) (8) خواجہ احمد عباس کے منتخب افسانے (مرتبہ: رام لال)

خواجہ احمد عباس کو میں ''اسکرین پلے فکشن نگار'' تصور کرتا ہوں۔ اپنے خیال کو تقویت بخشنے اور آپ کو مطمئن کرنے کی خاطر ان کی ہی تحریر حاضر ہے۔

> امر، جو کنٹرکٹر کا کلرک تھا، روپے کی گنتی کر رہا تھا۔ پھر گوپال کے اوور ٹائم کے روپے دیتے ہوئے، ذرا تعجب ظاہر کرتے ہوئے بولا، 'ارے بھائی، تم اتنی سخت محنت کیوں کرتے ہو؟'
>
> ''امر بھیا، ساری محنت میں اس لیے کرتا ہوں کیونکہ میں امیر آدمی کا بیٹا نہیں ہوں لیکن مجھے غریبوں جیسی زندگی گزارنا اچھا نہیں لگتا۔ آج میں نے اُوور ٹائم اس لیے کیا ہے کہ 'سیلر بوائے' بار اور نائٹ کلب میں پینے کا مزا لینا چاہتا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔ حساب کتاب کا رجسٹر پھینکو اور مزے اڑاؤ۔ میں کہتا ہوں تم ایک بار بھی روزی کو دیکھ لوگے تو تمھارے جیسا دھرماتما بھی پھسل پڑے گا۔''

اس سلسلے میں ایک دو مثالیں اور بھی ان کے ہی ناول/افسانے سے پیش کی جاسکتی ہیں:

".....آؤ میں تمہاری قمیض کو سی دوں گی۔ روزی ناچ گانے کے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے سے سوئی دھاگا اٹھاتی ہے اور گوپال کی پھٹی ہوئی قمیض کو سینے لگتی ہے......"

یہاں کہانی جس اسلوب میں بڑھائی جارہی ہے وہ واضح طور پر "اسکرین پلے" سے قربت رکھتا ہے۔

ناول

(1) چار دل چار راہیں (2) شیشے کی دیواریں (3) بمبئی رات کی بانہوں میں (4) اندھیرا اجالا (5) انقلاب (6) دو بوند پانی (7) فاصلہ (8) تین پیسے (9) ساحل اور سمندر (10) چار یار۔

تاریخی ترتیب سے "چار دل چار راہیں" جسے کتابستان الہ آباد نے 1959 میں شائع کیا تھا۔ خواجہ احمد عباس کا پہلا ناول کہا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا ناول "انقلاب" جو بوجوہ نیا سنسار بمبئی سے 1975 میں شائع ہوا۔ ناول کے سلسلے سے اسے پہلی کوشش کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں خود انہوں نے اپنے کئی مضامین میں اردو میں اس کے تاخیر سے چھپنے کی وجہ بتائی ہے۔ آجکل اپریل 1985 کے شمارے میں "من کہ....." کے تحت انہوں نے لکھا ہے:

"سب سے مشہور ناول اردو میں "انقلاب" تھا، جس کو پندرہ برس کے بعد جب اس کا روسی ایڈیشن 'سن آف انڈیا' (فرزند ہند) کے نام سے 90000 کی تعداد میں بک گیا، تب بھی جب کوئی پبلشر اتنی ضخیم کتاب چھاپنے کو تیار نہیں تھا، تب میں نے خود گیارہ سو کی تعداد میں اس کو اپنے خرچ سے چھاپا اور بیچنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے اجرا کی رسم اپنے ہی گھر پر کی۔ کوئی پچاس ساٹھ اردو کے ادیب، ایڈیٹر، شاعر، جرنلسٹ وغیرہ اکٹھے کیے۔ ہر ایک کو تحفتاً ایک ایک جلد دی۔ امید تھی کہ کچھ تو ان میں سے کچھ "اچھا یا برا اس کے بارے میں لکھیں گے، مگر جب وہ لوگ لنچ کھا کر میرے گھر سے رخصت ہوئے تو (اس واقعہ کو سات برس گزر چکے ہیں) آج تک کوئی ریویو بھی کسی نے نہیں لکھا۔ میں کسی کی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں کہ اردو میں زیادہ ناول کیوں نہیں چھپتے۔"

میں خواجہ احمد عباس کی تحریروں کی تلاش کر ہی رہا تھا کہ اس درمیان ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا ایک مضمون ''جوالا مکھی'': خواجہ احمد عباس کا گم شدہ ناول ''ایوان اردو'' دہلی کے فروری 2015 کے شمارے میں منظرِ عام پر آیا۔ جس سے ایک نئی حقیقت سامنے آئی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ خواجہ احمد عباس کی پہلی کہانی اگر 1936 میں شائع ہوئی تو ان کی ناول نگاری کا سفر بھی اسی سال شروع ہوتا ہے۔ میں یہاں مذکورہ مضمون کے کچھ حصے نقل کرتا ہوں تاکہ صورتِ حال سے زیادہ بہتر طور پر واقف ہوا جا سکے۔ یحییٰ نشیط لکھتے ہیں:

> میرے پیشِ نظر اس وقت ''طبی دنیا'' دہلی کا ستمبر 1963ء کا ایک شمارہ ہے۔ اس کے صفحہ نمبر 11 سے 61 تک خواجہ احمد عباس کے ناول کی پہلی قسط طبی دنیا کے مدیر نے اپنی رائے کے ساتھ شائع کی ہے۔ مدیر کی رائے حسبِ ذیل ہے۔
>
> ''ایک پراسرار ناول جو ''طبی دنیا'' میں ہر ماہ قسط وار شائع ہوگا۔
>
> ''ہم اپنے نوجوان عزیز خواجہ احمد عباس کے شکر گزار اور دعا گو ہیں کہ ''طبی دنیا'' میں ادبی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے ہمیں اپنا یہ پہلا شاہکار بھیجا۔ عزیز موصوف ایک ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ مغربی علوم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو ملازمت کی پابندیوں کے حوالے نہیں کیا، جس میں ان کے لیے زندگی کی کامیابیوں کا ایسا میدان تھا، جو ہزاروں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے شاید کسی ایک ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ ان کے خداداد ادبی ذوق اور شوقِ مطالعہ اور قابلِ قدر جذبۂ ایثار نے ان کے سامنے جو راہِ خدمت پیش کی، انھوں نے اسے اختیار کر لیا۔ آسمانِ صحافت پر یہ ایک نئی صبح کا ظہور ہوا ہے اور خدا نے چاہا تو لوگ دیکھیں گے کہ مولانا حالیؔ کے مطلعِ خاندان سے ان کے بعد ایک اور روشن تارہ نکلا ہے!''
>
> اس اداریے کے بعد مدیر نے ''جوالا مکھی'' کا پہلا باب شائع کیا ہے۔ عنوانِ باب کی جلی سرخیوں کے ساتھ جزدی سرخیوں کو بھی مدیر نے قدرے روشن کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی زندگی میں جتنی بھی کہانیاں لکھی ہیں، جتنی بھی فلمیں بنائی ہیں، جتنے اسکرپٹ اور جتنے ناول لکھے ہیں، ان تمام سے مختلف یہ تخلیق ہے۔ پتہ نہیں کیوں، پھر اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ ہوسکتا ہے کہ ''طبی دنیا'' ایک غیر ادبی جریدہ ہے۔ محققین بھلا ادب کا میدان چھوڑ کر طبی جریدے کی ورق گردانی کیوں کرنے لگیں۔ اسی سرد لوحی اور عدم توجہی کا نتیجہ ہے کہ خواجہ احمد عباس کی اولین کوشش سے آج ہم بے خبر ہیں۔

میں نے اپنی بساط بھر کوشش کر لی ہے کہ اس رسالے کے باقی ماندہ شماروں کو بھی حاصل کروں، اس دوران مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دو ماہ ٹھہرنے کا موقع بھی ہاتھ آیا تھا اور میں نے اس ضمن میں کوشش بھی کی مگر طبی دنیا کے وہ قدیم شمارے مجھے دستیاب نہ ہو سکے۔''

اس کے بعد انہوں نے اس جاسوسی ناول کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے اور پہلی قسط بھی۔ جو اس کلیات میں ناول کے باب میں شامل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''یہ ناول خواجہ احمد عباس کی ابتدائی کاوش ہے اس لیے اس میں وہ پختگی اور فن کی کہنگی دکھائی نہیں دیتی۔ اس میں ان کا مبتدیانہ پن صاف دکھائی دیتا ہے۔ البتہ ان کی اس اولین تخلیق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں شروع ہی سے ترقی پسند افکار پنپنے لگے تھے۔ ان کے اس ناول کی تخلیق اس زمانے میں ہوئی تھی جب ہندوستان میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس انجمن کے قیام سے قبل 1932 میں چند نوجوانوں نے ''انگارے'' کے نام سے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کر دیا تھا جس کی خوب پذیرائی ہوئی تھی۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ خواجہ احمد عباس نے انہی افسانوں سے متاثر ہو کر یہ ناول لکھا ہو اور ''انگارے'' کی مناسبت سے اپنے ناول کا نام ''جو الامکھی'' رکھا۔ اس ناول کی پہلی قسط ہی میں مصنف کے خیالات اور جذبات میں اشتراکیت کا اثر نمایاں ہے۔ مالداروں اور غریبوں کے درمیان دولت کی خلیج کی وجہ سے بڑھتے ہوئے فاصلوں کا ادراک خواجہ

احمد عباس کو شروع ہی سے تھا۔ اس افتراق کو ختم کرنے کا وہ انقلابی نعرہ ابھی ہندوستان میں لگایا نہیں گیا تھا۔ اس لیے انقلاب کی زیریں لہریں ہی ان کے یہاں نظر آتی ہیں۔

اس ناول کی پہلی قسط ستمبر 1936ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس کا پہلا اجلاس منشی پریم چند کی صدارت میں ہوا تھا۔ لکھنؤ میں ہوئے اس اجلاس کے بعد سے گویا اس انجمن کو تحریک ملی، پھر بھیونڈی اور ممبئی میں اس کے جلسے ہوتے گئے اور ادب میں ایک مضبوط تحریک کے طور پر وہ کام کرنے لگی۔ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، علی سردار جعفری، عزیز احمد، سجاد حیدر یلدرم، عصمت چغتائی وغیرہ فعال ادیبوں کے دم سے اس انجمن کی خوب ترقی ہوئی، مگر ''جوالا مکھی'' لکھتے وقت خواجہ احمد عباس اکیلے تھے، ان کا کوئی ہم نوا تھا نہ کوئی ہمسر۔ یہی ایک ناول تھا جس میں اشتراکیت کی مدھم سی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اس اعتبار سے بھی ''جوالا مکھی'' کی کلیدی اور بنیادی اہمیت کو اردو ادب میں تسلیم کیے بغیر مفر نہیں۔

ان تمام خصوصیات کے سبب خواجہ احمد عباس کے ناول ''جوالا مکھی'' کو اردو کا پہلا ترقی پسند ناول کہا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے گمشدہ ابواب کی بازیافت کے لیے کوشش کی جائے اور اسے مکمل صورت میں سامنے لانے کے جتن کیے جائیں۔''

راقم نے بھی اس ناول کے حوالے سے تحقیق کی لیکن مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ چونکہ طبی دنیا کے شمارے کسی بھی لائبریری میں دستیاب نہ ہو سکے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ ''طبی دنیا'' کی اشاعت بھی بند ہو گئی ہو۔ ممکن ہے خواجہ احمد عباس نے ناول کی شروعات کی ہو لیکن وہ اسے جاری نہ رکھ سکے۔ ایسا ان کی کئی کتابوں کے ساتھ ہوا ہے کہ اعلانات تو کیے گئے مگر اس عنوان سے ان کی کسی کتاب کا سراغ نہیں ملتا۔ مثلاً ''یہ امرت ہے''، ''پرچم'' یا ''چار دانوں کی کہانی''۔ آخری الذکر کی آخری قسط بھی دستیاب نہیں ہو سکی۔

خواجہ احمد کے ناولوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ اندھیرا اجالا، شیشے کی دیواریں،

دو بوند پانی، چار دل چار راہیں، بمبئی رات کی بانہوں میں، سات ہندوستانی، ایک پرانا ٹب اور دنیا بھر کا کچرا، فاصلہ وغیرہ۔ یہاں حتمی طور پر ان ناولوں کی سنہ اشاعت نہیں دی جاسکتی۔ چونکہ زیادہ تر ناولوں پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ اصلاً یہ ناول فلم کے لئے لکھے گئے ہیں اس لئے ان میں وہ ادبی شان نہیں ملتی، جو ادبی ناول کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس لئے ان ناولوں پر ہماری تنقید مہر بہ لب نظر آتی ہے۔ آخر ان میں پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری یا ناول کے فن کے باب میں کتنے آنچ کی کسر رہ گئی ہے؟ اس پر بات تو ہونی ہی چاہئے تھی تا کہ ان کی فنی کمزوریوں کا اندازہ لگایا جا سکتا مگر ہمارے ناقدین نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے انقلاب کا ذکر مندرجہ بالا سطر میں دانستہ نہیں کیا ہے، اس لئے کہ یہ ناول ان ناولوں سے مختلف ہے اور یہاں فنی اعتبار سے خواجہ احمد عباس زیادہ بامراد بھی رہے ہیں۔ اگر چہ انقلاب کے حوالے سے بھی ہمارے ناقدین نے بخل سے کام لیا ہے۔

ڈرامے

خواجہ احمد عباس کا تعلق IPTA سے بہت گہرا رہا ہے اور انہوں نے اس کے لئے کئی ڈرامے لکھے اور اسٹیج بھی کئے۔ مثلاً: (1) زبیدہ (2) اناس اور ایٹم بم (3) یہ امرت ہے (دستیاب نہیں ہوسکا) (4) بارہ بج کر پانچ منٹ (5) لال گلاب کی واپسی (6) پرچم۔ (دستیاب نہیں ہوسکا)

ان ڈراموں کے موضوعات مختلف بھی ہیں اور متنوع بھی۔ لیکن ایک عام روح جو ان تمام ڈراموں میں جاری ہے، وہ انسان دوستی، رواداری اور عصری منظرنامے کی ہے۔ ڈراما ''بارہ بج کر پانچ منٹ'' کا موضوع بالکل آج کا موضوع ہے، یعنی صحافت جو سیاست، سماج اور ملک کا مقدر بدل سکتی تھی اس نے بھی تجارت کی شکل لے لی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی ان ڈراموں کو کامیاب کوشش کہا جائے گا۔

صحافتی تحریریں

اوپر ذکر آچکا ہے اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ خواجہ احمد عباس کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا۔ اسی لیے انہوں نے نہ صرف یہ کہ صحافتی مضامین لکھے بلکہ درج ذیل صحافتی نوعیت کی

کتابیں بھی لکھیں جن کے نام یہ ہیں: (1) سولینی فاشیت اور جنگِ حبش (2) مولانا محمد علی (3) خروش چیف کیا چاہتا ہے؟ (4) فلمیں کیسے بنتی ہیں؟

فلم اسکرپٹ اور کہانیاں

(1) میرا نام جوکر (2) سات ہندوستانی (3) دھرتی کا لال (4) بابی (5) شہر اور سپنا (6) آسمان محل (7) ڈاکٹر کوٹنیس کی امر کہانی (8) راہی (9) آوارہ (10) شری 420 (11) خون کا رشتہ۔

سفر نامہ: (1) مسافر کی ڈائری (2) سرخ زمین اور پانچ ستارے

تادمِ تحریر خواجہ احمد عباس کی اُردو میں مندرجہ بالا کتابیں دستیاب ہیں۔ ان کے علاوہ انگریزی میں بھی تقریباً باون (52) تصانیف ہیں (ان میں بعض کتابیں اُردو کہانیوں کا ترجمہ ہیں)۔ اس تعداد میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دو کتابیں کم ہو جائیں لیکن کم و بیش خواجہ احمد عباس اسّی کتابوں کے مصنف کہے جاسکتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس ہندی میں براہِ راست نہیں لکھتے تھے، ان کی جو کتابیں ہندی میں موجود ہیں ان میں سے زیادہ تر اُردو یا انگریزی سے ہندی میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ مثلاً ان کی ایک کتاب ہندی میں ''آدھا انسان'' کے نام سے ملتی ہے جسے نیلا بھ پرکاشن، الہ آباد نے 1953 میں ناول کے نام سے شائع کیا ہے جب کہ یہ ناول نہیں ہے بلکہ خواجہ احمد عباس کا مشہور افسانہ ''مسوری 1952'' ہے جو ان کے طویل افسانوں پر مشتمل مجموعے'' کہتے ہیں جس کو عشق'' میں شریک اشاعت ہے لیکن نام مختلف ہونے کی بنا پر لوگ اسے بھی الگ کتاب شمار کرتے ہیں۔ میں نے خواجہ احمد عباس کے حوالے سے تحقیق و تلاش کی منزلوں سے گزرتے ہوئے ان کی زیادہ تر تخلیقات کو یکجا طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ان کی تمام تحریروں کو پالیا ہے۔ ممکن ہے کل ان کی کوئی اور تحریر سامنے آجائے لیکن سرِ دست میری تحقیق کا حاصل یہی ہے۔

امید ہے خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ان کی تحریروں سے دلچسپی رکھنے والوں کو میری یہ کوشش پسند آئے۔ اتنا بڑا کام جو آپ کے سامنے ہے ظاہری بات ہے یہ اس وقت تک مکمل نہیں

ہوسکتا تھا جب تک ہمیں مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، خدا بخش لائبریری پٹنہ اور گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ذاکر حسین لائبریری اور ادارۂ ادبیات حیدر آباد سے مدد نہ ملی ہوتی۔ جو افراد اور احباب اس سلسلے میں معاون ثابت ہوئے ہیں ان کا فرداً فرداً نام لینا مشکل تو ہے مگر ضروری بھی۔ اس میں اس بات کا بھی ڈر ہے کہ کچھ ناموں کا ذکر نہ ہو سکے۔ لیکن پھر بھی فوری طور پر جناب ابوذر ہاشمی کلکتہ، جناب یحییٰ نشیط، جناب صفدر امام قادری، ڈاکٹر زاہد الحق، محترمہ زدیا زیدی، جناب مہر ندیم الٰہی، جناب عطا خورشید، محترمہ نوشین عثمانی، پاکستان کے ہمارے دوست جناب رفاقت علی شاہد وغیرہم کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو مناسب بات نہ ہوگی۔

میں خصوصی طور پر ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کا سراپا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کلیات خواجہ احمد عباس کی اشاعت کے حقوق راقم کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ پیش کیے۔ ڈاکٹر سیدہ سیدین حمید کا تعلق خواجہ احمد عباس کے خانوادے سے ہے انہوں نے خواجہ احمد عباس میموریل ٹرسٹ بھی قائم کر رکھا ہے اور وہ خود بھی ادب کی بہت اچھی پارکھ رہی ہیں۔ نیز آپ سماجی، سیاسی اور ادبی اعتبار سے نہ صرف بہت فعال ہیں بلکہ وقتاً فوقتاً جلسوں، سیمیناروں اور کانفرنسوں کا بھی انعقاد کرتی رہتی ہیں۔ وہ پلاننگ کمیشن آف انڈیا کی بہت فعال ممبر بھی رہ چکی ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اوپن یونی ورسٹی حیدر آباد کی چانسلر بھی رہ چکی ہیں۔ میں ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی اجازت کے بغیر اتنا اہم کام شائع نہیں ہو سکتا تھا۔

مجھے یقین ہے اس کام میں کمیاں ہوں گی مگر یہ بھی توقع ہے کہ اس کام کو دوسرے لوگ بہتر طریقے سے کر سکیں گے۔

مجھ سے بھی بہت پہلے آیا تھا یہاں کوئی
جب میں نے قدم رکھا یہ خاک دِل ویراں تھا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

سوانح

مسولینی فاشیت اور جنگ حبش

ہیرو یا ابن الوقت

ایک غیر معمولی شخصیت

گذشتہ سال بھر میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہوگا کہ اخباروں کی سرخیوں میں مسولینی کا ذکر نہ آیا ہو، ہر اخبار کے کالم اس کی تقریروں، اس کے اعلانات، اس کی دھمکیوں کی اشاعت کے لیے وقف ہو گئے ہیں اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس وقت جس شخص کا دنیا میں سب سے زیادہ چرچا ہے وہ مسولینی ہے۔

بعض لوگ اس کو ایک زبردست حکمراں، اٹلی کا نجات دہندہ اور موجودہ دنیا کا ایک ممتاز مدبر سمجھتے ہیں اور بہت سے لوگ اس کو ایک جابر، ظالم اور خود پرست شخص اور امن عالم کے لیے ایک نہایت زبردست خطرہ خیال کرتے ہیں لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ لوہار کا لڑکا جو آج اٹلی کا نہ صرف مطلق العنان حکمراں ہے بلکہ اطالویوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا دیوتا بن گیا ہے۔ ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک ہے۔ خواہ ہم اس کو نفرت کی نظر سے دیکھیں یا اس کی عزت کریں۔ دونوں صورتوں میں اس کی سیرت اور زندگی کا مطالعہ ضروری ہے۔ موجودہ متحدہ اٹلی کو تنظیم دینے میں اس نے جو نمایاں حصہ لیا ہے اور فاشیت کا نیا نظام اور سیاسی تخیل جو اس نے دنیا

کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کا تقاضہ ہے کہ ہم مسولینی کی زندگی کا غور سے مطالعہ کریں تا کہ اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرسکیں اور ہمیں معلوم ہو کہ اس نے کس ماحول میں پرورش پائی۔ کن اثرات کے تحت شہرت اور طاقت حاصل کی، اس کا نصب العین کیا ہے اور اس کو عملی جامہ پہنانے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوا ہے؟ جب سے اس نے تمام متمدن اقوام کی بیزاری اور مخالفت کے باوجود بلا وجہ کمزور اور بے گناہ حبش پر جابرانہ حملہ کیا ہے۔ دنیا میں مسولینی کی اہمیت اور زیادہ ہوگئی ہے۔ اور فاشیت فلسفہ کے خطرات ہر طرف محسوس کیے جا رہے ہیں۔ ایک بے قصور اور پرامن ملک پر فوج کشی کی، تمام تر ذمہ داری مسولینی پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ انجمن اقوام نے بھی اس کو جابرانہ اقدام کا ملزم قرار دید یا ہے۔ اقتصادی بائیکاٹ کی منظوری ہوگئی ہے اور کیا عجب تھا کہ اس پر واقعی عمل بھی شروع ہو جا تا لیکن مسولینی برابر اپنے نامبارک کام میں مشغول رہا۔ حبش پر حملہ جاری رہا دونوں طرف جان اور مال کا نقصان ہو رہا تھا۔ ایسی حالت میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسولینی یہ سب کیوں کر رہا تھا؟ اس نے ہزاروں جانوں اور کروڑوں روپیہ کی بازی جنگ کے اس جوئے پر کیوں لگائی؟ کیا وہ محض ایک خود پرست اور مجنوں شخص ہے یا ایک غلط اور مکروہ مگر پرخلوص جذبۂ قومیت کا شکار۔ کیا حبش سے جنگ کرنے کا مقصد واقعتاً اٹلی کی ترقی ہے یا اپنی مطلق العنانی قائم رکھنے کے لیے جنگ کا بہانہ تراشا گیا تھا؟

دو مسولینی

ان سب سوالات کا جواب بھی ہم کو اس کی سیرت اور واقعات زندگی کے مطالعہ ہی سے مل سکتا ہے اور یہی ان صفحات کا مقصد ہے۔ مسولینی کی سوانح حیات کو اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے تو اس میں دو دور ایک دوسرے سے اس قدر مختلف اور متضاد نظر آئیں گے کہ حیرت ہوتی ہے کہ کیا کسی سیاسی رہنما کے اصول اور عقائد میں اتنی زبردست تبدیلی ہوسکتی ہے۔ پہلا دور تو وہ تھا جب مسولینی ایک پر جوش اشتراکی تھا۔ سرمایہ داری کا زبردست مخالف، شہنشاہیت اور سامراج کا دشمن، تنگ نظر قوم پرستوں کو برا سمجھنے والا، اس زمانے میں وہ جنگ اور خصوصاً استبدادی جنگ کا شدید مخالف تھا اور اس کی زبان اور قلم جنگ کے خلاف جہاد کرنے کے لیے

وقف تھے۔ وہ ایک جوشیلا مقرر اور بے خوف صحافی تھا، آزادیٔ رائے کا حامی اور جمہوریت کا دلدادہ۔ مارکس اور میزینی کے انقلابی الفاظ اس کی زبان پر تھے اور اپنی ہر تحریر وتقریر میں وہ انقلاب کی ضرورت پر زور دیتا تھا۔

وہ مسولینی جو جنگ عظیم میں بھی اٹلی کی شرکت کے خلاف تھا آج خود جابرانہ اور خوفناک جنگ کا ذمہ دار ہے۔ اسی مسولینی نے جو کبھی آزادی رائے کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔ آج اٹلی میں شدید ترین زبان بندی کے قوانین عائد کر دیے ہیں۔ جو شخص کل خود اشتراکی تھا آج وہ اشتراکیوں کا جانی دشمن ہے۔ جس نے کبھی قوم کو جمہوریت کا سبق دیا تھا وہی آج اٹلی کا مطلق العنان حکمراں ہے!

مسولینی کے موافقین کا بیان ہے کہ اس کا نصب العین ہمیشہ سے اطالوی قوم کی بیداری اور بہبودی تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے نئے اصولوں کے ماتحت اپنی فاشیت پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس رائے کی تصدیق یا تردید مسولینی کی زندگی کے مطالعہ ہی سے ہو سکتی ہے اور اس مختصر کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ ان تمام حالات اور واقعات پر روشنی ڈالی جائے جو مسولینی کی اصولی تبدیلی اور فاشیت کی تشکیل کے ذمہ دار تھے۔

ہماری رائے میں وقتی

مگر اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے یہ بتادینا ضروری ہے کہ کامیابی کے معنی خلوص اور سچائی کے نہیں ہیں۔ اور اگر کوئی شخص غربت اور گمنامی سے ترقی کرکے ہر قسم کا دنیاوی عروج اور وجاہت حاصل کر لے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کی کامیابی ایمانداری اور اصول پرستی پر منحصر ہے اور وہ احترام کے قابل ہے۔ موجودہ دنیا میں اکثر لوگ ایسے ہیں۔ جنھوں نے سیاسی، تجارتی یا اقتصادی میدان میں ذلیل، طریقوں اور مشکوک ذرائع سے کامیابی حاصل کی ہے لیکن دولت اور طاقت کا پردہ ان کے گذشتہ افعال پر پڑا رہتا ہے اور ہم ان کی موجودہ عظمت سے مرعوب ہو کر ان ذرائع کو بھول جاتے ہیں جن سے وہ اس رتبہ تک پہنچے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ مطلق العنان حکومت کو قائم رکھنا آسان نہیں ہے۔ اس کو کامیابی سے طے کرنے کے لیے اکثر

بادشاہوں کو ظلم، تشدد، مکر اور فریب سے کام لینا پڑا ہے۔ مگر ایک دفعہ جب وہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو بہت جلد دنیا ان کے ماضی کو بھول جاتی ہے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک ''پرجلال و پرشکوہ بادشاہ'' کا نام رہ جاتا ہے۔ مگر اس وقت ہم ایک زندہ حکمراں کی زندگی کے پرانے واقعات معلوم کر سکتے ہیں اور مکروہ حقیقتوں سے دوچار ہونا پڑے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ شخصی حکومت کی تاریخ کے اوراق خونیں ہیں اور فاشیت شخصی حکومت کی تازہ ترین مثال ہے۔

لوہار کا لڑکا

دنیا کے اکثر مشہور انسانوں کی طرح مسولینی کی پیدائش بھی ایک غریب گھرانے میں ہوئی۔ باون سال ہوئے 1883 میں اٹلی کے صوبۂ روماگنہ کے ایک گاؤں وارنوڈی کوسٹا میں ایک لوہار کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ لوہار کا نام مسولینی تھا۔ بچہ کا نام بنی تیور رکھا گیا۔ کئی پشت سے مسولینی خاندان کے لوگ لوہار کا کام کرتے آئے تھے لیکن کچھ عرصہ سے بنی تیور کے باپ نے اپنا خاندانی پیشہ چھوڑ کر سرائے گیری شروع کر دی تھی۔ اس غریب بھٹیارے یا اس کی بیوی کو کیا معلوم تھا کہ ان کا لڑکا آئندہ چل کر تمام اٹلی کا حکمراں ہو جائے گا۔

روماگنہ کا علاقہ اس زمانہ میں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ لوگ میزینی اور کارل مارکس کے دلدادہ تھے۔ انقلاب فرانس کے خونیں راگ سب کی زبانوں پر تھے اور ہر شخص کسی نہ کسی سیاسی گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ آزادی اور انقلاب۔ انقلاب اور آزادی۔ یہی دو الفاظ تھے۔ جو شہروں اور قصبوں میں ہر طرف سنائی دیتے تھے۔ مگر قصبوں سے باہر گاؤں میں کسان اور کاشتکاران تمام سرگرمیوں سے بے خبر تھے اور اپنی صدیوں پرانی مفلسی اور جہالت کی زندگی میں مگن تھے۔

یہ وہ فضا تھی جس میں بنی تیور مسولینی نے اپنی زندگی کا آغاز کیا اس کا باپ الینڈر بھی ایک سرگرم اشتراکی تھا اور اس کی سرائے انقلابی جماعت کے مشوروں اور بحثوں کے لیے وقف تھی۔ اس کی آمدنی کچھ زیادہ نہ تھی کیونکہ سیاسی دلچسپیاں کسب معاش کی فرصت ہی نہ دیتی تھیں۔ وہ آخری وقت تک ایک مستعد انقلابی رہا۔ اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق خود مسولینی نے ایک دفعہ مشہور جرمن مصنف ایمل لڈوگ سے گفتگو کے دوران کہا۔ ''ہمارے خاندان بھر کے رہنے کے

لیے مشکل سے دو کمرے تھے۔ افلاس کا یہ حال تھا کہ گوشت شاذ و نادر ہی نصیب ہوتا تھا۔ مگر پرجوش مباحثے ہوتے تھے۔"

لہٰذا کوئی تعجب نہیں کہ اس ماحول میں بنی تیور سولینی نے اوّل عمر ہی میں سیاست میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ اس کو ابتدائی تعلیم اس کی ماں نے دی جو ایک قابل اور ذہین خاتون تھی اور پھر اسے اسکول میں داخل کرا دیا گیا مگر اسکول میں سولینی نے کوئی غیر معمولی تعلیمی کامیابی نہ حاصل کی بچپن ہی سے اس کا دل درسی کتابوں کی بجائے لڑائی جھگڑوں اور سیاسی مباحثوں میں لگتا تھا۔ انقلابی کتابوں سے البتہ اس کو دلچسپی تھی اور ان کو وہ نہایت غور سے پڑھتا تھا۔

اخباری زندگی

سولہ برس کی عمر میں اس نے عملی سیاست کی جانب پہلا قدم اٹھایا۔ اب تک اس کی سیاسی دلچسپیاں جلسوں اور مباحثوں میں شرکت تک محدود تھیں۔ مگر 1899 میں اس نے ایک ہفتہ وار اشتراکی اخبار 'عوام کی آواز' کے نام سے نکالا۔ اپنی زندگی میں سولینی اگر کسی چیز پر قائم رہا ہے تو وہ صحافت کا شوق ہے۔ سولہ برس کی عمر سے لے کر آج تک اس کا عملی تعلق کسی نہ کسی اخبار سے رہا ہے اور آج کل بھی باوجود دوسری مصروفیتوں کے وہ روزانہ اپنے اخبار کے لیے مضمون لکھتا ہے۔

'عوام کی آواز' نکالنے کے بعد چار سال تک نوجوان سولینی اپنے پرچہ کے ذریعہ اشتراکیت اور انقلاب کا پرچار کرتا رہا۔ بیس سال کی عمر میں اس نے اتنی شہرت حاصل کر لی کہ اپنے گروہ میں کافی بااثر شمار کیا جانے لگا۔

سوئزرلینڈ

اس عرصہ میں اشتراکیت زور پکڑتی جا رہی تھی اور جوں جوں اشتراکیوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی ان کی مخالفت بھی ترقی پر تھی، مقامی انتخابات میں اعتدال پسندوں کے ساتھ فساد بلکہ کشت و خون کی نوبت آ جاتی تھی، حکومت کھلم کھلا اشتراکیوں کے خلاف تھی اور اشتراکی سرگروہ کو ہر وقت گرفتاری کا خدشہ لگا رہتا تھا، پولیس نے سولینی کی نگرانی بھی شروع کر دی، اسی اثنا میں اس کی فوجی خدمت کا زمانہ بھی قریب آ گیا اور شاید اسی مصیبت سے بچنے کے لیے بیس سالہ

مسولینی خفیہ طور سے سوئزرلینڈ بھاگ گیا، آج کل کی طرح اس وقت بھی یہ چھوٹا سا خوب صورت ملک دنیا بھر کے باغیوں، انقلاب پسندوں اور اشتراکیوں کی جائے پناہ تھی، جس دن مسولینی سوئزرلینڈ کی سرحد میں داخل ہوا، اس کے باپ کو سیاسی جرائم کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔

سوئزرلینڈ میں بھی مسولینی نے اپنی اشتراکی سرگرمیاں جاری رکھیں، لیڈر بننے کا شوق اس کو ہمیشہ سے تھا، اور یہاں بھی اس نے اطالوی انقلاب پسندوں کا ایک اچھا خاصا گروہ اپنے گرد جمع کرلیا، اس زمانے میں اس کی مالی حالت نہایت خراب تھی، اکثر فاقہ کی نوبت آجاتی۔ ایک مرتبہ جب اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا اس کو آوارہ گردی کے الزام میں قید کردیا گیا، اس کے ایک سوانح نویس نے تو یہ بھی الزام لگایا ہے کہ اس زمانے میں اس نے اپنے ایک دوست کی گھڑی چرائی تھی۔ یہ الزام صحیح ہو یا نہ ہو یہ واقعہ ہے کہ اس کی ابتدائی سیاسی دلچسپیوں نے مسولینی کو خوب خاک چھنوائی۔ سوئزرلینڈ کے اکثر صوبوں سے نکالا گیا۔ جب فاقوں کی نوبت آگئی تو اس نے جنیوا میں کئی جگہ ملازمت بھی کی، چپراسی کا کام کیا۔ شراب کی دوکان میں نوکری کی۔ اس طرح کچھ عرصہ جنیوا میں آرام سے کٹا اور روزی کا تھوڑا بہت انتظام ہوگیا تھا کچھ دوست بھی بنالیے تھے۔ اور پڑھنے لکھنے کا موقع بھی مل جاتا تھا، مگر جعلی پاسپورٹ ہونے کی بنا، پر وہ جنیوا سے بھی نکالا گیا۔

اٹلی کو واپسی اور قید

جب سوئزرلینڈ میں رہنا مشکل ہوگیا، تو مسولینی اٹلی واپس آگیا کئی سال سفر اور اخبار نویسی میں گزارے مگر حکومت نے اب تک اس کو معاف نہ کیا تھا۔ 1908 میں اس پر 'اقدام تشدد' کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا اور فورلی کی عدالت نے اس کو تین ماہ کی قید کی سزا دی۔ یہ دوسری بار تھی کہ مسولینی نے جیل کی سیر کی۔ اس کا خیال یہ ہے کہ ہر سیاسی لیڈر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم از کم ایک دفعہ جیل ضرور جائے۔ ورنہ اس کی تربیت ادھوری رہ جائے گی۔ جیل سے آکر مسولینی نے ایک افسانہ 'پادری کی لڑکی' کے نام سے لکھا، جس کا مقصد پادریوں کی توہین اور تضحیک تھا اور لطف یہ ہے کہ آج وہی مسولینی پوپ کا دست راست اور عیسائیت کا زبردست علم بردار سمجھا جاتا ہے۔

1910 میں وہ فورلی میں' لوتا وی کلاسی' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے مقیم ہوگیا۔ اس دوران میں اس کا نام اشتراکی حلقوں میں کافی مشہور ہوگیا تھا اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے۔ وہ اپنی جماعت کے چھوٹے موٹے لیڈروں میں شمار ہونے لگا، کچھ عرصہ کے بعد اس نے اپنا رسوخ اور بڑھایا، اور ملان کے مشہور اشتراکی اخبار 'اوانتی' کی ادارت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ ایک قصبہ کے محدود حلقہ سے نکل کر اب مسولینی ایک بڑے شہر کی تیز روزندگی میں داخل ہوگیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس زمانے میں تیز، انقلابی ہنگامے ہوئے اور ہر ایک میں اشتراکیوں کے ہاتھوں ان کے بہت سے مخالف مارے گئے، ہر دفعہ مسولینی نے مجرموں کے ساتھ ہمدردی کی اور ان اعتدال پسند اشتراکیوں کو سخت سست لکھا جنھوں نے ان واقعات پر اظہار افسوس کیا تھا۔

بغاوت کا الزام

حکومت نے اس پر بغاوت کی امداد کا الزام لگایا اور باقاعدہ مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت میں نہ صرف اس نے اپنے جرم کا اقرار کیا بلکہ کہا کہ وہ پھر اس جرم کا ارتکاب کرنے کے لیے تیار ہے۔ عدالت میں تقریر کرتے ہوئے اس نے چلا کر کہا۔ ''ہم کو ایسا ملک نہیں چاہیے جس میں چار کروڑ انسان ایک ہی طرح سوچیں، گویا ان کے خیالات ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں۔ ہم کو اختلاف رائے، مباحثے اور فسادوں کی ضرورت ہے، بلا اختلاف کی زندگی موت یا دماغ کی خرابی کی علامت ہے۔'' جس اختلاف رائے کو وہ اس وقت زندگی کا جزو سمجھتا تھا آج اس نے اسے اپنی قوم کی زندگی سے ایسا خارج کر دیا ہے، گویا آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ اس الزام میں اس کو پانچ ماہ کی قید کی سزا ملی۔

''اوانتی' کے کالم اشتراکیت کو پھیلانے کے لیے وقف تھے اور روزانہ مسولینی سرمایہ داروں، امیروں اور عُمّال حکومت کے خلاف مضامین لکھتا تھا۔ تمام ملک کے غریب اور مزدور اس کو اپنا سب سے بڑا خیر خواہ اور رہنما سمجھنے لگے، 'اوانتی' کی اشاعت چالیس ہزار سے ایک لاکھ ہوگئی!

انقلاب کے آثار

انیسویں صدی کے آخر سے اٹلی کے عوام میں بے چینی کا اظہار ہو رہا تھا۔ یہ مخالفت فقط

حکومت ہی کی نہیں بلکہ پورے سیاسی اور اقتصادی نظام کی تھی۔ شکایات مختلف تھیں، ملک کے شمالی صوبوں پر آسٹریا کا جابرانہ قبضہ تھا۔ عوام میں اس کی محکومی کے خلاف شدید غم وغصہ تھا۔ کسانوں پر ہر قسم کے ٹیکسوں کا اتنا بار تھا کہ ان کی حالت تباہ تھی۔ شہروں میں سرمایہ دار مزدوروں پر ظلم کر رہے تھے اور روزانہ اسٹرائیک، ہڑتالیں اور جھگڑے ہوتے تھے۔

پارلیمنٹ صورت حال کو سنبھالنے میں بالکل ناکامیاب رہی تھی غم وغصہ کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں، اور ایک ہوا کے جھونکے کی منتظر تھیں کہ منتشر ہو کر انقلاب کی آگ ملک بھر میں پھیلا دیں۔ مسولینی اور اس کے اشتراکی رفیقوں نے دس برس تک اس آگ کو بھڑکایا اور ہر طرح سے لوگوں کو مروجہ نظام کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی۔

جنگ طرابلس

اس عرصہ میں طرابلس میں اٹلی اور ترکوں کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ عوام اس جنگ کے خلاف تھے اور افریقہ کے جلتے ہوئے ریگستان میں شہنشاہیت کے لیے جان دینے کو تیار نہیں تھے اور مسولینی (جو آج افریقہ کے ایک دوسرے حصے پر ایک ظالمانہ حملے میں مصروف ہے) اس وقت زور شور سے اس استعماری جنگ کی مخالفت کر رہا تھا۔ اسی زمانے میں ایک اطالوی سپاہی آگستو ساتی نے جنگ طرابلس میں جانے سے انکار کیا۔ اور اپنے کرنیل سے کچھ جھگڑا ہو جانے پر اس پر ریوالور کا فائر کر دیا، حکومت ساتی کو اس کے سنگین جرم کی پوری سزا دینے سے خائف تھی، عوام جنگ کے خلاف پہلے ہی سے تھی، اور اگر ساتی کو پھانسی دی جاتی تو ان کے جذبات اور بھی مشتعل ہو جاتے، لہٰذا حکومت نے چالاکی سے کام لے کر ساتی کو دیوانہ قرار دے کر ایک پاگل خانہ میں بند کر دیا، لیکن یہ چال بھی کامیاب نہ ہوئی۔ لوگوں نے ساتی کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کا دماغ بالکل ٹھیک ہے، جس کرنیل پر اس نے گولی چلائی تھی وہ معمولی طریقہ سے زخمی ہوا تھا اور بہر حال وہ ساتی کے جرم کو نہ صرف قابل معافی بلکہ قابل تعریف سمجھتے تھے، کیونکہ اس نے یہ گولی چلا کر تمام ملک کی طرف سے جنگ طرابلس کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

سرخ ہفتہ

ملک بھر میں مساتی کی رہائی کا مطالبہ کرنے کے لیے جلسے کیے گئے۔ سولینی نے اوانتی میں پرزور مضامین اس آگ کو بھڑکانے کے لیے لکھے۔ شورش نے بڑھتے بڑھتے حکومت کے خلاف بغاوت کی صورت اختیار کرلی، اپریل 1914 میں فیصلہ کیا گیا کہ 7 جون کو تمام ملک میں شہنشاہیت کے خلاف مظاہرے کیے جائیں اور مساتی کی رہائی کا مطالبہ کیا جائے۔ تمام انقلابی مزدور جماعتوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ اگر 7 جون کے مظاہروں سے فوج یا پولیس مزاحمت کرے تو فوراً عام ہڑتال کردی جائے، امید کے موافق پولیس نے تحفظ امن کے بہانے سے کئی جگہ لوگوں پر حملہ کیا، چند آدمی مقتول اور بہت سے زخمی ہوئے۔ فوراً ہڑتال کا اعلان کردیا گیا اور 8 جون سے 14 جون تک پوری ہڑتال کر کے 'سرخ ہفتہ' منایا گیا۔

ہفتۂ انقلاب

ملک کے اکثر صوبوں میں جہاں انقلابی تحریک زور پکڑ چکی تھی، تشدد کے مظاہرے ہوئے۔ فوج پر حملہ کیا گیا، ان کے ہتھیار چھین لیے، کھیتوں میں آگ لگا دی گئی گرجا لوٹ لیے گئے اور حکومت کے افسروں کو ضمانت کے طور پر گرفتار کرلیا، کچھ عرصہ کے لیے تو امید ہو چلی تھی کہ اٹلی میں شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا اور جمہوری حکومت کا دور شروع، لیکن حکومت نے سختی سے اس شورش کا مقابلہ کیا اور جلد ہی صورت حال کو سنبھال لیا۔

اس شورش میں سولینی نے کوئی عملی حصہ نہیں لیا اور نہ وہ اس تحریک کے سرداروں میں تھا، 'اوانتی' میں اس نے مضامین ضرور لکھے اور اسی وجہ سے اس کا نام کافی مشہور ہوگیا، مگر تمام شورش میں وہ کسی خطرہ کے مقام پر نہیں گیا اور اسی لیے عوام اس کو ایک بزدل اور ڈرپوک انقلابی سمجھنے لگے۔

'سرخ ہفتہ' کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ اکثر مقامی حکومتوں میں اشتراکی کافی تعداد میں منتخب ہوگئے اور ملان کی کونسل میں سولینی کو بھی ایک نشست مل گئی۔

جنگ کے خلاف جنگ

اسی عرصہ میں جنگ عظیم شروع ہوگئی اور تمام اطالویوں کی توجہ ملکی جھگڑوں سے بین الاقوامی معاملات اور خصوصاً جنگ میں اٹلی کی شرکت کے امکانات کی طرف مبذول ہوگئی، اشتراکیوں نے فوراً تحریک شروع کردی کہ اٹلی اس جنگ میں کسی کا ساتھ نہ دے اور اپنی غیر جانبدار حیثیت کو قائم رکھے، اس تحریک کا زبردست علم بردار مسولینی تھا!

اگر کسی کو انسانی ذہنیت کی تبدیلی کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کو چاہیے کہ 1914 و1915 کی 'اوانتی' کی جلدوں میں مسولینی کے مضامین پڑھے۔ جنگ کے دیوتا کا یہ پجاری، جو حبش میں ہزاروں اطالویوں اور حبشیوں کی موت کا ذمہ دار ہے، اس وقت لکھتا ہے:

> ''دنیا کے مزدوروں کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ جنگ کے امکانات کا خاتمہ کردیں۔ جنگ فقط امیروں اور جنگ پسند جماعتوں MILITARIST کے فائدہ کے لیے ہے۔ اے، اٹلی کے مزدورو! تم کو جنھوں نے غربت اور بے روزگاری میں اپنی قربانیوں کا ثبوت دیا ہے، اپنے ملک کو جنگ میں شرکت سے بچانے کے لیے تیار ہوجاؤ۔''

کئی ہفتے تک ہر روز 'اوانتی' میں مسولینی جنگ کے خلاف اسی قسم کے مضامین لکھتا رہا۔

جنگ کا موافق

ایک مہینے تک جنگ کے خلاف جنگ کرنے کے بعد مسولینی نے کیچلی بدلی۔ لوگوں نے 'اوانتی' کے مضامین کی روش میں تبدیلی محسوس کی۔ مسولینی کے مداح کہتے ہیں کہ اس کے دل میں سچے شکوک پیدا ہو رہے تھے اور وہ واقعی اب یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کے ملک کی بہبودی کے لیے جنگ میں شرکت ضروری ہے لیکن اس بیان کو تسلیم کرنے میں دو دقتیں ہیں۔ اول تو مسولینی کسی خاص جنگ کا نہیں بلکہ ہر جنگ کا مخالف تھا اور اشتراکیوں کی طرح اس کا نظریہ یہ تھا کہ ہر جنگ میں مال دار جماعتوں کا نفع اور مزدوروں کی موت ہوتی ہے۔ وہ قوم پرستی تک کا مخالف تھا اور ایک بین الاقوامی اشتراکی نظام کا حامی۔ کیا اتنے اٹل اور عالمگیر اصول اس قدر جلد بدل سکتے

ہیں؟ دوسرے ہمیں اٹلی کے ایک اخبار 'ال رستوڈل کارلینو' کی 1914 کی جلد میں مسولینی کی اصولی تبدیلی کی پوری کہانی ملتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع سے اشتراکیت یا قوم پرستی نہیں بلکہ ذاتی مفاد اس کا اصول رہا ہے۔ یہ اخبار لکھتا ہے:

''......اس وقت مسولینی نے بولوگنا کے ایک اخبار کے ایڈیٹر فلپو نالڈی سے گفت وشنید شروع کی اور وعدہ کیا کہ اگر اس کو ایک دوسرے اخبار کی ادارت دلا دی گئی تو وہ جنگ میں شرکت کی مخالفت چھوڑ کر موافقت کرنے لگے گا، جب اس کو یہ امید دلا دی گئی تو اس نے 'اوانتی' میں ایک مضمون لکھا۔ جس میں کہا کہ اٹلی کو فی الحال تو جنگ سے علیحدہ ہی رہنا چاہیے لیکن موقعہ آنے پر اس میں شرکت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ مضمون شائع ہوتے ہی اس کے اشتراکی رفیقوں نے اس کے اس نظریہ کی مخالفت کی، اس کے بعد وہ دو ہفتے تک 'اوانتی' کا ایڈیٹر رہا اور اس عرصہ میں نالڈی کی شرکت میں ایک نئے اخبار 'ال پوپوڈ اتالیا' کی اشاعت کا انتظام مکمل کرتا رہا۔ اور یہ قرار پایا کہ مسولینی اس اخبار کا ایڈیٹر اور مالک ہو، یہ سب انتظامات کرکے اس نے 'اوانتی' سے استعفیٰ دے دیا، مگر اپنے آخری مضمون میں یہ وعدہ کیا کہ وہ کبھی اشتراکی پارٹی یا 'اوانتی' کی مخالفت نہ کرے گا، اس کے بعد وہ اپنے نئے اخبار کے لیے روپیہ لینے جنیوا گیا۔''

یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرانس کے سیاست داں از حد کوشاں تھے کہ اٹلی جنگ میں ان کا ساتھ دے اور اسی لیے انھوں نے کافی روپیہ پروپگینڈا کے لیے اٹلی بھجوایا تھا تاکہ رائے عامہ کو جنگ میں شرکت کے لیے تیار کیا جائے۔ یہ روپیہ تھا جو مسولینی کو نیا اخبار شروع کرنے کے لیے ملا۔

نیا مسولینی

ایک نئے اخبار کی اشاعت کے ساتھ ایک نیا مسولینی بھی نمودار ہوا، جس زور شور سے وہ 'اوانتی' میں شرکت جنگ کی مخالفت کررہا تھا، اب اسی زور شور سے مسولینی نے جنگ کی موافقت

شروع کردی اور باوجود اپنے وعدہ کے اشتراکیوں اور 'اوانتی' پر نہایت رکیک حملے کیے۔ اکتوبر میں وہ اشتراکی پارٹی سے نکال دیا گیا۔

اشتراکی سولینی اس دنیا سے رخصت ہوگیا اور پھر کبھی نہ لوٹا! اس سابق امن پسند اشتراکی کے نئے اخبار کی سرخی کے نیچے اس کی پالیسی کی تشریح کے لیے یہ الفاظ لکھے رہتے تھے۔

''جس کے پاس ہتھیار ہیں اس کے پاس روٹی بھی ہے۔''

امن اور اشتراکیت کے پرستار نے اب جنگ کے دیوتا کی پوجا شروع کر دی۔ ایک زمانے میں اپنے سیاسی مخالفین کے متعلق سولینی نے لکھا تھا۔

''دنیا ایسے لوگوں سے بھری ہوئی ہے جو خریدے جاسکتے ہیں۔ ضمیروں کے بازار میں اپنی بولی لگاؤ، سب قسم کے لوگ فروخت کے لیے موجود ہیں'...... ہر عمر کے ہر نسل کے۔''

کیا 'ضمیروں کے بازار' میں سولینی کی قیمت فقط ایک اخبار کی ادارت تھی؟

اٹلی جنگ کے میدان میں

یہ کہنا کہ محض سولینی کے اثر سے اٹلی نے جنگ میں شرکت منظور کی، اس کی اور اس کے اخبار کی اہمیت کے متعلق مبالغہ ہوگا۔ چند ہزار کی اشاعت کا ایک اخبار جس کے ایڈیٹر اور مالک کی ایمانداری کے متعلق لوگوں کو شکوک ہوں، ایک قوم اور حکومت کی رائے کو نہیں بدل سکتا بلکہ سولینی کی تبدیلی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ حکومت اب جنگ میں شرکت چاہتی ہے۔ لہٰذا اس ابن الوقت نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی پالیسی کو بدل دے۔

اٹلی کی حکومت اس عرصہ میں جرمنوں اور انگریزوں دونوں سے اپنی مدد کی قیمت چکا رہی تھی۔ جرمن اس کو ٹرنی ٹینو کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے زیادہ دینے کے لیے نہیں تیار تھے۔ لیکن انگریزوں نے وعدہ کیا کہ اگر اٹلی نے ان کی مدد کی تو وہ فتح کے بعد اس کو پورا ٹرنی ٹینو، ٹائرول اور ٹریسٹ آسٹریا سے چھین کر دے دیں گے۔ اٹلی نے یہ قیمت منظور کر لی اور مئی 1915 میں باقاعدہ اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوگیا۔

○

فاشیت اور مسولینی کا عروج

اتحادیوں کی وعدہ شکنی

جنگ عظیم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اتحادی۔۔ بلجیم کی حفاظت اور دنیا میں آزادی اور جمہوریت قائم رکھنے کے لیے لڑے تھے۔ لیکن 1914 اور 1915 کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر قوموں نے جرمنوں کی مخالفت کسی بلند مقصد کے لیے نہیں بلکہ جرمنی کی نوآبادیات اور مقبوضات حاصل کرنے کے لیے کی تھی۔ خاص کر اٹلی نے تو صاف طور سے اس شرط پر فرانس اور برطانیہ کا ساتھ دیا تھا کہ جنگ کے اختتام پر ٹرنی ٹینو، ٹائرول، ٹریسٹ، فیوم، ڈالمیشیا اور جرمنی کی نوآبادیات میں سے چند علاقے اس کے حوالے کر دیے جائیں گے، پہلے اٹلی نے جرمنی سے بھی بات چیت کی تھی لیکن جرمنی اس کے اتحاد کی قیمت ٹرنی ٹینوں سے زیادہ دینے پر تیار نہ تھا۔ لہٰذا اطالوی مدبّروں نے برطانیہ اور فرانس سے سودا چکایا اور جنگ کی بھٹی میں اطالوی سپاہیوں مزدوروں اور کسانوں کو جھونک دیا تاکہ شاہ اٹلی کے مقبوضات میں اضافہ ہو جائے۔ یہ ہے وہ ذہنیت جس کے ماتحت قومیں جنگ کرتی ہیں!

ان ارادوں اور امیدوں سے اٹلی نے جرمنی اور آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ باوجود سارجنٹ مسولینی کی موجودگی کے اطالوی فوجوں نے ہر طرف بری طرح شکست کھائی۔

ہزاروں اطالوی سپاہی جرمن اور آسٹرین فوجوں کے ہاتھوں مارے گئے لیکن اطالوی حکومت کو ان جانوں کے ضائع ہونے کا چنداں افسوس نہ تھا۔ افسوس تو اصل میں یہ تھا کہ باوجود ان تمام قربانیوں کے جو علاقہ معاہدہ کی رو سے ملنے والا تھا وہ جنگ کے ختم ہونے پر اتحادیوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ فرانس اور برطانیہ نے موقع پر اٹلی سے کام نکالنے کے لیے وعدہ ضرور کرلیا تھا لیکن جب وعدہ پورا کرنے کا وقت آیا تو صاف مکر گئے۔ اوّل تو اطالوی فوجیں ہر لڑائی میں شکست کھاتی رہیں اور جب دوسروں نے جنگ میں فتح حاصل کر لی تو فاتحوں میں شریک ہوگئیں۔ دوسرے بھلا فرانسیسی اور انگریز یہ کب چاہتے تھے کہ اتنے علاقوں پر قبضہ کر کے اٹلی ان سے زیادہ طاقتور ہو جائے۔ موجودہ سامراجی نظام کے ماتحت بین الاقوامی سیاست میں سچائی اور پاس عہد کی امید رکھنا ہی بیکار ہے۔

مزدوروں کی شکست

غرض جنگ کے ختم ہونے پر اطالوی ایک ہاری ہوئی قوم تھی۔ جن مقبوضات کو حاصل کرنے کے لیے ہزاروں سپاہیوں اور کروڑوں روپے کی قربانی کی تھی، وہ بھی نہ ملے۔ ملک میں جنگ کے اخراجات کی وجہ سے افلاس بڑھ گیا اور ہر جگہ بے چینی اور غصہ کے آثار نظر آنے لگے۔ سینکڑوں خفیہ جماعتیں قائم ہوگئیں۔ ہڑتالیں، فساد، کشت وخون کا بازار گرم ہو گیا۔ ایک دفعہ تو مزدوروں نے چھ سو کارخانوں پر قبضہ کرلیا اور ان کو اپنی مشترکہ ملکیت قرار دے دیا۔ لیکن اشتراکی اور مزدور جماعتیں کمزور تھیں اور سرمایہ داروں اور ان کے معاون فاشیوں کے پاس روپیہ بھی تھا اور طاقت بھی۔ جلد ہی مزدوروں کو شکست ہوئی اور اس دن سے اٹلی میں اشتراکیت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ پھر کبھی مزدوروں کو اپنی جماعت مضبوط کرنے کا موقع نہ ملا۔

یہ وہ فضا تھی جس میں مسولینی نے اپنے اقتدار اور طاقت کو بڑھانے کا موقع پایا۔

سرمایہ پرستی کا حامی

اشتراکیوں کا ساتھ چھوڑنے کے بعد بھی اب تک مسولینی کبھی کبھی سرمایہ پرستوں کی

مخالفت کر دیتا تھا،لیکن اب اس نے کھلم کھلا سرمایہ داری کی موافقت اور اشتراکیت کی مخالفت شروع کر دی اور وہی شخص جو ایک زمانے میں مارکس اور لینن کے اصولوں کو دنیا کی نجات کا ذریعہ قرار دیتا تھا اب ان کا زبردست مخالف بن گیا۔ اس نے اپنے اخبار کو اشتراکیوں اور مزدور جماعتوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے وقف کر دیا۔اس شدید مخالفت کی ایک بڑی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اشتراکی اس پر ضمیر فروشی اور غداری کا الزام لگاتے تھے۔انھوں نے اس کو ذلیل کر کے اپنی پارٹی سے نکال دیا تھا۔اور یہ ذلت تھی جس کو ہٹانے کا خیال مسولینی کے دماغ پر مسلط تھا۔اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنے مخالفوں کو نیچا دکھا کر رہے گا،خواہ اس کے لیے اسے اپنے اصولوں کی کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ کرنی پڑے اس نفرت کا جذبہ مسولینی کے اس وحشیانہ اور ظالمانہ سلوک کا ذمہ دار ہے۔ جو اس نے طاقت پانے کے بعد اشتراکیوں کے ساتھ کیا۔

غرض جس مسولینی نے مزدوروں کو مالکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔وہی اب ان کو سرمایہ داری کی غلامی کا سبق دے رہا تھا۔اس کے اخبار میں اب بھی ایک قومی انقلاب کی ضرورت پر زور دیا جاتا تھا۔مگر اب انقلاب کے معنی مزدوروں اور کسانوں کی حکومت کے نہیں رہے تھے بلکہ اب وہ ایک ایسا انقلاب چاہتا تھا جو اشتراکیت کی تحریک کو فنا کر کے ایک مضبوط مغرور اور جارحانہ قومیت کی بنیاد ڈالے۔اس سابق اشتراکی نے اپنے پرانے اصولوں کو بالائے طاق رکھدیا اور یہاں تک سامراج کا حامی ہو گیا کہ اٹلی کے مقبوضات اور نو آبادیات کے مطالبہ کی حمایت شروع کر دی۔

فاشی پارٹی

اس وقت کے حالات اس کی کامیابی کے لیے مساعد تھے۔ ملک میں اقتصادی حالت خراب ہونے کے باعث بیکاروں کی تعداد میں خوفناک اضافہ ہو گیا تھا،ہزاروں سپاہی دفعتاً فوج سے برخواست کر دیئے گئے تھے۔ ہتھیاروں کے کارخانے بند ہو جانے سے ہزاروں مزدور سڑکوں پر بھوکے اور بیکار پھر رہے تھے۔مسولینی نے کچھ روپیہ جمع کر لیا تھا۔اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے بیکاروں کی مالی امداد شروع کر دی اور ان کو سینکڑوں کی تعداد میں اپنے گرد جمع

کرلیا۔ اس کے ساتھیوں میں ان بیکاروں کے علاوہ درجنوں سابق اشتراکی اور انقلابی بھی تھے۔ جو اس کی طرح اپنی پارٹیوں سے غداری کے جرم میں نکالے گئے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جو مسولینی کی سرکردگی میں فاشی پارٹی کے نام سے اٹلی کی سیاست میں نمودار ہوئے۔

ناکامی، مفلسی اور تنزل کے زمانے میں انسان کا عام رجحان یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کے کارناموں کو یاد کر کے تسکین حاصل کرے۔ اس انسانی کمزوری سے مسولینی اور اس کی پارٹی نے پورا فائدہ اٹھایا۔ جنگ کے بعد اطالوی قوم پر شکست اور افلاس کے باعث ناامیدی اور کم ہمتی چھائی ہوئی تھی۔ مسولینی اور اس کے ساتھیوں نے ان کو ان کے ملک کی پرانی شاندار روایات یاد دلائیں، رومائے قدیم کی فتوحات اور رومن تہذیب وتمدن کی عظمت کے گیت گائے اور قوم پرستی کا جذبہ دوبارہ بیدار کیا۔

پرانے زمانے میں رومن حاکموں کا نشان لکڑیوں کا ایک گٹھا ہوتا تھا۔ جس کے بیچ میں ایک کلہاڑا رکھا ہوا ہوتا تھا، اس کو فاشے کہتے تھے۔ روم کی پرانی عظمت یاد دلانے کے لیے مسولینی کے ساتھیوں نے اس گٹھے کو اپنے نشان کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا اور اس طرح اس پارٹی کا نام فاشی پڑا۔

اب فاشزم یا فاشیت ہر اس نظام کو کہا جاتا ہے۔ جس میں اٹلی کی طرح جارحانہ قوم پرستی کی آڑ میں ایک مُستبد شخصی حکومت کو قائم کیا جائے۔

اصول؟

اب فاشیت کے عروج کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس تحریک کی کامیابی اور اقتدار کا مطالعہ کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے اصولوں کا مطالعہ کریں۔ اس کے پروگرام کی جانچ کریں۔ اس کے بانی کے مقاصد سے آگاہی حاصل کریں۔

فاشیت کے اولین اصول کیا تھے؟

یہ سوال اگر مسولینی سے کیا جائے تو وہ ایک نہایت طویل اور شاندار فہرست سنا سکتا ہے، رومائے قدیم کی شاندار روایات کو زندہ کرنا۔ اطالویوں کو ایک زبردست اور مضبوط قوم بنانا'

عیسائی تہذیب کی اشاعت، پس ماندہ اقوام کی حفاظت اوران کی ترقی کا ٹھیکہ لینا۔ یہ سب الفاظ اکثر فاشی صحافیوں اور مقرروں سے سننے میں آتے ہیں۔

لیکن 1919 میں جب اس نے فاشی جماعت کی بنیاد ڈالی تو شاید خود مسولینی کو بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کی جماعت کے اصول کیا ہیں اس کا پروگرام کیا ہوگا اور وہ کس طرح پورا ہوگا۔ اس کے اخبار کی کوئی مستقل پالیسی نہیں تھی۔ آج اگر مزدوروں کی حمایت میں کالم سیاہ ہو رہے ہیں، تو کل سرمایہ پرستی کی خوبیوں پر مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ کبھی غیر ملکی مقبوضات کی مخالفت ہے، کبھی موافقت، کچھ عرصے عیسائیت کی شدید مخالفت کی۔ پوپ اور پادریوں کا مذاق اڑایا کلیسائے روم کی تضحیک کی۔ پھر وہی شخص عیسائی تہذیب کا سب سے بڑا علمبردار بن گیا۔ فاشیت کے ابتدائی دور میں مسولینی انفرادیت کا زبردست حامی تھا۔ اس کا اخبار مطالبہ کرتا تھا کہ حکومت کو چاہیے کہ ہر شخص کو مکمل آزادی دے۔ مذہبی، سماجی، اقتصادی کسی معاملے میں حکومت دخل نہ دے۔ مگر جوں جوں مسولینی کے ہاتھ میں طاقت آتی گئی یہ نظریہ بھولتا گیا اور آج فاشی اٹلی میں کون شخص شخصی آزادی کا نام لے سکتا ہے۔ 1919 میں مسولینی کا سب سے بڑا اعتراض اشتراکیت کے خلاف یہ تھا کہ اشتراکی نظام میں حکومت انسان کی زندگی کے ہر شعبہ پر قابض ہو جاتی ہے۔ آج مسولینی کے دورِ حکومت میں اٹلی میں نہ صرف آزادیٔ رائے سلب ہے، بلکہ حکومت اپنے شہریوں کے کھانے پینے، شادی اور اولاد غرض ہر معاملے میں دخل دیتی ہے۔

پھر جس شخص نے ایک اخبار کی ادارت کے لیے اپنے عمر بھر کے اصولوں کو چھوڑ دیا ہو اس سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ وہ کسی بلند نظریہ کے لیے جدوجہد اور قربانی کرے گا؟ جہاں تک مسولینی کا تعلق ہے ہم مجبوراً اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس پارٹی کو قائم کرنے سے اس کا مقصد ہر ممکن طریقہ سے اپنی ذاتی طاقت اور اپنے اقتدار کو بڑھانا تھا، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، تاریخ میں مسولینی جیسے انسانوں کے نام زرّیں حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔ سکندر نے ہندوستان پر کیوں حملہ کیا؟ ہلاکو اور چنگیز خاں نے دنیا کو کیوں تہ و بالا کر ڈالا۔ محض اپنے ذاتی اقتدار کو بڑھانے اور اپنی سلطنت قائم کرنے کے لیے، اسی طرح مسولینی بھی اپنی طاقت بڑھانے کے لیے کوشاں تھا۔ مطلق العنان اختیارات حاصل کرنے کا جنون اس کے سر پر سوار تھا۔ یہ وہی جنون ہے جو

تاریخ کے تمام شخصی حکمرانوں، زبردست فاتحوں، مشہور، جرنیلوں پر سوار رہا ہے۔ بلا کو اور نپولین، جولیس سیزر اور زار روس، یہ سب مسولینی کے پیش رو تھے۔ فرق یہ تھا کہ وہ لوگ اس زمانے میں پیدا ہوئے تھے جب شخصی حکومت کا دور تھا۔ مسولینی کی پیدائش بھی چند صدی پہلے ہوئی تھی اور اس کو اپنے ارادوں میں ایسی ہی کامیابی حاصل ہوئی ہوتی تو وہ بھی ایک مشہور فاتح شمار ہوتا۔ مگر اپنی بدقسمتی سے وہ انیسویں صدی کے اخیر میں پیدا ہوا جب جمہوریت اور اشتراکیت کا زور تھا۔ اس لیے مسولینی کے لیے ضروری ہوا کہ اپنی شخصی حکومت کو قوم پرستی کے پردے میں قائم کرے۔

نفرت کا جذبہ

قوم پرستی کی آگ بھڑکانے کے لیے نفرت کا جذبہ بہت کام دیتا ہے۔ اس لیے مسولینی نے اشتراکیت کے خلاف نفرت پھیلانی شروع کی، اپنے اخبار کے ذریعہ اس نے اشتراکیت کی ایک خوفناک اور بھیانک تصویر ملک کے سامنے پیش کی، لوگوں کو بتایا کہ اگر اٹلی میں اشتراکیت قائم ہو گئی تو ان کی پرانی تہذیب، ان کا مذہب، ان کی معاشرت سب فنا ہو جائیں گے۔ اطالوی وحشی روسیوں کے غلام بنا لیے جائیں گے اور ان کے قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا، اشتراکی پارٹی کے خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے اپنی فاشی پارٹی کو پیش کیا، 'اگر روس کی غلامی سے بچنا چاہتے ہو تو فاشی پارٹی میں شریک ہو جاؤ۔' یہ تھا اس کا نعرۂ جنگ، سرمایہ دار، زمیندار، تاجر یہ سب تو اشتراکیت سے خائف تھے ہی، انھوں نے فاشی پارٹی میں اپنے فائدہ کی صورت دیکھی اور مسولینی کی مالی مدد کی۔

مزدوروں سے مسولینی نے کہا کہ وہ ان کے حقوق کے لیے لڑ رہا ہے۔ لیکن ان کا نفع اشتراکیوں کا ساتھ دینے میں نہیں ہے بلکہ سرمایہ داروں کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے میں ہے۔ کسانوں کو اس نے امید دلائی کہ فاشی حکومت میں ان کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو جائے گی۔ بیکاروں کو اس نے اپنی سیاہ پوش فوج میں بھرتی کر لیا۔ ہر سیاسی جلسہ میں اس کے سپاہی اپنی سیاہ قمیض پہنے اور ڈنڈے ہاتھ میں لیے موجود رہتے تھے تا کہ عوام ان کی طاقت سے مرعوب رہیں۔

مقبوضات کا مطالبہ

اشترا کیوں کی مخالفت کے ساتھ ساتھ اس نے حکومت کی مخالفت بھی شروع کر دی۔ شاہ اٹلی انگلستان کے بادشاہ کی طرح برائے نام آئینی حکمراں ہے دراصل حکومت اس کے نام سے منتخب شدہ وزیر کرتے ہیں۔ مسولینی نے ان وزیروں پر حملہ کرنا شروع کیا۔ ملک میں ہر خرابی اور ابتری کا الزام ان کے سر لگا دیا۔ بیکاری کیوں ہے؟ حکومت کا قصور۔ مفلسی کیوں ہے؟ حکومت نا کارہ ہے اور سب سے بڑا الزام حکومت پر یہ لگایا کہ اپنی کمزوری کی وجہ سے وہ اتحادیوں سے معاہدہ کے باوجود مقبوضات نہیں لے سکی۔ جیسا ہم بتا چکے ہیں واقعتاً اطالوی حکومت کے ساتھ اتحادیوں نے معاہدہ شکنی کی تھی۔ جن علاقوں کا وعدہ کیا گیا تھا ان میں سے آدھے بھی اٹلی کو نہیں دیے گئے لیکن اپنی کمزوری کی وجہ سے سوائے تحریری احتجاج کے اطالوی حکومت برطانیہ، فرانس اور امریکہ جیسی طاقتور قوموں کے مقابلہ میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ وہ اسی پر قانع تھی کہ جنوبی ٹائرول آسٹریا سے چھین کر اٹلی میں شامل کر دیا گیا تھا۔ مگر فاشیوں نے حکومت کی کمزوری سے پورا فائدہ اٹھایا اور عوام کے جذبات کو اس کے خلاف مشتعل کیا۔

فیوم پر قبضہ

فیوم کا صوبہ بھی معاہدہ کی رو سے ہنگری سے علیحدہ کر کے اٹلی کو ملنا چاہیے تھا۔ لیکن اتحادی اٹلی کی طاقت بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ یہ صوبہ یوگوسلاویہ میں شامل کر دیا جائے۔ اٹلی میں اس پر سخت غصہ تھا اور فاشیوں اور دوسری قوم پرست جماعتوں کا مطالبہ تھا کہ اس علاقے پر اٹلی قبضہ کرے اور یہ ایک طرح سے ایک جائز مطالبہ بھی تھا۔ کیونکہ فیوم میں زیادہ تر باشندے اطالوی نسل کے تھے۔ فیوم کے ساتھ ہمدردی کے جذبہ نے اس قدر زور پکڑا کہ سیکڑوں اطالوی نوجوان اپنے گھر چھوڑ کر فیوم ہجرت کر گئے۔ تا کہ اپنے ہم نسلوں کے رنج و راحت میں شریک رہیں اور 12 ستمبر 1920 کوڈ آنوزیو اور اس کے چند ساتھیوں نے فیوم پر جا کر قبضہ کرلیا۔

ڈآنوزیو

ڈآنوزیو آج بھی مسولینی کے بعد اٹلی کی سب سے بڑی شخصیت سمجھا جاتا ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کی جرأت اور دلیری فاشیت کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ یہ شخص جو شاعر بھی تھا اور ہوائی جہاز رانی میں مشتاق بھی، اس نے اپنی نظموں سے عوام کے جذبات مشتعل کیے اور اپنی ذاتی بہادری سے لوگوں کے سامنے ایک زبردست مثال قائم کی۔ اگست میں وہ اپنے ہوائی جہاز میں دنیا کے سفر کے لیے روانہ ہونے والا تھا تاکہ اطالوی جرأت کا ثبوت دے لیکن فیوم کا قصہ چھڑ جانے پر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور چند سو نوجوانوں کو ساتھ لے کر فیوم پر جا کر قبضہ کر لیا۔ اس علاقے پر اس زمانے میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی۔ اور آبادی زیادہ تر اٹلی کے موافق تھی اس لیے کوئی خاص دقت نہ ہوئی ستمبر سے دسمبر کے اخیر تک ڈآنوزیو فیوم پر قابض رہا اس کو امید تھی کہ مسولینی اس کی مالی اور اخلاقی مدد کرے گا۔ کیونکہ وہ بھی فیوم پر قبضہ کرنے کا شدید موافق تھا لیکن اس ابن الوقت نے اپنے ساتھی کو دھوکہ دیا اور وزیراعظم جیولیتی سے خفیہ معاہدہ کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے جیولیتی نے مسولینی کو اجازت دے دی کہ وہ اشتراکیوں اور مزدور جماعتوں کے خلاف جو چاہے لکھے اور مسولینی نے وعدہ کیا کہ وہ فیوم کے معاملے میں خاموش رہے گا اور ڈآنوزیو کے خلاف فوجی جہاز بھیجے گئے تو فاشیوں میں سے کسی نے زبانی احتجاج بھی نہ کیا۔ ڈآنوزیو کو مجبور ہو کر فیوم چھوڑنا پڑا۔

فاشی پارلیمنٹ میں

حکومت نے حسب وعدہ مسولینی اور فاشی جماعت کی خفیہ مدد کی۔ فوجیوں کو فاشی پارٹی میں شریک ہونے کی ممانعت نہ رہی اور جب مسولینی کے گرگوں نے اشتراکی اور مزدور لیڈروں کے خلاف باقاعدہ تشدد شروع کیا تو حکومت خاموش بیٹھی دیکھتی رہی۔

اسی عرصہ میں مسولینی نے اپنی فاشی سیاہ پوش فوج کو مضبوط کرنا شروع کیا، اور اپنی پارٹی کے نظام کو مضبوط کرنے کے لیے کوئی دقیقہ نہ اٹھا چھوڑا۔ اب سالانہ انتخاب کا زمانہ قریب آتا

جارہا تھا، لہٰذا ایک دفعہ ڈآنوزیو کو دھوکا دینے کے باجود مسولینی نے فیوم کی شورش سے فائدہ اٹھایا ڈآنوزیو کی شکست اور پسپائی کے بعد عوام میں حکومت کے خلاف پھر آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اب فاشی فیوم کا انتقام لینے کا ذکر کرنے لگے۔ مسولینی کی دھواں دھار تقریروں نے ملک پر کافی اثر کیا اور جب انتخابات کے نتائج شائع ہوئے تو معلوم ہوا کہ 33 فاشی پارلیمنٹ میں منتخب ہوئے۔ اب لوگوں کو پہلی مرتبہ فاشیت کی اہمیت اور اس کے اثر کا اندازہ ہوا۔

شہنشاہیت کا حامی

اب مسولینی نے دیکھا کہ وقت آگیا ہے کہ وہ اپنی قوت کو اور مستحکم کر کے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے۔ ملک کی حالت یہ تھی کہ سرمایہ داروں، فاشیوں اور حکومت کی متفقہ کوششوں سے اشتراکی اور مزدور جماعتیں بالکل کمزور ہوگئی تھیں۔ مسولینی کے پاس ایک کافی مضبوط اور منظم فوج تھی، جو اپنے سیاسی حریفوں پر ڈنڈوں سے حملہ کرنے میں دریغ نہ کرتی تھی۔ سرمایہ داروں کی عنایت سے اب اس کی پارٹی کے پاس روپیہ بھی تھا اور پارلیمنٹ میں نمایندے بھی۔ اب حکومت حاصل کرنے میں کیا امر حائل ہوسکتا تھا؟ صرف اطالویوں کی شہنشاہ پرستی۔ شاہ اٹلی کو اختیارات حاصل نہ تھے مگر وہ عوام میں ہر دلعزیز ضرور تھا اور یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ مسولینی شہنشاہیت کا خاتمہ کر سکے۔

اس نے ایک اور رنگ بدلا اور ایک سابق اشتراکی جو کسی زمانے میں شہنشاہیت کا سخت ترین مخالف تھا، اب اس کا حامی بن گیا۔ اس نے سوچا کہ بادشاہ تو برائے نام ہے۔ بادشاہت کو قائم رکھتے ہوئے وہ حقیقی سیاسی طاقت کیوں نہ حاصل کرے۔ مسولینی نے اعلان کر دیا کہ فاشی تو شاہ اٹلی کے سچے خادم ہیں اور ان کا مقصد ملک کو ان فتنوں سے پاک کرنا ہے جو شہنشاہیت کے خلاف سر اٹھا رہے ہیں۔

اس اعلان کے بعد بادشاہ نے بھی فاشیوں پر نظر عنایت کرنی شروع کر دی۔ شہنشاہیت کے بدترین مخالف اشتراکی تھے۔ اور اشتراکیوں کا بدترین دشمن مسولینی۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ شہنشاہیت مسولینی کو اپنے دامن عاطفت میں جگہ دے۔

اس عرصہ میں کئی وزارتیں بدلیں اور فاشیوں کی مخالفت اور شورش کی وجہ سے کوئی بھی کامیاب نہ ہوسکی۔ ملک بھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ فاشی سپاہی اور افسر خدائی فوجدار بنے ہوئے تھے اور جو چاہتے تھے وہ کرتے تھے۔ بادشاہ کی طرف داری کے بعد سے حکومت اور فوج کے ہزاروں افسر بھی فاشی ہو گئے۔

روم پر دھاوا

27 اکتوبر 1922 فاشیوں نے روم پر اپنا تاریخی 'دھاوا' کیا، ہزاروں فاشی سپاہی باقاعدہ کوچ کرتے ہوئے شہر میں پہنچ گئے، اور عام آدمی پر رعب اور دہشت طاری کر دی۔ لطف یہ کہ دوراندیش مسولینی خود اپنی فوج کے ساتھ نہ تھا۔ وہ خطرہ سے ہمیشہ دور رہنا پسند کرتا تھا۔

اس کے دو نائب بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فاشی پارٹی کی خدمات کو اس کے سامنے پیش کیا۔ پہلے بادشاہ نے اور پارٹیوں کے وزیروں کے ساتھ مسولینی کو وزارت دینی چاہی۔ لیکن مسولینی نے انکار کر دیا، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ تمام وزارتیں فاشیوں کو دے دی جائیں، 30 اکتوبر کو ریل میں آرام سے سوتا ہوا مسولینی روم پہنچا اور وزیرِاعظم کا عہدہ قبول کر لیا۔ مگر اس کی تسلی صرف آئینی وزیرِاعظم بننے سے نہیں ہو سکتی تھی، وہ پارلیمنٹ کو برخواست کر کے اٹلی کا مطلق العنان حکمراں (ڈکٹیٹر) بننا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے فوراً کوشش شروع کر دی۔

میٹی اوٹی کا قتل

لیکن مطلق العنان حکومت بغیر خون بہائے قائم نہیں ہوتی۔

پارلیمنٹ میں اب بھی تھوڑے بہت اشتراکی باقی تھے۔ 24 مئی 1934 کو جب اجلاس شروع ہوا تو انھوں نے مسولینی کی حکومت پر اعتراض کیے سب سے زبردست تقریر میٹی اوٹی نے کی جو اس وقت اشتراکی جماعت کا لیڈر تھا۔ چند دنوں کے بعد میٹی روم سے غائب ہو گیا اور ایک ہفتہ کے بعد اس کی لاش ملی۔ اس کا قاتل کون تھا؟ لوگوں کا شبہ فوراً فاشیوں پر گیا لیکن مسولینی

نے اپنی پارٹی کی طرف سے اس جرم کی مذمت کی اور کسی قسم کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔

مگر چند واقعات اس سلسلے میں قابل غور ہیں، میٹی اوٹی کے قتل سے کچھ روز پہلے مسولینی کے اخبار ''پوپولوڈ اٹالیا'' میں مندرجہ ذیل نوٹ ایڈیٹر کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

''اس بدمعاش، آوارہ، لچے، اور بدترین غنڈے میٹی اوٹی کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر کسی دن اس کا سر توڑ دیا گیا تو اس کو شکایت کرنے کی گنجائش نہ ہوگی۔

اس قتل سے مسولینی اور اس کی پارٹی کے خلاف عوام میں غصہ کے جذبات مشتعل ہو گئے تھے اور خدشہ تھا کہ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اشتراکی پھر سر اٹھائیں، لہٰذا مسولینی نے پوری تفتیش کا حکم دیا۔ چند فاشی اس جرم میں پکڑے گئے اور ان کو سزا دی گئی لیکن مسولینی نے یہی کہا کہ یہ ان کا ذاتی فعل تھا۔ اس سے پارٹی پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

مسولینی کی خود نوشت سوانح عمری میں اس واقعہ کے متعلق یہ الفاظ ملتے ہیں۔

> ''......مجرموں کی گرفتاری بھی (اشتراکیوں کی تسلی کے لیے) کافی نہ ہوئی، لاش کی برآمد اور ڈاکٹروں کے حلفیہ بیان سے کہ موت کسی قتل کی وجہ سے نہیں واقع ہوئی تھی بلکہ ایک پرانے زخم کی وجہ سے ہوئی تھی، مطمئن نہیں ہوئے......''

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر موت کسی جرم کی وجہ سے واقع نہ ہوئی تھی، تو 'مجرم' کیوں گرفتار کیے گئے۔ کیا ان کو بے گناہ سزا ملی؟۔

اٹلی کا مالک

تشدد اور پروپگینڈا کے اثر سے کسی نہ کسی طرح مسولینی نے اس شورش کو رفع کیا، لیکن اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک وہ تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں نہ لے گا اس کی حکومت مستحکم نہ ہوگی، اس لیے اس نے پہلے تو جتنے لوگ اس کی مخالفت کر سکتے تھے ان کو بغاوت کے الزام میں ملک سے باہر نکال دیا۔ حکومت کے جتنے بڑے افسر فاشی نہیں تھے ان کو برخواست کر دیا گیا، کئی وزیروں کو بھی معطل کیا گیا، اور مسولینی وزیر اعظم ہونے کے علاوہ وزیر خارجہ، وزیر جنگ،

وزیر داخلہ اور فوج کے اعلیٰ ترین افسر کے عہدوں پر خود قابض ہو گیا، ان سب محکموں کا روز مرّہ کا کام اس کے نائب کرتے ہیں لیکن بغیر مسولینی کی مرضی کے کوئی انگلی نہیں ہلا سکتا، اس نے تمام اشتراکی اور مزدور جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا اور ہر اس تحریک کو جو فاشیت کو نقصان پہنچا سکتی تھی فوجی قوت کے ذریعہ دبا دیا، اب اس نے اطمینان کی سانس لی کیونکہ اب وہ اٹلی کا بلا شرکتِ غیر مالک تھا۔ اس کا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا، اور وہ ملک کو جس راستے پر چاہتا چلا سکتا تھا، جو فاشی نظام اس نے اٹلی میں قائم کیا اس کا ذکر اگلے باب میں کیا جائے گا۔

O

فاشی نظام حکومت

ڈکٹیٹر

اس نظام حکومت کا مرکز کسی ڈکٹیٹر کی ذات ہوتا ہے، 'ڈکٹیٹر' کا صحیح اردو ترجمہ مشکل ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر اردو اخباروں نے ڈکٹیٹر کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، اس سے مراد ہے، ایک مطلق العنان حاکم جو بادشاہ تو نہ کہلاتا ہو لیکن جس کے اختیارات پرانے زمانے کے بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوں۔ اس کو یہ اختیار ہو کہ جو قانون چاہے بنائے، جس کو چاہے ملک میں رکھے، جس کو چاہے نکال دے، جس قدر چاہے ٹیکس لگائے، جتنی فوج چاہے رکھے، دوسرے ملک کے خلاف اعلان جنگ کر دے، کیلوں کا کھانا ممنوع کر دے، یہودیوں سے شادی کی ممانعت کر دے، غرض یہ کہ اس کا ہر لفظ قانون کی حیثیت رکھتا ہو، موجودہ زمانہ کا پہلا ڈکٹیٹر مسولینی ہے، اب ہٹلر بھی اس کے نقش قدم پر چل کر 'ڈکٹیٹر' بن گیا ہے، اٹلی میں فاشیت کا مرکز 'ڈکٹیٹر' مسولینی کی ذات ہے۔ وہ نہ صرف فاشیوں کا حاکم اعلیٰ ہے بلکہ دیوتا ایک پیغمبر ہے، جس کے معمولی سی معمولی حکم کو بجالانا قوم اور ملک کا فرض ہے۔

پارٹی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ڈکٹیٹر اس قدر طاقت کس طرح حاصل کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا ذریعہ یہی ہے کہ ایک مضبوط پارٹی بنائی جائے جس کے ہاتھ میں تمام سیاسی اور فوجی قوت

ہو۔ مسولینی کی حکومت کا دارومدار اس کی فاشی پارٹی پر ہے، اسی پارٹی کی مدد سے وہ ڈکٹیٹر بنا ہے اور اب بھی وہ اس کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا، یہ خیال کرنا کہ اٹلی کا ہر شخص فاشی ہے غلط ہے، اس پارٹی کے ممبر چند لاکھ سے زیادہ نہ ہوں گے لیکن تمام سیاسی طاقت فاشیوں کے ہاتھ میں ہے، حکومت حاصل کرتے ہی مسولینی کا پہلا کام یہ تھا کہ اپنی پارٹی کی طاقت کو بڑھائے، اس نے تمام بڑے بڑے عہدے اپنے فاشی حمایتیوں کو دے دیے تا کہ وہ چھوٹے عہدوں پر بھی فاشیوں ہی کو رکھیں، چند سال میں تمام عملہ حکومت فاشیوں کے ہاتھ میں آ گیا، فاشی فوج نہایت زبردست ہے اور سرکاری فوج کے افسر بھی تمام فاشی ہی ہیں اس طرح ملک پر مسولینی اور فاشی پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔

مگر ملک کے قانون کے مطابق فاشی پارٹی کوئی آئینی حیثیت نہیں رکھتی تھی، چنانچہ 1929 میں مسولینی نے ایسا انتظام کیا کہ قانون کے لحاظ سے بھی تمام سیاسی طاقت فاشیوں کے ہاتھ میں آ گئی، مسولینی سے پہلے اٹلی میں بادشاہ برائے نام تھا اور اصل اختیارات پارلیمنٹ کو حاصل تھے، وزیر اعظم اور تمام دوسرے وزیر سب سے زیادہ اکثریت رکھنے والی پارٹی کے لیڈر ہوتے تھے۔ مسولینی بھی پہلے آئینی وزیر اعظم ہی منتخب ہوا تھا لیکن جلد ہی اس نے پارلیمنٹ سے تمام اختیارات لے کر اس کو فقط ایک مباحثہ کی انجمن بنا دیا تھا، اب اس نے پارلیمنٹ کے پرانے طریقۂ انتخاب کو بھی اپنے حکم سے منسوخ کر دیا، تمام حلقۂ انتخابات کو اختیارات دیا گیا کہ وہ ایک فہرست مندوبین فاشی پارٹی کی مجلس اعلیٰ کے سامنے پیش کریں، یہ مجلس جن مندوبین کو پسند کرے گی وہ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوں گے، اس طرح پارلیمنٹ کے تمام اختیارات بھی فاشی پارٹی کی جماعت اعلیٰ کو حاصل ہو گئے، اس مجلس کا مستقل صدر مسولینی ہے۔

مخالفت کی سزا

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ فاشیت کے مخالف شورش کیوں نہیں کرتے؟ بات یہ ہے کہ مسولینی نے شروع سے اس کا پورا انتظام کر رکھا ہے کہ کسی قسم کی مخالفت بھی ملک میں باقی نہ رہے، سوائے فاشی پارٹی کے اور کسی سیاسی پارٹی کو قائم کرنا جرم قرار دیا گیا ہے اور تمام اشتراکی اور مزدور جماعتیں خلاف قانون! فاشی پارٹی کے خلاف پروپیگنڈا، بغاوت ہے۔ جس کی سزا قید ہے یا قتل، یا (اگر بہت

مہربانی ہوئی) تو محض جلاوطنی! مزدوروں کو ہڑتال یا اسٹرائیک کرنے کا اختیار نہیں اگر ان کو ملکوں کے خلاف کوئی شکایت ہو تو وہ ایک عدالت کے سامنے پیش کریں۔ اس عدالت کے تمام اراکین مسولینی کے منتخب کردہ ہوتے ہیں، اسی طرح فاشیت کے خلاف تقریر کرنا جرم ہے، ہر اخبار پر سرکاری بندشیں ہیں۔ فاشی پارٹی کے خلاف مرضی کوئی چیز شائع کرنا سنگین جرم ہے۔ ملک بھر میں فوج فاشی، پولیس فاشی، عدالتوں کے حاکم فاشی، سرکاری اسپتالوں کے حاکم فاشی، مدارس فاشی، کالجوں اور یونیورسیٹوں کے مدرس اور پرفیسر فاشی، غرض زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جہاں فاشیوں کا اقتدار نہ ہو، پھر ملک میں جاسوسوں کا ایسا زبردست اور خوفناک انتظام ہے کہ چار آدمی کہیں مکان میں چھپ کر فاشیت کے خلاف بات نہیں کر سکتے، اس ڈر سے کہ شاید ان چاروں میں کوئی فاشی جاسوس شامل نہ ہو۔

لہٰذا کیا تعجب ہے کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اٹلی میں سیاسی مخالفت سرے سے مفقود ہے۔

فوج

ہر مطلق العنان حکمراں کو اپنی فوج کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مسولینی نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی فوج کی طرف توجہ کی۔ اس سے پہلے جو بدنظمی تھی اس کو دور کیا اور اس کے بجائے ایک سنگین نظام قائم کیا، تعداد کو بڑھایا۔ اور تازہ ترین ہتھیار اور سامان جنگ مہیا کیے، جنگ حبش شروع ہونے سے دس سال پہلے سے مسولینی ملک کی بیشتر آمدنی فوج پر صرف کر رہا ہے۔ اس کی خواہش ہمیشہ سے یہ تھی کہ اٹلی کو ایک اول درجہ کی فوجی قوت بنادے اور یہ واقعہ ہے کہ اس میں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، چونکہ یورپ کے موجودہ سیاسی نظام میں فوجی قوت کی عزت کی جاتی ہے اس لیے اٹلی کا شمار اب بڑی اور زبردست طاقتوں میں ہے۔

قوم پرستی کا جذبہ مشتعل کر کے مسولینی نے ہر اطالوی کے دل میں فوجی خدمت کی خواہش پیدا کر دی ہے، ہر شہری پر فوجی قواعد سیکھنا لازم ہے یہاں تک کہ اب اس نے بچوں کی فوجیں قائم کی ہیں۔ آٹھ آٹھ سالہ فاشیوں کو بندوق چلانا سکھایا جاتا ہے اور تمام ملک ایک فوجی کیمپ بن گیا ہے۔

فاشیت اور جنگ

جارحانہ قوم پرستی، قومی غرور اور فاشیت پر اعتقاد رکھنے کے علاوہ مسولینی نے اپنی قوم کو

جنگ کی تعلیم بھی دینی شروع کی، فاشیت امن کو دنیا کی ترقی میں ایک رکاوٹ خیال کرتی ہے۔ خود مسولینی نے ایک موقع پر کہا:

''فاشیت دنیا میں امن قائم کرنے کو ناممکن سمجھتی ہے اور ناکارآمد، اس لیے ہم عدم تشدد کے نظریہ کو مسترد کرتے ہیں، جو کمزوری اور بزدلی کا ثبوت ہے، صرف جنگ ہی انسانی خوبیوں اور قابلیتوں کو ظاہر کرتی ہے۔''

جب قوم پرستی حد سے گزر جاتی ہے تو اپنے ملک اور قوم کی پرستش کے علاوہ لوگ ہر دوسری قوم کو اپنا حریف اور دشمن خیال کرنے لگتے ہیں۔ مسولینی نے بھی نفرت کے جذبہ کو ترقی دے کر اسے اپنا آلہ کار بنایا ہے۔ ہر فاشی کا اعتقاد ہے کہ اس کی قوم دنیا کی بہترین قوم ہے اور دوسری تمام قومیں اٹلی کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں اور اس کے ملک کی حفاظت صرف فاشیت ہی کرسکتی ہے، ہر ممکن طریقہ سے اس اعتقاد کو مستحکم کیا جاتا ہے، جب تک یہ اعتقاد قائم ہے مسولینی کی حکومت بھی قائم ہے۔

سماجی نظام

مطلق العنان حکمرانوں اور 'ڈکٹیٹروں' کا قاعدہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں دخل دیتے ہیں، غیر محدود طاقت پاکر انسان یہی چاہتا ہے کہ ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہو، ہر چھوٹی چھوٹی بات میں لوگ اس کی پیروی کریں، اس کی مثال ہم کو مسولینی کی حکومت میں بھی ملتی ہے، اس نے سیاسی زندگی پر قبضہ پاکر قناعت نہیں کی بلکہ شہریوں کی سماجی، خاندانی اور ذاتی زندگی میں بھی دخل دینا شروع کردیا اور وہ ان قدیم خیال کے لوگوں کا ہم خیال ہے جو عورتوں کو مکان کی چار دیواری تک محدود رکھنا چاہتے ہیں، اپنی بیوی کو اس نے کبھی سیاسی زندگی میں دخل نہیں دینے دیا، اسی طرح وہ چاہتا ہے کہ تمام اطالوی عورتیں اپنے اپنے گھروں میں رہیں اور اس نے یہ قانون نافذ کردیا ہے کہ عورتوں کو مختلف پیشوں سے نکال دیا جائے، ہندوستان کے قدامت پسند مسولینی کی اس حرکت کو بہت سراہتے ہیں کہ اس نے عورت کو قومی زندگی سے نکال کر پھر مکان میں بند کردیا ہے اور اکثر پردہ اور عورتوں کو گھروں میں قید رکھنے کے جواز میں مسولینی کی مثال پیش کی جاتی ہے لیکن مسولینی نے یہ احکام نہ کسی مذہبی جذبہ سے متاثر ہوکر نافذ کیے ہیں اور نہ

اخلاقی وجوہات سے، مذہب کا وہ کبھی پابند نہ تھا، چنانچہ ایک زمانے میں عیسائیت کا مذاق اڑایا کرتا تھا، اب سیاسی وجوہ سے عیسائیت کا علم بردار بن گیا ہے لیکن کوئی شخص اس کو مذہبی نہیں کہہ سکتا اور نہ مسولینی کی زندگی اتنی پاک اور پارسا گزر رہی ہے کہ وہ دوسروں کو اخلاقیات میں سبق دینے کے قابل سمجھا جائے، عورتوں کو ملازمتوں اور پیشوں سے نکال دینے کا سبب صرف یہ تھا کہ مردوں کی بے کاری میں کمی ہو اور بظاہر وہ یہ کہہ سکے کہ اب اس کے ملک میں بیکاروں کی تعداد گھٹ رہی ہے، ہمارے ان قدامت پسند دوستوں کو جو مسولینی کو ایک اخلاقی معلم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، یہ سن کر دلچسپی ہوگی کہ مسولینی کی ذاتی زندگی پاکبازی کا کوئی اعلیٰ نمونہ نہیں رہی۔

ایک عورت کی شہادت

مگر ہندوستان میں حکومت پرستی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ہم ہر اس شخص کو جو کسی طرح کسی ملک کا بادشاہ یا ڈکٹیٹر یا کسی ریاست کا نواب یا راجا بن بیٹھا ہو، دنیا بھر کی خوبیوں کا مالک سمجھتے ہیں۔ ہر کامیاب ڈاکو فاتح کہلاتا ہے اور ہر ظالم، خود پرست، خودغرض حاکم، قابل پرستش۔ بہرحال مسولینی یا اس کے قصیدہ خواں واقعات کو نہیں جھٹلا سکتے، اٹلی میں مسولینی کی تعریف کے علاوہ کوئی دوسرا لفظ نہیں لکھا جاسکتا لیکن ایک کتاب جو ایک عورت نے بلجیم میں شائع کی ہے چند اہم واقعات کا اظہار کرتی ہے۔

یہ عورت مادام رائیگر ایک زمانے میں مسولینی کی رفیق اور اس کی پارٹی کی ممبر تھی لیکن جب مسولینی نے ظلم اور جبر کا دور شروع کیا تو اس نے مخالفت کی، اس مخالفت کو بھلا مسولینی کب برداشت کرسکتا تھا لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس عورت پر مقدمہ چلایا جائے اور وہ عوام کے سامنے بیان دے سکے، لہٰذا مسولینی نے کوشش کی کہ چند ڈاکٹر مادام رائیگر کو دیوانہ قرار دے دیں تاکہ اسے ہمیشہ کے لیے پاگل خانہ میں بند کردیا جائے لیکن خوش قسمتی سے ایک ڈاکٹر نے اس جرم میں شرکت سے انکار کردیا اور مادام رائیگر اپنی جان بچا کر اٹلی سے بھاگ گئی، اپنی کتاب میں مادام رائیگر ایک عورت کا ذکر کرتی ہے جو جرمن نسل سے تھی اور جو کئی سال تک مسولینی کی داشتہ رہی تھی، مادام رائیگر کا بیان ہے کہ جب مسولینی اس عورت سے اکتا گیا تو اس نے اس کو ایک پاگل خانہ میں ڈلوادیا۔

بچے پیدا کرو

چند سال سے مسولینی کو ایک نیا خبط سوجھا ہے، اس نے تمام ملک میں تقریریں کیں اور عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ان کا قومی فرض ہے کہ وہ بچے زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا کریں۔ اس وقت سے ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے کہ اٹلی کی آبادی بڑھے اور پچھلے کئی سال سے آبادی بڑھ رہی ہے، عورتوں کو اقتصادی اور سیاسی زندگی سے نکالنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ گھروں پر رہ کر وہ فقط اطالوی قوم کی تعداد بڑھائیں

آخر اس 'بچے پیدا کرو' کے حکم سے کیا فائدہ؟ اول تو مسولینی یہ چاہتا ہے کہ قوم کی تعداد میں اتنا اضافہ ہو جائے کہ اگر کسی جنگ میں ہزاروں لاکھوں اطالویوں کا صفایا بھی ہو جائے تو ملک کی آبادی میں غیر معمولی کمی نہ واقع ہو، دوسرے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی سے اس کو نوآبادیات اور مقبوضات کے لیے مطالبہ کرنے کا بہانہ ہاتھ آتا ہے: ''ہمارے ملک کی آبادی بڑھ رہی ہے، لہٰذا ہمیں نوآبادیات کی ضرورت ہے۔'' یہ ہے جنگ جش کی شان نزول، اور بقول مسولینی کے اس کا 'اخلاقی جواز'۔

اٹلی کی اقتصادی حالت

اٹلی ایک غریب ملک ہے، زیادہ تر آبادی کا گذارہ ہمیشہ سے زراعت، پھلوں اور شرابوں کی پیداوار اور دستی صنعتوں پر رہا ہے۔ اس سرمایہ داری اور زمینداری کی بدولت تھوڑی سی تعداد کے پاس بہت سی دولت آگئی ہے اور لاکھوں مزدور اور کسان فاقہ مرتے ہیں۔ جنگ عظیم میں شرکت سے اقتصادی حالت اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ کچھ کارخانے قائم ہونے سے تھوڑی بہت صنعتی ترقی ہوئی تھی لیکن مزدوروں اور مالکوں کے جھگڑوں سے سرمایہ دار پریشان تھے اور مزدور مفلوک الحال، مسولینی نے شروع میں مزدوروں کسانوں، سرمایہ داروں اور زمینداروں سب کو امید دلائی تھی کہ اس کے راج میں سب کی مالی حالت بہتر ہو جائے گی لیکن یہ ناممکن تھا، بعد میں یہ ہوا کہ فاشیت کی حمایت سرمایہ داروں نے کی اور مسولینی نے ان کی مدد میں مزدوروں کو دبا دیا۔

زراعت کی پیداوار میں ضرور کچھ اضافہ ہوا کارخانے بھی کھلے اور بظاہر ملک میں صنعتی ترقی کا آغاز ہوا، کچھ عورتوں کے نکل جانے سے اور کچھ ہتھیاروں کے کارخانے کھلنے سے بیکاری میں کمی ہوئی لیکن عوام کی اقتصادی حالت فاشی نظام میں بد سے بدتر ہوتی گئی لیکن مسولینی نے اپنی قوم کی قوم پرستی کا ایسا نشہ پلایا ہے کہ اطالوی روٹی کے بجائے فوجی وردی پہن لینا اور پریڈ کر لینا کافی سمجھ لیتے ہیں۔ اگر وہ آج بھوکے مر رہے ہیں تو کیا ہے، ان کے آباء واجداد کی حکومت دنیا پر تھی اور اگر ان کے ڈکٹیٹر مسولینی کی کوششیں بارآور ہوئیں تو وہ پھر دنیا کی سب سے بڑی فاتح قوم ہوں گی۔ یہ ہے وہ جادو جس کے زور سے مسولینی کا فاشی نظام آج تک قائم ہے۔ اس جادو کا اثر 1933 میں کم ہو رہا تھا۔ بیکاری، افلاس اور اقتصادی ابتری نے فاشیت کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ خطرہ تھا کہ عوام فاشیت اور مسولینی کی حکومت کا خاتمہ نہ کر دیں، اپنے جادو کے اثر کو قائم رکھنے کے لیے مسولینی نے کیا ترکیب اختیار کی، یہ اگلے باب میں بیان کیا جائے گا۔

○

جنگ جبش

جس وقت اس کتاب کے پہلے صفحات لکھے گئے تھے سولینی کی فوجوں نے جبش پر دھاوا شروع کیا تھا، جبشی فوجیں بہادری سے اپنے ملک کی حفاظت کر رہی تھیں اور امید کی جاتی تھی کہ اگر انجمن اقوام نے اپنے معاہدوں کے مطابق جبش کی امداد کی اور اٹلی پر اقتصادی بندشیں لگا دیں تو جلد ہی فاشیوں کے منصوبے خاک میں مل جائیں گے، اور ان کو شکست نصیب ہوگی، آج جب کہ یہ آخری صفحے لکھے جا رہے ہیں عدیس ابابا پر اطالوی قبضہ ہوئے کئی ہفتے گذر چکے ہیں اور سولینی بار بار یہ اعلان کر رہا ہے کہ اب جبش پر پوری طرح سے اقتدار قائم ہو گیا ہے اور وہ اس معاملے میں انجمن اقوام کا فیصلہ ہرگز قبول نہ کرے گا، یہ سب چند ماہ میں کیوں اور کیسے ہو گیا؟ جبش پر سولینی نے خوامخواہ کیوں فوج کشی کی اور باجود انجمن اقوام کے اس کو کامیابی کیوں ہوئی؟

کیوں؟

جنگ جبش کیوں ہوئی؟ سولینی نے اس جنگ کو شروع کرنے کے لیے مختلف اوقات پر مختلف بہانے پیش کیے ہیں، سب سے بڑی دلیل جو اس نے پیش کی وہ یہ تھی کہ اٹلی کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ اس لیے اطالویوں کو بھی مقبوضات اور نوآبادیات کی ضرورت ہے تاکہ ملک کی آمدنی بڑھے اور آبادی کا کچھ حصہ ملک کے باہر جا کر آباد ہو۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے، کہ اٹلی کی آبادی، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے سولینی ہی کی کوشش سے بڑھی۔ اطالوی

حکومت ہر طرح سے آبادی بڑھانے کی ترغیب دیتی رہی یہاں تک کہ حکومت کی طرف سے زیادہ بچے پیدا کرنے پر ماؤں کو انعام دیئے جاتے ہیں۔اس لیے آبادی کی زیادتی کی تمام تر ذمہ داری مسولینی پر عائد ہوتی ہے، اگر اس کے ملک کی مالی حالت زیادہ آبادی کا بار نہیں سنبھال سکتی تو افزائش نسل کے لیے یہ سب دوڑ دھوپ کیوں؟اصل واقعہ یہ ہے کہ ملک کی آبادی بڑھانے کی کوشش مسولینی نے فقط اس لیے کی کہ نوآبادیات حاصل کرنے کے لیے ایک بہانہ ہاتھ آئے۔

اس کے علاوہ یہ بھی یادرکھنا چاہیے کہ حبش پر قبضہ کرنے سے قبل بھی اٹلی کے پاس افریقہ میں نوآبادیات تھیں۔لیبیا،اریٹریا اوراطالوی سومالی لینڈ پر اٹلی کا مدت سے قبضہ ہے،اگر مسولینی کو اپنی آبادی کے نکاس کی صورت پیدا کرنی ہوتی یا نوآبادیات کے معدنی اور اقتصادی ذرائع استعمال کرنے ہوتے تو وہ حبش پر قبضہ کرنے سے پہلے اریٹریا، لیبیا اور سومالی لینڈ سے فائدہ اٹھاتا لیکن اعدادوشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ افریقہ کے تمام اطالوی مقبوضات میں جن کا کل رقبہ تین لاکھ مربع میل سے زیادہ ہے صرف پچاس ہزار اطالوی باشندے ہیں۔جن میں سے زیادہ تر سرکاری افسر اور سپاہی ہیں، فقط چوراسی (84) اطالوی ہیں جو اس علاقہ میں کاشتکاری کرتے ہیں ان ملکوں کی اقتصادی ترقی یا قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی کبھی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی، یہ ٹھیک ہے کہ یہ علاقہ نہایت بنجر اور بیکار ہے لیکن یہی حال حبش کا ہے، آب وہوا یورپین اقوام کے لیے ناقابل برداشت ہے۔نہ زرخیز زمین زراعت کے لیے ہے اور نہ کوئی قیمتی کانیں ہیں جن سے اٹلی فائدہ اٹھاسکے گا۔کئی کروڑ روپیہ اور کئی ہزار اطالوی اور حبشی جانیں قربان کرنے کے بعد ایک ریگستانی اور خشک پہاڑی ملک مسولینی کو اپنا جھنڈا لہرانے کے لیے مل گیا ہے اور بس۔

مسولینی نے اصل میں کبھی حبش پر حملہ کرنے کے اقتصادی پہلو پر غور ہی نہیں کیا، اگر اس کو اپنی قوم کی مالی حالت بہتر کرنے کا خیال ہوتا تو جو روپیہ اس نے حبشیوں کا خون بہانے میں صرف کیا ہے وہ اپنے ملک کی صنعتی اور زراعتی ترقی کے لیے صرف کرتا لیکن مسولینی کو تو فقط غرض تھی اپنے ذاتی اقتدار کو مستحکم کرنے کی 1934 میں اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کی مطلق العنان حکومت خطرہ میں ہے ملک کی مالی حالت خراب ہورہی تھی، افلاس اور بیکاری میں اضافہ ہورہا تھا۔ہزاروں آدمی فاقہ سے مررہے تھے لاکھوں بیکار تھے۔ایسی حالت میں قدرتی امر ہے کہ بے چینی بڑھنے کا خدشہ تھا، بھوک اور بیکاری

انقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے مسولینی کو ڈر ہوا کہ کہیں عوام اس کے خلاف بغاوت نہ کر بیٹھیں، اس صورت حال کی روک تھام ضروری تھی اور اس کی فقط ایک ہی ترکیب بھی، عوام کی توجہ ملک کی اقتصادی حالت سے ہٹا کر ایک بیرونی جنگ کی طرف مبذول کرادی جائے۔ یہی اصل وجہ حبش پر قبضہ کرنے کی ہے۔

عدووہ ADOWA

جب مسولینی کو یقین ہو گیا کہ اس کے ذاتی اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے ملک کو ایک جنگ کی بھٹی میں جھونکنا ضروری تھا تو اس کو حملہ کرنے کے لیے سب سے مناسب ملک حبش ہی نظر آیا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں اول تو حبش ایک کمزور ملک تھا، دوسرے حبش پر اطالوی دو طرف سے حملہ کر سکتے تھے، ایک طرف شمال میں اریٹریا سے، اور دوسری طرف مشرق میں اطالوی سومالی لینڈ سے۔ اس کے علاوہ حبش کے خلاف قومی جذبات کو بھڑکانا بھی آسان تھا۔ انیسویں صدی کے اخیر میں جب اطالوی افریقہ میں اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے، انھوں نے حبش پر بھی قبضہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ 1896 میں جنرل باراتیری کی قیادت میں اطالوی فوج عدیس ابابا پر حملہ کرنے کے خیال سے جارہی تھی کہ حبشی فوج نے چاروں طرف سے گھیر لیا گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اس وقت ہوائی جہاز اور زہریلی گیسوں کی ایجاد نہیں ہوئی تھی اس لیے حبشی بہادروں نے جو اپنے ملک کی حفاظت کر رہے تھے اطالوی فوج کو شکست فاش دی۔ ہزاروں اطالوی مارے گئے اور ہزاروں قید کر لیے گئے۔ جن کو شاہ حبش نے حفاظت سے واپس بھیج دیا۔ اس شکست کے بعد اٹلی کو صلح نامہ عدیس ابابا پر دستخط کرنے پڑے جس کی رو سے انھوں نے ہمیشہ کے لیے حبش کی آزادی تسلیم کر لی، عدووہ کی شکست سے اطالوی اقتدار کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ اب مسولینی کو موقع ملا کہ اپنی قوم کو اس شکست کی یاد دلا کر بھڑکائے۔

25ء کا خفیہ معاہدہ

اصل میں حبش پر حملہ کا خیال مسولینی کے دماغ میں مدت سے تھا، اگر چہ پچھلے سال تک اس ارادہ نے عملی صورت نہ اختیار کی تھی۔ دسمبر 25ء میں مسولینی نے برطانیہ سے اس معاملے میں گفت وشنید کی تھی، برطانیہ کو حبش میں تو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ لیکن جھیل تانا میں اس لیے

دلچسپی تھی (اور اب بھی ہے) کہ اس جھیل میں سے دریائے نیل نکلتا ہے جو برطانوی سوڈان اور مصر کو سیراب کرتا ہے، اگر اس جھیل پر برطانیہ کے کسی مخالف کا قبضہ ہو جائے تو وہ نیل کا دہانہ بند کر کے سوڈان اور مصر کو تباہ کر سکتا ہے، برطانیہ نے جھیل تانا پر اپنا بند بنانے اور سوڈان اور اس جھیل کے درمیان موٹر کی سڑک بنانے کی مراعات کے بدلے اٹلی سے وعدہ کر لیا کہ وہ حبش میں اٹلی کے مخصوص حقوق اور اثر کو تسلیم کرے گا اور اریٹریا اور سومالی لینڈ کے درمیان اطالوی ریلوے لائن کی تعمیر کی موافقت کرے گا۔ گویا دونوں ملکوں نے حبش کی تقسیم کا آپس میں فیصلہ کر لیا تھا۔

لیکن اس خفیہ معاہدہ سے دو سال پہلے حبش انجمن اقوام کا رکن تسلیم کر لیا گیا تھا۔ حبش کی درخواست کی موافقت خود اٹلی نے کی تھی، کیونکہ مسولینی کا خیال تھا کہ حبش مجلس اقوام میں اس کی موافقت کیا کرے گا۔ اس وقت راس تفاری شاہ حبش نے اپنی رکنیت سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ اور اٹلی کے خفیہ معاہدہ کو انجمن اقوام کے سامنے پیش کر دیا، راز فاش ہو گیا اور ان کو اپنے ارادے فی الحال ملتوی کرنے پڑے۔

1933 میں اٹلی کے شہر سٹریسا میں یورپین اقوام کے نمائندے جمع ہوئے۔ تاکہ تخفیف اسلحہ کی کوشش کریں۔ حسب معمول وعدے وعید ہوئے لیکن کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سٹریسا کانفرنس اس لیے اہم ہے کہ اس موقع پر مسولینی نے یورپین سیاست دانوں سے اپنے جنگی ارادوں کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ وہ حبش پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، اس وقت کسی نے اس ارادہ کی مخالفت نہ کی اور مسولینی نے خیال کیا کہ اگر وہ حملہ کرے گا تو یورپین اقوام سوائے زبانی احتجاج کے کچھ نہ کریں گی۔

یہ تھے وہ حالات جن کے ماتحت مسولینی نے 1934 میں اندرونی بے چینی رفع کرنے کے لیے حبش پر حملہ کا قطعی فیصلہ کر لیا اور عملی تیاریاں شروع کر دیں فوجی طاقت پہلے ہی کافی مضبوط تھی۔ اب اسلحہ وغیرہ بھی کثیر مقدار میں جمع کر لیے گئے۔ حبش کے خلاف اخباروں اور تقریروں کے ذریعہ ملک بھر میں جھوٹ اور بہتان کا طوفان برپا کر دیا گیا، عدووہ کی شکست کی یاد دلائی گئی اور ایک زبردست اور عالمگیر اطالوی سلطنت کا سبز باغ دکھایا گیا۔

والوال

جب ایک زبردست قوم کسی کمزور ملک پر حملہ کا فیصلہ کر لیتی ہے تو وہ کسی معقول بہانہ کا انتظار

نہیں کرتی۔ اگر کوئی اور بہانہ نہیں ملتا تو خود بہانہ مہیا کر لیتی ہے، والوال حبش کا ایک سرحدی مقام سومالی لینڈ کی جانب ہے، جہاں سرحد کی حفاظت کے لیے حبشی سپاہیوں کا ایک مختصر دستہ رہتا تھا۔ 5 دسمبر 1934 کو اطالوی فوج نے اس دستہ پر دفعتاً حملہ کر دیا، 107 حبشی سپاہی ہلاک اور 45 زخمی ہوئے۔ شاہ حبش کو اس واقعہ کی اطلاع 9 دسمبر کو ہوئی، اس نے اسی دن انجمن اقوام کو یادداشت روانہ کی جس میں اطالویوں کی اس حرکت کی شکایت اور غیر جانب دارانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا، مگر مسولینی نے اس عرصہ میں چالاکی سے پہلے ہی جنیوا شکایت لکھ بھیجی کہ حبشی سپاہیوں نے اطالوی فوجیوں پر حملہ کر دیا ہے۔ اس پر حبش کے نمایندوں نے کہا کہ وہ تیار ہیں کہ انجمن اقوام ایک کمیٹی مقرر کرے اور وہ والوال جا کر اس معاملہ کی تحقیقات کرے۔ لیکن جس کے دل میں چور ہو وہ اس پر کیسے راضی ہوسکتا تھا۔ مسولینی نے صاف انکار کر دیا۔ مہینوں انجمن پر چھوڑ دیا لیکن اٹلی نے یہ منظور نہ کیا اور اس عرصہ میں لاکھوں اطالوی سپاہی اسلحہ اور سامان حرب اریٹریا اور سومالی لینڈ پہنچا دیے گئے۔ ساتھ ہی مسولینی نے اعلان کر دیا کہ اطالوی عدووہ کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے حبش پر حملہ کر رہے ہیں۔ 13 اکتوبر 1935 کو اطالوی افواج نے دونوں طرف سے دھاوا شروع کر دیا۔ ایک کمزور اور نہتی قوم اور ایک طاقتور اور تمام آلات حرب سے مسلح قوم میں جنگ شروع ہوگئی۔

اقوام کی خودغرضی

حبش نے مدافعت شروع کی اور فوراً انجمن اقوام کو صورت حال سے مطلع کیا۔ 6 نومبر 1935 کو انجمن اقوام کی کاؤنسل نے اٹلی کو بلاوجہ جنگ شروع کرنے کا مجرم قرار دیا اور قرار پایا کہ اٹلی کے خلاف اقتصادی کارروائی کی جائے لیکن اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تیل پر بندش لگانے کی تھی، موجودہ ہوائی جہازوں اور کلدار اسلحہ کے لیے تیل کی از حد ضرورت ہوتی ہے اور اگر نومبر میں تمام قومیں اٹلی کو تیل بھیجنا بند کر دیتیں تو جنگ کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی لیکن خودغرض اقوام اس معاملے میں ٹالتی رہیں۔ آج ایک کمیٹی مقرر کی گئی کل دوسری۔ کبھی ماہروں کو تحقیقات کے لیے مقرر کیا گیا، کبھی ان ملکوں کی رائے کا انتظار کیا گیا جو انجمن اقوام کے ممبر نہیں ہیں۔ غرض یہ اہم معاملہ ٹلتا رہا اور وہ تمام قومیں جن کے نمایندوں نے جنیوا میں اٹلی کے فعل کو ناجائز قرار دیا تھا۔ وہ اسلحہ اور آلات حرب اور تیل برابر اٹلی کو بھیجتی رہیں۔

زہریلی گیس

اس عرصہ میں اطالوی افواج نے حبش میں وہ ظلم ڈھایا کہ کوئی انتہا نہ رہی، نہ صرف فوجوں پر بم باری کی گئی بلکہ شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کو بھی بم گرا کر فنا کر دیا گیا، ہزاروں مرد عورتیں اور بچے مارے گئے، گرجاؤں اور اسپتالوں کو بھی نہ چھوڑا گیا، اس کے بعد انھوں نے زہریلی گیس کا استعمال شروع کیا، یہ موذی گیس جس قدر مہلک اور خوفناک ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ پورے شہروں اور قصبوں کی آبادی کو چند گھنٹوں میں فنا کر سکتی ہے، اس سے کوئی مفر نہیں۔ جو موت سے بچ بھی جاتے ہیں وہ عمر بھر کے لیے اندھے یا اپاہج ہو جاتے ہیں۔ آج حبش کے شہروں کے کھنڈرات میں ہزاروں لاشیں اس گیس کی بدولت پڑی ہیں۔ عورتیں اور بچے اندھے اور اپاہج ہو گئے ہیں یہ اس تہذیب کا نمونہ ہے، جو مسولینی کا دعویٰ ہے کہ اس کی اطالوی قوم حبش میں پھیلائے گی۔

حبش فوجوں نے نومبر سے اپریل تک باوجود اپنی کم مائیگی کے اطالوی مشین گنوں، توپوں اور ہوائی جہازوں کا مقابلہ کیا، کسی جگہ پر اطالوی فوجوں کو شکست بھی دی اور ہزاروں اپنے ملک کی آزادی کے لیے قربان ہو گئے لیکن زہریلی گیس کا مقابلہ کرنا آسان کام نہ تھا اور اپریل کے اخیر میں حبشی فوجوں کو شکست پر شکست ہوئی۔

زہریلی گیس کے علاوہ اطالویوں نے رشوت سے بھی خوب کام لیا، غدار اور قوم فروش ہر ملک میں روپیہ کے عوض خریدے جاسکتے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے حبشی افواج میں پھوٹ ڈالی گئی اور بغاوت کرائی گئی۔ جب شاہ حبش نے دیکھا کہ اب ملک کی حفاظت کی کوئی صورت نہیں ہے، زہریلی گیس سے ہزاروں حبشی روز مارے جا رہے ہیں، ہر طرف ہوائی جہاز بم گرا کر تباہی پھیلا رہے ہیں اور پھر بھی انجمن اقوام کے اراکین حبش کی موافقت میں کوئی قدم نہیں اٹھاتے تو اس نے قتل و خون بند کرنے کے لیے یہی بہتر سمجھا کہ ملک چھوڑ کر چلا جائے۔ 3 مئی کو اس نے اپنی فوجیں واپس بلا لیں اور 5 مئی کو ملک چھوڑ دیا۔ 7 مئی کو عدیس ابابا پر اطالوی قبضہ ہو جاتا ہے۔ روم میں خوشیاں منائی جاتی ہیں اور مسولینی فتح کی خوشی میں دھواں دھار تقریر کرتا ہے۔

اب کیا؟

حبش ختم ہو گیا ہے۔ شہنشاہ حبش انگلستان اور جنیوا فریاد لے کر گئے ہیں، لیکن جن خود غرض قوموں نے مصیبت کے وقت امداد نہ کی ان سے اب کیا امید کی جا سکتی ہے؟ اس وقت تک یورپین اقوام نے اطالوی قبضہ کو تسلیم نہیں کیا۔ انجمن اقوام نے بھی اپنے فیصلہ کو ملتوی کر دیا ہے لیکن کوئی شک نہیں کہ دو چار مہینے میں یہ سب قومیں زبانی احتجاج کے بعد اطالوی قبضہ کو تسلیم کر لیں گی۔ ایک آزاد قوم غلام ہو جائے گی۔ انجمن اقوام کے دعوے اور وعدے خاک میں مل جائیں گے۔ مسولینی خوش ہے کہ اس نے ایک بڑی فتح حاصل کر لی ہے چند سال تک وہ اطالویوں کو اس فتح کی یاد دلا کر خوش رہ سکتا ہے لیکن پھر کیا؟

اس جنگ میں مسولینی نے حبش ہی کو نہیں اٹلی کو بھی تباہ کیا ہے۔ اس وقت فتح کی خوشی میں اطالوی قوم کو اندازہ نہیں ہے کہ اس بنجر اور بیکار ملک پر قبضہ کے عوض ان کو کتنی زبردست قربانی کرنی پڑی ہے۔ تمام ملک کی دولت اس جنگ کے اخراجات میں ختم ہو گئی ہے۔ جو قوم پہلے ہی مفلس تھی اس کے افلاس کا اب کیا حال ہو گا۔ جب کہ کئی ارب روپیہ حبش میں پھونک دیا گیا ہے؟ کوئی قوم ہمیشہ فتح کے خیال میں مست نہیں رہتی۔ وہ دن دور نہیں کہ اطالوی اپنی اقتصادی حالت کو محسوس کریں گے اور سمجھیں گے کہ مسولینی نے اپنے ذاتی اقتدار کے لیے ان کو کس حد تک تباہ و برباد کیا ہے۔

اگر اب نہیں تو چند سال کے بعد مسولینی کو اپنی قوم کے سامنے جواب دہی کرنی پڑے گی اور اب جو بے چینی اور غصہ اس کی تباہ کن فاشیت کے خلاف پھیلے گا وہ فقط ایک جنگ سے دور ہو سکتا ہے۔ یہ جنگ اٹلی ہی میں لڑی جائے گی۔ یہ مقابلہ مسولینی کی فاشیت اور عوام کے درمیان ہو گا۔ عوام کو کچھ عرصہ کے لیے قوم پرستی کا نشہ پلا کر دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن جب بھوک بیکاری اور مفلسی کے تلخ واقعات اس نشہ کو دور کریں گے اس وقت مسولینی کی جوشیلی تقریریں کام نہ دیں گی۔ اس وقت مسولینی کسی دوسرے حبش پر حملہ کر کے قوم کی توجہ اقتصادی حالات سے نہ ہٹا سکے گا۔ سوال فقط یہ ہے کہ وہ دن کتنا دور ہے۔

○

مختصر سوانح حیات

شہید ملت، رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم

ناشران
حالی پبلشنگ ہاؤس ''کتاب گھر''۔ دہلی

پیشکش

اپنے والد کے نام
کہ انہوں نے نہ صرف مجھے مولانا محمد علی جوہر کی ذات سے بلکہ
ان کی صفات سے بھی روشناس کرایا

بمبئی 22 / مارچ 1936ء

احمد عباس

دیباچہ

دنیا کی جتنی زندہ قومیں ہیں ان میں قومی رہنماؤں اور ملک کے خادموں کی یاد مختلف طریقوں سے تازہ رکھی جاتی ہے، ان کے مجسمے نصب کیے جاتے ہیں، ان کے ناموں سے منسوب ادارے قائم کیے جاتے ہیں، اُن کی پیدائش یا موت کے دنوں کو سالانہ منایا جاتا ہے، اُن کی سوانح عمریاں شائع کی جاتی ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آخرالذکر طریقہ ہی سب سے بہتر ہے۔ کیونکہ اپنے قومی بزرگوں کی زندگی کے حالات، ان کے کارناموں اور قربانیوں سے عوام کو روشناس کرانا نہ صرف اُن کی یاد کو تازہ کرنا ہے بلکہ اپنے ملک کی ایک بڑی خدمت ہے۔ دنیا کے ہر بڑے انسان کی زندگی اپنے اندر ہمارے لیے زبردست سبق رکھتی ہے اور اس کا تذکرہ ضروری ہے تاکہ وہ ہمارے نوجوانوں کے لیے ایک مشعل کا کام دے اور اُن کو بھی اپنے ملک اور قوم کی خدمت کی ترغیب ہو۔

تعلیم کی کمی کی وجہ سے ہندوستان کی ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ ہمارے عوام اپنے ملک کی بڑی ہستیوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ مگر اس سے زیادہ افسوسناک واقعہ یہ ہے کہ اکثر تعلیم یافتہ ہندوستانی بھی اپنے قومی رہنماؤں کے حالات زندگی سے بے خبر ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اب تک عوام کے لیے ایسی کتابیں موجود نہیں ہیں جو آسان زبان اور عام فہم انداز

میں ہمارے سیاسی لیڈروں، مصلحوں، عالموں، شاعروں، ادیبوں اور دوسرے زبردست ہندوستانیوں کی سوانح حیات پیش کریں۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے چھوٹی چھوٹی کتابوں کا ایک سلسلہ ''مادر ہند کے سپوت'' کے نام سے شروع کیا ہے اس سلسلہ میں بلا کسی تفریق کے ہندوستان کی تمام بڑی ہستیوں کے حالات زندگی شائع کیے جائیں گے۔

مولانا محمد علی کی یہ مختصر سوانح حیات اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس کے بعد سرسید حال ہی میں شائع کی گئی ہے۔ ہندوستانیوں اور ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تشکیل میں مولانا مرحوم نے جو نمایاں حصہ لیا وہ محتاج بیان نہیں، اُن کا عزم، اُن کا استقلال، اُن کی وطن پرستی اور قوم پروری۔ یہ سب وہ صفات ہیں جو ہمارے نوجوانوں کے لیے ہدایت اور نمونہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ اُن کی تمام زندگی قوم کی خدمت میں گزری، ہندوستان سے اُن کی محبت کبھی کم نہ ہوئی اور اخیر دم تک وہ اُس کی آزادی کے لیے کوشاں رہے۔ کاش ہمارے اہل ملک اُن کی زندگی کو ایک روشن مثال کی طرح پیش نظر رکھیں۔

اسی سلسلہ میں جلد شائع ہونے والی کتابیں ڈاکٹر انصاری اور مہاتما گاندھی پر ہوں گی اور ہمیں امید ہے کہ یہ قومی سلسلہ ملک میں مقبول ہوگا۔

اس کے علاوہ مشاہیر عالم سیریز کا انتظام بھی ہو رہا ہے جس میں سب سے پہلی کتاب، مسولینی کی زندگی کے حالات ہے جو حبشہ اور اٹلی کی جنگ کی روشنی میں لکھی گئی ہے شائع ہوگئی ہے۔ اس کے بعد دنیا کے زبردست ڈکٹیٹر غازی اتاترک مصطفیٰ کمال مرحوم کی سوانح زیر طبع ہے۔

ناشر: حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی

○

"میں آج جس مقصد کے لیے یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو واپس جاؤں تو آزادی کا منشور میرے ہاتھ میں ہو۔ میں غلام ملک میں لوٹ کر نہیں جاؤں گا۔ مجھے ایک غیر ملک میں جسے آزادی کا شرف حاصل ہے غربت کی موت منظور ہے۔ اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر یہاں میرے لیے ایک قبر کی جگہ دینی پڑے گا۔"

......گول میز کانفرنس میں مولانا محمد علی کی تقریر

محمد علی

پیدائش اور ابتدائی تعلیم

محمد علی 1878 کے آخر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالعلی خان صاحب بجنور کے رئیس تھے اور نواب یوسف علی خان فرمانروائے رام پور کے دربار میں ایک ممتاز منصب پر فائز تھے۔ اکثر مشاہیر عالم کی طرح محمد علی کے سر سے بچپن ہی میں باپ کا سایہ اُٹھ گیا اور ان کی اور ان کے دو بڑے بھائیوں شوکت علی مرحوم اور ذوالفقار علی کی تعلیم اور تربیت کی پوری ذمہ داری 'بی اماں' مرحومہ کو اٹھانی پڑی۔ کلام مجید اور اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم کے بعد تینوں بھائی بریلی کے ہائی اسکول میں داخل کر دیے گئے اور یہاں اس کم سنی میں محمد علی کی جودت، ذہانت اور حاضر جوابی کا سکہ بیٹھ گیا۔ وہ کچھ ایسے محنتی نہیں تھے اور درسی کتابوں کی طرف کم توجہ کرتے تھے۔ مگر سب استاد ان سے خوش رہتے تھے اور طالب علم انھیں عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیڈری کی صلاحیت محمد علی میں ابھی سے موجود تھی اور اسکول میں وہ اپنے ہم عمروں کے مانے ہوئے لیڈر تھے۔

علی گڑھ

یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڑھ کالج نیا قائم ہوا تھا۔ سرسید کی مخالفت کا زور کم ہوتا جاتا تھا اور اکثر شرفا اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے علی گڑھ بھیج رہے تھے۔ مغربی تعلیم نے ابھی تک مسلمانوں

میں رواج نہیں پایا تھا اور اسی لیے سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ عہدوں پر بہت کم مسلمان نظر آتے تھے۔ سرسید کی کوششوں سے چند گھرانوں میں تعلیم کا چرچا کچھ کچھ ہو چلا تھا کیونکہ بغیر کالج کی ڈگری کے سرکاری ملازمتوں کا دروازہ ان کے لیے بند تھا۔ علی گڑھ میں زیادہ طالب علم کھاتے پیتے گھرانوں کے تھے۔ معاش کی طرف سے اطمینان تھا کہ بی۔اے کرتے ہی ڈپٹی کلکٹری یا اسی قسم کا کوئی اور عہدہ مل ہی جائے گا۔ بورڈنگ ہاؤس کی زندگی بے فکری کی تھی، کھیلوں میں علی گڑھ والوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، انگریزی تحریر اور تقریر میں انھیں کمال حاصل تھا۔ مغربی تہذیب و تمدن سے پہلے پہل واسطہ پڑا تھا، اس لیے طلبا اچھا اور برا دونوں قسم کا اثر بہت تیزی سے قبول کر رہے تھے۔

یہ فضا تھی جس میں شوکت علی اور محمد علی داخل ہوئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں علی گڑھ پر چھا گئے۔ کرکٹ سے دونوں بھائیوں کو شوق تھا لیکن شوکت علی نے اس کھیل میں زیادہ ترقی کی۔ یہاں تک کہ کپتان مقرر ہو گئے اور ادھر محمد علی نے یونین میں تیغ زباں کے جوہر دکھائے اور فصاحت و بلاغت میں جھنڈے گاڑ دیے۔ سال کا بڑا حصہ محمد علی کھیل کود اور سیر تفریح میں گزارتے تھے لیکن ان کا حافظہ اور ذہن اس بلا کا تھا کہ امتحان سے دو مہینے پہلے محنت شروع کر کے ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہو جاتے تھے۔ انگریزی میں محمد علی کی قابلیت قابلِ رشک تھی۔ تقریر اور تحریر دونوں پر قادر تھے۔

یونین میں ان کی انگریزی تقریریں سن کر اکثر انگریز پروفیسر دنگ رہ جاتے تھے، مگر اس آزادیٔ رائے کے باعث جو ہمیشہ محمد علی کا طرۂ امتیاز رہی ان سے اکثر استادوں سے اختلاف ہوا۔ وہ ابتدا ہی سے جوشیلی اور دلیرانہ تقریریں کرنے میں مشہور تھے۔

غرض 1896 میں بیس سال کی عمر میں محمد علی نے بی۔اے کا امتحان دیا۔ انھیں اپنے پاس ہونے کی امید ضرور تھی اور جو لوگ محمد علی سے واقف تھے وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں گے مگر جب نتیجہ نکلا تو سب یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئے کہ علی گڑھ کا یہ کھلنڈرا جس نے وقت کا بیشتر حصہ یونین کے پلیٹ فارم اور کرکٹ کے میدان پر گزارا تھا، تمام صوبہ کے کامیاب طلبا میں اول رہا۔

آکسفورڈ

علی گڑھ کی زندگی ختم کرنے کے بعد محمد علی عازمِ انگلستان ہوئے۔ دوستوں نے افسوس

کے ساتھ اپنے رفیق اور سردار کو رخصت کیا اور محمد علی 'لیلائے سول سروس' کی تمنا میں ولایت روانہ ہو گئے۔ وہ لنکن کالج آکسفورڈ میں داخل ہوئے اور سول سروس کے امتحان کی تیاری کرنے لگے لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ اس طوقِ غلامی کو اپنی گردن میں لٹکائیں۔ اصل میں محمد علی کی علم دوست اور آدب آشنا طبیعت کو اس سے کوئی مناسبت ہی نہیں تھی۔ قیام آکسفورڈ کے زمانے میں انھوں نے صرف موافقِ طبع مضامین کا مطالعہ کیا اور دوسرے مضامین کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔ نتیجہ ظاہر ہے جو ہوا ہوگا۔ شوکت علی نے جس وقت ہندوستان میں چھوٹے بھائی کی ناکامی کی خبر پڑھی تو انھیں سخت رنج ہوا اور محمد علی ولایت سے واپس بلا لیے گئے مگر بی اماں کا حوصلہ دیکھیے کہ انھوں نے اس ناکامی کا کوئی اثر اپنے اوپر ظاہر نہ ہونے دیا بلکہ جب محمد علی آئے تو اُن کی دل دہی اور ہمت افزائی کی۔ اسی سال محمد علی کی شادی ہوگئی اور وہ دوبارہ ولایت بھیجے گئے کہ انگریزی ادب میں بی۔ اے کریں۔ چونکہ ادب سے طبیعت کو شروع ہی سے لگاؤ تھا اس لیے اُنھوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ آنرز کی ڈگری حاصل کی اور ہندوستان واپس چلے آئے۔ قیام ولایت میں محمد علی نے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا کر لیا۔ انھوں نے بہترین صحبتوں میں شرکت کی۔ سیر و تفریح، کھیل کود کا لطف اٹھایا مگر باوجود ہزار ہا ترغیبوں کے نہایت پاکبازانہ زندگی بسر کی۔

رام پور اور بڑودا

ولایت سے واپسی پر نواب صاحب رام پور نے انھیں رام پور ہائی اسکول کا پرنسپل اور ریاست کا افسر تعلیمات بنا دیا لیکن ریاست کی فضا میں جو سازشوں سے پُر تھی محمد علی کا نبھنا مشکل تھا۔ چنانچہ عرصہ کے بعد انھوں نے نوکری سے استعفےٰ دے دیا اور شوکت صاحب کے پاس چلے گئے مگر انھیں زیادہ عرصہ تک بیکار نہ رہنا پڑا۔ قیامِ ولایت کے دوران (میں) ان کے تعلقات بڑودہ کے ولی عہد کنور فتح سنگھ سے قائم ہو چکے تھے اور کنور صاحب کی کوشش سے محمد علی ریاست بڑودہ میں بلا لیے گئے۔ چار سال تک انھوں نے محکمۂ افیون میں ایک اعلیٰ افسر کے فرائض انجام دیے اور اتنی مستعدی اور قابلیت سے کام کیا کہ ملازمت کے پانچویں سال ریاست کے ضلع نوساری کے کمشنر مقرر کیے گئے۔ اس عہدے پر بھی محمد علی نے نہایت خوبی اور دیانت داری سے

کام کیا۔ انھوں نے اپنے محکمے میں بہت سی اصلاحیں، خصوصاً غریبوں پر جو ظلم ہوتا تھا اُس کی روک تھام کی اور چند ہی سال میں رعایا کے دلوں میں گھر کر لیا۔ کچھ عرصے کنور فتح سنگھ کے پرسنل اسسٹنٹ بھی رہے مگر کنور صاحب تھوڑے ہی دنوں بعد شراب کی بھینٹ چڑھ گئے۔

نوکری سے استعفیٰ

محمد علی کے ادبی ذوق نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ محکمۂ افیون کی افسری یا ضلع کی حکومت کے کام کے باوجود انھوں نے اپنا تحریری مشغلہ جاری رکھا۔ بڑودہ کی ملازمت سے پہلے الہ آباد سے 'گپ' کے نام سے انگریزی میں ایک مزاحیہ پرچہ اپنے آکسفورڈ کے رفیق کنور جگدیش پرشاد (حال وزیر تعلیم حکومت ہند) کی شرکت میں نکالا تھا۔ مگر دو پرچوں کے بعد کوئی نمبر نہ نکل سکا۔ ملازمت کے دوران (میں) بھی مضمون نگاری جاری تھا۔ ٹائمز آف انڈیا میں اکثر لکھتے رہتے تھے۔ اسی عرصہ میں ان کے چند مضامین مسلمانوں کے حقوق کی حمایت میں شائع ہوئے۔ ریاست کی کونسل سے جواب طلب ہوا۔ محمد علی نے ایسا دندان شکن جواب دیا کہ کونسل سے سوائے اس کے کچھ بن نہ پڑی کہ ایک خفیہ سرکاری سرکلر کے ذریعہ ریاست کے ملازموں کو اخباروں میں سیاسی مضامین لکھنے کی ممانعت کر دے۔

محمد علی کا دل ملازمت سے کھٹا ہو گیا۔ انھوں نے پہلے رخصت لی اور پھر باوجود مہاراجا کے اصرار کے استعفیٰ دے کر الگ ہو گئے۔

کامریڈ

اب محمد علی کو موقع ملا کہ اپنی صحافتی قابلیت کے جوہر دکھائیں کلکتہ سے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار' کامریڈ'(یعنی رفیق) نکالا جو سال بھر ہی میں اتنا مقبول ہوا کہ اس کے خریداروں میں ملک کے تمام سربرآوردہ لوگ یہاں تک کہ لیڈی ہارڈنگ اور لارڈ ہارڈنگ بھی شامل تھے۔ محمد علی انگریزی اہل زبان کی طرح لکھتے تھے اور ان کا اسلوب بیان اتنا شستہ اور پاکیزہ ہوتا تھا کہ بڑے بڑے انگریز ان کی قابلیت کے قائل تھے۔ سلاست بیان کے ساتھ قدرت نے بذلہ سنجی اور شگفتگی کا جوہر بھی عطا کیا تھا۔ اس لیے ہر مضمون کو اتنا دلچسپ بنا دیتے تھے کہ ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد بے ختم کیے نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ یہ پرچہ ایک مدت تک بڑے اہتمام اور شان سے نکلتا رہا اور تمام

ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک پھیل گیا۔ آخر پریس ایکٹ کے ماتحت بند ہو گیا۔

ملک کی سیاست میں شریک ہونے کے بعد اکثر محمد علی کو اتنا موقع نہیں ملتا تھا کہ اخبار کی جتنی خدمت کرنی چاہیے کر سکیں۔ مگر ان کو نائب بھی راجا غلام حسین جیسا ملا تھا جس کی انگریزی کی قابلیت اور صحافت کے خود محمد علی قائل تھے۔ یہ اس نوجوان ہی کا کام تھا کہ محمد علی کی غیر موجودگی میں 'کامریڈ' اسی شان سے نکلتا تھا اور کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ محمد علی کا قلم ہے یا راجا غلام حسین کا۔

'کامریڈ' کے مستقل مضمون نگاروں میں سید ولایت علی 'بمبوق' بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ مگر محمد علی کو بھی اپنے فرائض کا اس قدر خیال رہتا تھا کہ کسی جلسہ وغیرہ کی شرکت کے لیے باہر جانا ہوا اور اخبار کی اشاعت کی تاریخ سر پر آ گئی تو جہاں ہوئے رات کی نیند حرام کر کے مضمون لکھ کر بھیجا۔ بلگام کانگریس کے (1924) موقع پر تو کئی کالم کا ایک پورا ایڈیٹوریل مضمون تار سے بھیجا۔

مسلم لیگ

مسلم لیگ 1906 میں بمقام ڈھاکہ قائم ہوئی۔ محمد علی نے اس وقت تک سیاسی دنیا میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا تھا لیکن باوجود سیاسی ناتجربہ کاری اور نوعمری کے لیگ کے نظام کی ترتیب اور قواعد وضوابط کی درستی کا کام اسی نوجوان اخبار نویس نے کیا۔ لیگ اولاً اعتدال پسندوں کی ایک جماعت تھی جس کا کام بس اتنا تھا کہ سال میں ایک دفعہ جلسہ کر کے چند ریزولیوشن پاس کر دے جن میں گورنمنٹ اور برادرانِ وطن دونوں سے شکایت ہو کہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا اور نشستوں اور ملازمتوں کے لیے سرکار دولت مدار سے مؤدبانہ درخواست کی جائے۔ یہ محمد علی ہی کا کام تھا کہ انھوں نے لیگ کے مردہ قالب میں جان ڈالی اور آخر کار اعلان کرادیا کہ لیگ ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرے گی۔ اگر چہ اب مسلم لیگ 'وفاشعاروں' کی مدد سے پھر اپنے اصلی رنگ پر آ گئی ہے، مگر محمد علی کی سرداری میں اس نے ملک کی نہایت شان دار اور قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔

طبّی وفد

1913 میں جب جنگ بلقان شروع ہوئی ہے، تو ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک سخت ہیجان پیدا ہوا۔ گورنمنٹ کے مسلمان ملازمین اور موافقین نے بھی کھلم کھلا ترکوں کے ساتھ

ہمدردی کا اظہار شروع کر دیا۔ ملک میں ادھر سے اُدھر تک ایک آگ لگی ہوئی تھی، یہاں تک کہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے بھی ایک پر جوش ولولہ انگیز نظم لکھی جو لکھنؤ کے ایک جلسہ میں پڑھی گئی۔ اس زمانے میں ڈاکٹر انصاری (مرحوم) نے یہ تجویز کی کہ ہندوستان سے ایک طبی وفد ترک زخمیوں کی مدد کے لیے جائے لیکن دقت سرمائے کی تھی جس کی فراہمی کا بیڑا محمد علی نے اٹھایا۔ اسی عرصے میں سب سے بڑے شہروں میں ترکوں کی مدد کے لیے 'ہلال احمر' کے نام سے انجمنیں قائم ہوگئی تھیں۔ ان انجمنوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں سے چندہ جمع کر کے ترکوں کو مالی امداد بھجوائیں۔ محمد علی نے طبی وفد کی تجویز دہلی کی انجمن ہلال احمر کے سامنے پیش کی اور مسئلہ کی اہمیت کو سمجھایا۔ انجمن کے اراکین نے اس وقت پندرہ ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کر لیا مگر کچھ عرصہ کے بعد رائے بدل دی اور وفد کو مالی امداد دینے سے انکار کر دیا۔ محمد علی نے یہ سن کر بھی ہمت نہ ہاری بلکہ ڈاکٹر انصاری سے کہا کہ روپیہ کی طرف سے مطمئن ہو کر باقی انتظام مکمل کریں۔ اسی رات کو جا کر کامریڈ کے لیے ایک ایسا زبردست مضمون لکھا کہ اس کی اشاعت کے دوسرے ہی دن سے روپیہ کی بارش شروع ہوگئی۔ اس واقعے سے محمد علی کے قلم کی قوت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چند ہی دن میں ضرورت سے زیادہ روپیہ فراہم ہو گیا اور وفد ترکی بھیجا گیا۔ جہاں اراکین وفد نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

کامریڈ سے ضمانت

ترکوں کی مالی مصیبتوں کو دیکھ کر محمد علی نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا اور یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے ترکی حکومت کے تمسکات خرید کر لاکھوں روپے سے ترکوں کی مدد کی۔ اسی زمانے میں ترکوں نے اہل مقدونیہ کے نام ایک درد انگیز اپیل شائع کی تھی جس کا عنوان تھا 'مقدونیہ والو آؤ اور ہماری مدد کرو' محمد علی نے کمال جرأت سے کام لے کر پوری اپیل قسط وار کامریڈ میں شائع کی۔ اس کا شائع ہونا ہی تھا کہ گورنمنٹ نے کامریڈ کے تمام پرچے جس میں یہ اپیل شائع ہوئی تھی ضبط کر لی اور دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی۔ پریس ایکٹ اس زمانے میں بھی گورنمنٹ کا ایک طاقتور ہتھیار تھا۔ اُس کو آزاد خیال اخباروں کے خلاف اکثر استعمال کیا جاتا تھا مگر 'کامریڈ' کا اب بھی وہی دم خم تھا۔ 1914 میں جب ٹرنر ماریسن کمپنی نے حجاز

کی جہاز رانی کے اجارے کی تجدید کی درخواست حکومتِ ہند کے سامنے پیش کی اور محمد علی کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے فوراً کامریڈ کا ایک ضمیمہ شائع کیا جس میں اس درخواست کے خلاف سختی سے صدائے احتجاج بلند کی۔ اس ضمیمہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ لارڈ ہارڈنگ نے درخواست کو مسترد کر دیا۔ اگرچہ چند سال بعد جب محمد علی نظر بندی میں تھے پھر اسی کمپنی کو ٹھیکہ دے دیا گیا۔

ہمدرد

اب تک محمد علی کی صحافت انگریزی تک محدود تھی مگر جب دارالسلطنت کی تبدیلی کے ساتھ 'کامریڈ' بھی کلکتہ سے دہلی آیا تو حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کے مشورے سے محمد علی نے ایک اردو روزنامہ 'ہمدرد' کے نام سے جاری کیا۔ 'ہمدرد' کے ادارے میں انھوں نے چن چن کر وہ ادیب اور مضمون نگار رکھے جن میں سے ہر ایک ملک کے اہل قلم میں ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ میر محفوظ علی، سید ہاشمی فرید آبادی، قاضی عبدالغفار صاحب، مولوی عبدالحلیم شرر اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی جیسے معاون ملے تو ہمدرد بھی آسمان صحافت پر اس شان سے چمکا کہ اور سب اردو اخبار اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ خبروں کی دیدہ زیب ترتیب، اعلیٰ مضامین، افتتاحیہ، علمی مقالے اور تفریحی مضامین یہ سب ہمدرد کی وہ خصوصیات تھیں جو آج تک کم از کم کسی اردو اخبار کو تو نصیب نہیں ہوئیں بلکہ بعض خوبیاں ایسی بھی تھیں جو بہت کم انگریزی اخباروں میں نظر آئیں گی۔ عام طور سے ہندوستان سے جو انگریزی یا اردو روزنامے نکلتے ہیں ان میں ایڈیٹر اپنے آپ کو ادارت کے دوسرے ارکان سے بالاتر سمجھتا ہے اور اپنا فرض فقط حکم چلانا جانتا ہے۔ برخلاف اس کے محمد علی کا ادارہ ایک خاندان کی طرح تھا اور ایک وقت معین پر تمام لوگ محمد علی کے کمرے میں اکٹھے ہو کر اگلے دن کے نمبر کے متعلق مشورہ کرتے تھے۔ محمد علی ہر ایک کو اس کے کام کے متعلق ہدایت دیتے تھے اور دوسروں کو بھی موقع دیتے تھے کہ اخبار کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔ یہی وجہ تھی کہ 'ہمدرد' اور 'کامریڈ' کے دفتر کے لوگ اپنا کام محنت دلچسپی اور خلوص کے ساتھ کرتے تھے۔ اور یہی ان اخباروں کی کامیابی کا راز تھا۔

غرض 'ہمدرد' نہایت شان کے ساتھ نکلتا رہا۔ یہاں تک کہ محمد علی کی نظر بندی کے بعد اس کی اشاعت ملتوی کرنی پڑی۔ بیجاپور جیل سے رہائی کے بعد 'کامریڈ' اور 'ہمدرد' پھر نکلے۔ مگر

افسوس ہے کہ اس بار وہ پہلی سی شان نہ تھی۔ ایک تو راجا غلام حسین کی ناگہانی موت نے 'کامریڈ' کے کام کو بہت نقصان پہنچایا۔ دوسرے اب محمد علی سیاست کے اکھاڑے میں اُتر چکے تھے۔ ان کا تمام تر وقت قومی اور ملکی کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ کانگریس کی رہنمائی، خلافت کی ناخدائی اور دوسری سیاسی مصروفیتیں اخباروں کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیتی تھیں۔

ایک مشہور مضمون

کامریڈ کی ضمانت کی ضبطی جو اس کی بے وقت موت کا سبب تھی ایک ایسے مضمون کے سلسلہ میں ہوئی جو ہندوستان کی تاریخ صحافت میں یادگار رہے گا۔ جنگ عظیم کے آغاز پر لندن کے مشہور اخبار 'ٹائمز' نے ایک ایڈیٹوریل مضمون میں ترکوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ برطانیہ کا ساتھ دیں۔ اس مضمون کو دیکھ کر محمد علی نے وہ معرکہ کا جواب لکھا کہ لندن ٹائمز کے مضمون کے پرخچے اڑا دیے۔ مضمون کا عنوان تھا 'ترکوں کا فیصلہ' CHOICE OF THE TURKS اور یہ کامریڈ کے بائیس کالم پر پھیلا ہوا تھا۔ باوجود اپنی بیگم صاحبہ کی علالت کے محمد علی نے چالیس گھنٹے کی مسلسل نشست میں یہ مضمون تیار کیا۔ جب خود لکھتے لکھتے تھک جاتے تو اسسٹنٹ ایڈیٹر کو لکھواتے جاتے تھے۔ مضمون کیا تھا ممالک اسلامی میں برطانوی استبداد کی ریشہ دوانیوں کی مکمل داستان تھی۔ حکومت بھلا کب گوارا کر سکتی تھی کہ ایسے مضمون کا لکھنے والا چین سے بیٹھے۔ چند ہی روز میں 'ہمدرد' اور 'کامریڈ' دونوں کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔ محمد علی نے اپیل کیا اور ہائی کورٹ میں خود بحث اور جرح کی۔ تمام عدالت وکیلوں، بیرسٹروں اور تماشائیوں سے بھری ہوئی تھی اور ہر شخص ان کی ذہانت اور قانونی قابلیت کو دیکھ کر حیرت کرتا تھا مگر نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ ضمانت کی ضبطی کا حکم بحال رہا' کامریڈ' بند ہو گیا مگر اس دن سے محمد علی اور سب کاموں کو چھوڑ کر سیاست ہی کے ہو رہے۔ حکومت کو معلوم ہو گیا کہ ایک زبردست حریف میدان میں اترا ہے اور قوم نے جان لیا کہ اس کا مجاہد اعظم آن پہنچا ہے۔

نظر بندی

ضمانت کی ضبطی کے بعد محمد علی کی صحت بہت گر گئی اور حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر انصاری دونوں نے مشورہ دیا کہ ان کو دماغی محنت سے آرام لینا چاہیے۔ تبدیلی آب و ہوا کی خواہش اور

وطن کی یاد انھیں رام پور لے گئی لیکن وہاں پہنچنا ہی تھا کہ صوبہ کے انسپکٹر جنرل پولیس نواب رام پور کے پاس آئے اور محمد علی کو حکم ملا کہ بغیر نواب صاحب کی اجازت کے وہ ریاست کی حدود نہیں چھوڑ سکتے مگر ایک ہی دن کی نظر بندی کے بعد رہائی مل گئی۔ اس عرصے میں مولانا شوکت علی بھی رام پور آ گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کا ارادہ دہلی ہوتے ہوئے اجمیر شریف کے سالانہ عرس میں جانے کا ہوا۔ دہلی آئے دو ہی دن ہوئے تھے کہ ضلع مجسٹریٹ کا حکم ملا کہ دونوں بھائی اپنے آپ کو نظر بند سمجھیں۔ نظر بندی کی خبر سن کر محمد علی بے حد خوش ہوئے اور انھوں نے بجائے افسوس کرنے کے خدا کا شکر ادا کیا۔ حسب الحکم مہرولی جا کر رہے۔ یہاں ان کو ہر طرح کی آسانیاں حاصل تھیں۔ ہمدرد کے لیے مضامین لکھ سکتے تھے، دوست احباب دہلی سے ملاقات کے لیے آ سکتے تھے۔ مگر حکومت کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔ اس لیے ان کو لینس ڈون بھیج دیا گیا اور ان کے قلم کی آزادی بھی سلب کر لی گئی۔

جُرم

محمد علی نے اپنے کبھی کے دوست سر جیمس مسٹن گورنر صوبۂ متحدہ کو خط لکھا کہ کم سے کم مجھے میرے جرم سے تو مطلع کیا جائے مگر اس کا یہ جواب ملا کہ اس مسئلہ پر گورنر صاحب زیادہ گفت وشنید نہیں کر سکتے۔ گورنمنٹ سے جب مجالس مقننہ میں سوالات کیے گئے تو اس نے قانونی دفعات کے حوالے دے کر ٹال دیا۔ مگر 1916 میں جب دہلی کی سالانہ سرکاری رپورٹ شائع ہوئی تو اس میں علی برادران کے متعلق فرمایا گیا کہ 'محمد علی شوکت علی کو نظر بند کرنا ضروری معلوم ہوا اس لیے کہ گورنمنٹ کے خلاف ان کی سخت و تلخ کارروائیاں مسلمانوں پر برا اثر ڈال رہی تھیں' امپیریل کاؤنسل میں مسٹر جناح اور مظہر الحق صاحب نے جب گورنمنٹ سے اس نظر بندی کی وجوہ مانگیں تو جواب ملا 'چونکہ ان دونوں بھائیوں نے کھلم کھلا گورنمنٹ کے خلاف تحریک میں حصہ لیا اس لیے ان کو نظر بند کرنا ضروری سمجھا گیا اور اگر وہ آئندہ ایسی حرکتوں سے باز رہنے کا وعدہ کریں تو گورنمنٹ ان کی رہائی کے مسئلہ پر غور کر سکتی ہے۔' مگر ایسا کرنا معافی مانگنے کے برابر تھا اور محمد علی جیسے غیور کے لیے معافی موت سے بدتر تھی۔

اصل وجہ ظاہر تھی۔ اس وقت تک گورنمنٹ نے سمجھ رکھا تھا کہ کم سے کم مسلمان تو ہمیشہ

وفادارِ سرکار رہیں گے مگران دونوں بھائیوں کی سرگرمیوں اور عام سیاسی بیداری کے اثرات سے مسلمانوں میں بھی وطن پرستی اور خودداری کا مادہ پیدا ہو چلا تھا۔ ترکوں کے خلاف تمام یورپ کی قوتوں کے اجتماع سے، جس میں برطانیہ بھی شامل تھا، مسلمان حکومت سے اور بھی بددل ہو گئے تھے۔ اس پر محمد علی کے مضامین خصوصاً 'ترکوں کے فیصلے' نے گورنمنٹ کی طرف سے بہت کچھ بدظنی پھیلا دی تھی۔ حکومت کا خیال تھا کہ اس سارے فساد کی جڑ یہی دونوں بھائی ہیں۔ اسی لیے یہ دونوں غیر میعادی مدت کے لیے نظر بند کر دیئے گئے چونکہ ان سے کوئی خاص جرم سرزد نہیں ہوا تھا اس لیے باقاعدہ مقدمہ چلا کر قید کرنا مشکل تھا۔

غدّاری سے انکار

اس سلسلے میں محمد علی کے مشیر قانونی مسٹر گھاٹے کا ایک خط قابل ذکر ہے جو انھوں نے علی برادران کی نظر بندی کے متعلق مسز بیسنٹ کو لکھا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی انگریز ہندوستانیوں سے اپنا کام نکالنے کے لیے ہر قسم کا لالچ دیتے تھے۔ مسٹر گھاٹے لکھتے ہیں کہ ان کو معلوم ہوا ہے کہ جب محمد علی اور سید وزیر حسن انگلستان میں تھے تو ان سے کہا گیا تھا کہ وہ 'انڈو برٹش ایسوسی ایشن' میں شامل ہوں اور حکومت ہند کے اینگلو انڈین ارکان کے ساتھ لارڈ ہارڈنگ اور سر علی امام کے مقابلے میں کارروائی کریں۔ یہ تحریک جن صاحب نے کی تھی وہ سر چارلس کلیولینڈ ڈائرکٹر جنرل سی۔ آئی۔ ڈی تھے۔ محمد علی نے اس سازش میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ سر چارلس ان سے سخت ناراض تھے۔ محکمۂ خفیہ پولیس یا سی۔ آئی۔ ڈی کا جو زبردست ہاتھ ہندوستان کی حکومت میں ہے وہ سب کو معلوم ہے اور اس کے افسر اعلیٰ کو ناخوش کرنے کے بعد محمد علی زیادہ عرصہ آزاد نہ رہ سکتے تھے۔

چھندواڑہ

چھندواڑہ وسط ہند میں ایک چھوٹا سا مقام ہے۔ اپنے وطن سے دور اس جگہ نظر بند ہو کر بھی محمد علی بے کار نہ بیٹھے دونوں بھائیوں نے قید کی فرصت کو غنیمت جان کر تاریخ عالم اور مذہب اسلام کا گہرا مطالعہ کیا۔ محمد علی نے کئی معرکے کی قومی نظمیں تصنیف کیں۔ اس عرصے میں ان کی

رہائی کی کوششیں برابر جاری رہیں لیکن گورنمنٹ جنگ کی وجہ سے اور بھی خائف تھی۔ اس لیے کسی طرح ان کو آزادی دینے پر تیار نہ تھی۔

مسلم لیگ کی صدارت

ستمبر 1917 میں ہندوستان کے مسلمانوں نے محمد علی کو اپنی واحد سیاسی انجمن مسلم لیگ کا صدر منتخب کر کے ان کی غیر معمولی سیاسی خدمات اور قربانیوں کا اعتراف کیا لیکن گورنمنٹ نے انھیں جلسے میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ان کے بجائے ان کی والدہ بی اماں مرحومہ نے شرکت کی اور کرسی صدارت پر محمد علی کی تصویر رکھ دی گئی۔

اسی سال کانگریس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کے مشہور قوم پرست بال گنگادھر تلک نے ایک ریزولیوشن پاس کرایا جس میں گورنمنٹ سے علی برادران کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا مگر اور کوششوں کی طرح یہ کوشش بھی لا حاصل رہی لیکن اس واقعے سے معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں محمد علی کی کتنی قدر و منزلت قوم پرستوں کی جماعت میں کی جاتی تھی۔

اسی عرصے میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو اصلاحات کے لیے ابتدائی تحقیقات کرنے ہندوستان آئے۔ ملک کے تمام سیاسی لیڈروں نے ان سے ملاقاتیں کیں۔ مولانا محمد علی نے بھی خواہش ظاہر کی کہ ان سے ملاقات کریں اور مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کی ترجمانی کریں۔ مسٹر مانٹیگو نے بھی محمد علی کا ذکر سنا تھا اور ملاقات کرنا چاہتے تھے مگر حکومت ہند نے اس ملاقات کو اپنے 'اقتدار' کے لیے خطرناک سمجھا اور اجازت نہیں دی۔

پابند آزادی سے انکار

اسی سال حکومت نے عبدالمجید صاحب سپرنٹنڈنٹ خفیہ پولیس کو چھندواڑہ بھیجا کہ علی برادران کے سامنے ایک عہد نامہ پیش کریں جس پر دستخط کرنے سے ان کو رہائی مل سکتی تھی۔ عہد نامہ کی رو سے ان کو یہ وعدہ کرنا تھا کہ جنگ کے دوران (میں) وہ کوئی ایسی حرکت نہ کریں گے جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ گورنمنٹ کے دشمنوں کو کسی قسم کی اخلاقی، عملی یا مالی مدد مل سکے اور نہ کوئی ایسی بات کریں گے جس سے ملک کے امن میں خلل ہو۔ علی برادران نے اس معاہدے پر دستخط

کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ہم کسی قسم کی پابندی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس کے بعد ستمبر 1918 میں ایک سرکاری کمیشن مقرر کیا گیا تا کہ وہ علی برادران کی نظر بندی پر غور کر کے رپورٹ پیش کرے۔ کمیشن کے ممبران چھندواڑہ آئے، دونوں بھائیوں کے بیانات لیے اور پھر اپنی سفارشات پیش کیں۔ انھوں نے نظر بندی کو بالکل جائز قرار دیا لیکن سفارش کی کہ اب سزا کافی مل چکی ہے اس لیے دونوں بھائی رہا کر دیے جائیں لیکن حکومت نے اس کو منظور نہیں کیا۔ مسز بیسنٹ اسی سال نومبر میں رہا ہوئیں اور انھوں نے فوراً علی برادران کی رہائی کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ وائسرائے سے ملیں، مفصل گفتگو کی اور دلائل پیش کیے مگر وہاں تو وہی ایک جواب تھا کہ 'ہرگز نہیں'۔

زنداں کی تبدیلی

چھندواڑہ کئی سال سے ان لوگوں کا وطن ہو گیا تھا مگر اب اس کو بھی چھوڑنا پڑا۔ ان دونوں بھائیوں کی کوشش سے وہاں ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی جہاں یہ نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایک روز بعد نمازِ جمعہ محمد علی نے ایک پُر جوش اور زبردست تقریر کر ڈالی جس میں مسلمانوں کو ان کا شان دار ماضی یاد دلایا اور بیداری کا پیغام دیا۔ حکومت کو یہ ناگوار گزرا اور ان کو بیتول جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جو تھوڑی بہت آزادی چھندواڑہ میں حاصل تھی وہ بھی سلب کر لی گئی۔

رہائی اور امرتسر کانگریس

علی برادران جیل ہی میں تھے کہ مہاتما گاندھی نے رولٹ بل کے خلاف تحریک سول نافرمانی شروع کی۔ تمام ملک میں جوشِ آزادی کی آگ بھڑک اٹھی اور حکومت نے جتنا زیادہ تشدد کیا اُسی قدر تحریک زور پکڑتی گئی۔ اسی عرصے میں جلیاں والہ باغ کا قتلِ عام ہوا اور خطرہ تھا کہ تحریک کہیں مسلح بغاوت کی صورت نہ اختیار کر لے۔ اس لیے گورنمنٹ نے اس غصہ کی لہر کو روکنے کے لیے ایک بڑی چال چلی۔ یعنی سب سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ درشتی اور نرمی کو سمو کر ملک کے مزاج کو نئی اصلاحات کے سنہری جال کے لیے تیار کرے۔ اس طرح دسمبر 1925 میں پانچ سال کی نظر بندی اور قید کے بعد یہ دونوں بھائی آزاد ہوئے۔

کانگریس، خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس امرتسر میں ہو رہے تھے اس لیے ان دونوں نے فوراً اُدھر کا رُخ کیا۔ وہاں ان کا وہ شان دار استقبال ہوا کہ ہمیشہ یاد رہے گا۔ راستہ بھر اسٹیشن پر ہزار ہا ہندو مسلمانوں کا ہجوم ہوتا تھا۔ امرتسر کے اسٹیشن پر جب ان کی گاڑی پہنچی تو ایک عظیم الشان مجمع نے قومی نعروں سے ان کا استقبال کیا، جلوس مرتب ہو کر کانگریس پنڈال کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں مہاتما گاندھی اور دوسرے مقتدر رہنمایانِ قوم ان کے خیر مقدم کے لیے جمع تھے۔ جس وقت یہ دونوں کانگریس پنڈال میں داخل ہوئے تمام حاضرین جوش میں کھڑے ہو گئے اور پندرہ منٹ تک مسلسل تالیاں بجتی رہیں۔ پنڈت مالویہ نے ان دونوں بھائیوں کا تعارف کرایا اور ان کو کانگریس کا ڈیلی گیٹ بنا دیا۔

یادگار تقریر

کانگریس میں ایک پر جوش تقریر کرتے ہوئے محمد علی نے جو الفاظ کہے وہ بھی یادگار رہیں گے۔

''میں کہتا ہوں کہ اس آزادی کے لیے مسٹر تلک کو پھر جیل جانا چاہیے، مجھے دوبارہ عمر بھر کے لیے نظر بند ہو جانا چاہیے، مسز بیسنٹ کو پھانسی پر چڑھ جانا چاہیے مگر اس قسم کے مظالم کا خاتمہ ہو جانا چاہیے جیسے پنجاب میں ہوئے۔''

مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس میں بھی دونوں بھائیوں کا شاندار خیر مقدم ہوا اور اس کے بعد جب وہ دہلی آئے تو وہاں جس شان کا استقبال ہوا شاید شاہان دہلی کو بھی کبھی نصیب نہ ہوا ہو گا۔

پیش کش سے انکار

مُدّت تک نظر بند رہنے اور کئی بار اخباروں کی ضمانتیں ضبط ہونے کی وجہ سے اس زمانے میں علی برادران کی مالی حالت قابلِ اطمینان نہیں تھی۔ ان کے چند دوستوں اور قدر دانوں نے ہندو اور مسلمان قائدین کی ایک کمیٹی بنائی تا کہ معقول رقم جمع کر کے ان کی خدمات میں پیش کی جائے لیکن محمد علی نے اس رقم کو اپنے ذاتی خرچ کے لیے لینے سے انکار کر دیا اور روپیہ کو قومی اور ملکی کاموں کے لیے دے دیا۔

وفد خلافت

خلافت کانفرنس میں یہ طے پایا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے چند نمائندے ممالک غیر مثلاً امریکہ، انگلستان، ایران، عراق، ترکی وغیرہ جا کر وہاں مسلمانانِ عالم کے نقطۂ نظر کو پیش کریں اور اس غم وغصہ کا اظہار کریں جو تمام مسلمان برطانوی حکومت کی وعدہ خلافی پر محسوس کر رہے تھے۔

جنگِ عظیم کے دوران (میں) مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے ہندوستانی مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ برطانوی مدبّر مسلمانوں کے مذہبی جذبات واحساسات کا پورا پورا خیال رکھیں گے اور مقامات مقدسہ پر خلیفۃ المسلمین ہی کا قبضہ رہے گا۔

یہی وعدہ تھا جس کی بنا پر مسلمان انگریزوں کے ساتھ اپنے مسلمان بھائیوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن اِدھر جنگ ختم ہوئی اُدھر سب وعدے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیے گئے اور ہندوستان کے مسلمان اپنی سادہ لوحی اور برطانیہ کی سیاسی چالوں پر افسوس اور تعجب کرتے رہ گئے۔

مسلمانوں کو شکایت تھی کہ باوجود ان وعدوں کے مقامات مقدسہ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ تھریس یونان کے حوالے کر دیا گیا۔ فرانس اور برطانیہ نے سلطنت برطانیہ کا تمام مشرقی علاقہ دبا لیا اور خلیفہ آئینی اقتدار کے بہانے سے ہر قسم کی طاقت اور قوت سے محروم کر دیا گیا۔ مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ ان وعدوں کے مطابق خلیفہ کو پوری پوری آزادی دی جائے اور ممالک اسلامیہ ومقامات مقدسہ پر حسب سابق خلافت کا قبضہ برقرار رکھا جائے۔

ان وعدوں کے ایفا کی کوشش کرنے کے لیے وفدِ خلافت کی تجویز محمد علی کے دماغ میں آئی۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارا مطالبہ اس قدر کھلے ہوئے واقعات پر مبنی ہے کہ اگر معقول طریقہ سے کوشش کی گئی تو حکومت برطانیہ اس کو ضرور منظور کر لے گی۔ برطانیہ کو اس کے وعدے یاد دلانے کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اور ملکوں کو مسلمانوں کے مطالبات سے آگاہ کر دیں تا کہ دنیا کی رائے عامہ ان کے موافق ہو جائے۔

وائسرائے کو وعدوں کی یاد دہانی

وفدِ خلافت کے ولایت جانے سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک متحدہ وفد لارڈ چیمسفورڈ

کے پاس گیا اور حکومت برطانیہ کے وہ تمام وعدے یاد دلائے جو اُس نے مسلمانوں کے ساتھ کر کے بھلا دیے تھے۔ بھلا وائسرائے کیا کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ انھوں نے وقتی وعدہ کر لیا کہ وہ مسلمانوں کے خیالات و جذبات کو حکومت برطانیہ کی خدمت میں پہنچا دیں گے۔ اس وفد کے ارکان میں سے چند نام قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خان، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، مسٹر محمد جناح، ڈاکٹر کچلو وغیرہ۔

وائسرائے کے سامنے جو مدلل اور مبسوط ایڈریس اس وفد نے پیش کیا وہ محمد علی ہی نے تیار کیا تھا۔ اور اس کا ایک حصہ یادگار ہے۔ وفد نے وائسرائے سے کہا:

> ''ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ برطانیہ کو خواہ کیسا ہی زبردست سیاسی نفع ہو یا کتنا ہی بڑا اور زرخیز خطہ زمین حاصل ہو لیکن اس سے تلافی نہیں ہو سکتی، اخلاقی عزت کے اس نقصان کی جو برطانیہ کے اقتدار کو ہوگا اگر وعدے حرف بہ حرف پورے نہ کیے گئے۔
>
> اخلاقی رعب کا خاتمہ اس لیے اور گراں معلوم ہوگا کہ اس اعلان شاہی کی قلعی کھل جائے گی جو آپ کے پیشرو وائسرائے نے ترکی کی لڑائی ہونے پر شائع کیا تھا۔''

ولایت کا سفر

1920 میں یہ وفد ولایت کے لیے روانہ ہوا، تاکہ کانفرنس امن کے اختتام سے پہلے انگلستان پہنچ کر برطانوی حکومت پر زور ڈالا جائے کہ وہ مسلمانوں کے احساسات اور اپنے وعدوں کو یوں پامال نہ کریں۔

وفد کے صدر محمد علی تھے۔ اراکین میں سید حسین صاحب، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب اور ابوالقاسم صاحب تھے اور حسن محمد حیات صاحب سکریٹری تھے۔ یہ کہنا بیکار ہوگا کہ اگر چہ سب اراکین نے اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا لیکن روح رواں اس وفد کے محمد علی ہی تھے۔ اس زمانے میں ان کو بس اسی کی دھن تھی کہ کسی طرح ترکی اور ممالک اسلامیہ کو برباد ہونے سے بچالیں۔

انگلستان میں کوششیں

جس روز یہ وفد وینس پہنچا اُسی دن انگریزی اخباروں سے اراکین وفد کو معلوم ہوا کہ کانفرنس امن دو ہی تین دن میں ترکی کا خاتمہ کرنے والی ہے۔ محمد علی نے فوراً جا کر نہایت پر زور برقی پیغام تمام اتحادی طاقتوں کے نمائندوں، اخباروں اور خصوصاً مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم اور مسٹر مانٹیگو وزیر ہند کو بھیجے۔ اگلے روز جب یہ لندن پہنچے تو دارالعلوم میں قسطنطنیہ کی واپسی پر بحث ہو رہی تھی۔

انگلستان میں یہ وفد تمام ذمہ دار اصحاب سے ملا اور ان کو مسلمانوں کا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کی۔ محمد علی نے متعدد زوردار تقریریں کیں جن کا بہت کچھ اثر رائے عامہ پر پڑا۔ مسٹر جارج لینسبری مشہور مزدور لیڈر نے ان کا بہت ساتھ دیا اور اکثر مقامات پر جلسے کرانے میں مدد دی۔

ریمزے میکڈانلڈ کی خفگی

اُسی زمانے میں مزدور پارٹی کی کانفرنس ہونے والی تھی۔ محمد علی نے سوچا کہ یہ موقع برطانیہ کے عوام کے سامنے اپنا مقصد بیان کرنے کے لیے اچھا ہے۔ اس لیے انھوں نے کوشش شروع کی کہ ان کو چند منٹ تقریر کرنے کے لیے مل جائیں مگر مشکل یہ آن پڑی کہ پروگرام طے ہو چکا تھا اور ریمزے میکڈانلڈ صاحب جو سکریٹری تھے باوجود محمد علی سے پرانی ملاقات کے ان سے ناراض تھے۔ خفگی کا سبب یہ تھا کہ لندن پہنچنے پر محمد علی اور اراکین وفد میکڈانلڈ کے پاس کیوں نہ آئے اور دوسرے لوگوں کے پاس کیوں گئے۔ اس واقعہ کے متعلق محمد علی کے الفاظ قابلِ ذکر ہیں جو انھوں نے کئی سال بعد ایک خط میں لکھے تھے:

> "جو شخص برطانیہ کا وزیر اعظم ہونے والا تھا وہ اس قدر کم ظرف و تنگ دل؟ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ مزدور پارٹی کے لیڈروں سے ان کی اس قسم کی مخالفت تھی کہ میرا ان سے ملنا ان کو اتنا ناگوار ہوا، جو شخص رشک و حسد میں اس قدر ڈوبا ہوا ہو کہ ہندوستان اور ترکی اور خود برطانیہ کے مفاد کا خیال نہ رکھے اور خیال رکھے تو صرف اس کا کہ فلاں شخص مزدور پارٹی کے اور لیڈروں سے کیوں ملا اور مجھ سے کیوں نہ ملا، اس سے بھلا کسی بھلائی کی امید ہو سکتی ہے؟"

مزدور کانفرنس میں تقریر

پھر بھی مسٹر جارج لینسبری کی کوشش سے محمد علی کو پانچ منٹ تقریر کرنے کی اجازت مل گئی۔ جس انداز سے محمد علی نے تقریر کی اس سے حاضرین اتنے محظوظ ہوئے کہ باوجود صدر کے کئی بار گھنٹی بجانے کے لوگ یہی چلاتے رہے کہ 'انھیں اور بولنے دو'۔ بجائے پانچ منٹ کے محمد علی نے پورے بیس منٹ تقریر کی اور سامعین پر نہ صرف اپنی سلاست زباں اور روانی بیان کا سکّہ بٹھا دیا بلکہ انھیں بڑی حد تک اپنا طرفدار بنالیا۔

لندن اور پیرس سے اخبار

اس کے بعد محمد علی، مولانا سلیمان ندوی اور دوسرے حضرات نے فرانس میں بھی تقریریں کیں اور اپنے مقاصد کی تبلیغ کی اور پھر روم جاکر پوپ سے ملے اور اس کو مسلمانوں کے احساسات و مذہبی جذبات سے آگاہ کیا۔ پوپ نے ان کے مقصد سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ ترکوں نے عیسائیوں کے ساتھ ہمیشہ رواداری کا سلوک کیا ہے۔ اسی زمانے میں اپنے کام کی اشاعت کے لیے محمد علی نے لندن سے 'مسلم آؤٹ لک' (مسلمانوں کا نظریہ) اور پیرس سے 'ایکوڈے اسلام' (اسلام کی آواز بازگشت) نامی اخبارات جاری کیے۔

محمد علی نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا کہ فرانس اور اٹلی ترکی پر زیادہ سخت پابندیاں عائد کرنے پر اتنے مصر نہیں ہیں جتنی اور طاقتیں ہیں۔ اس لیے وہ بہت سے فرانسیسی قائدین سے ملے اور یہ ان کی کامیابی کی دلیل ہے کہ فرانس کے اکثر مقتدر اخبارات نے ان کی تائید کی۔

لائڈ جارج سے ملاقات

آخر میں انھوں نے خود مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم سے ملاقات کی اور نہایت بیباکی سے مسلمانوں کے مطالبات پیش کیے۔ برطانیہ کے وعدے یاد دلائے اور وعدہ خلافی کی شکایت کی۔ مگر ان سب کوششوں سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ سوائے اس کے کہ برطانیہ کی وعدہ خلافی اور احسان فراموشی سب کو آنکھ سے نظر آجائے۔ اکتوبر میں محمد علی اور ارکانِ وفد ہندوستان واپس آگئے۔

تحریک عدم تعاون

ابھی وفدِ خلافت ولایت ہی میں تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک متحدہ کانفرنس ہوئی جس میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مالویہ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو وغیرہ شامل تھے۔ اکثریت نے طے کیا کہ خلافت اور ترکوں کو برطانیہ نے جو نقصان پہنچایا ہے اس کے خلاف ایک مؤثر احتجاج کیا جائے۔

خلافت کانفرنس نے اپنے ایک جلسہ میں طے کیا کہ مسلمان مہاتما گاندھی کی سرداری میں کام کریں گے۔

22 جون کو وائسرائے کے نام ایک بیان بھیجا گیا جس میں اُن سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اگر حکومت برطانیہ سے مسلمانوں کے مطالبات منظور نہیں کرا سکتے تو وہ استعفیٰ دے دیں اور ان کی احتجاجی تحریک کی سرداری کریں۔

اس کے بعد مہاتما گاندھی نے محمد علی کو ولایت ایک برقی پیغام بھیجا جس میں انھیں اس خط کی جو وائسرائے کو بھیجا گیا تھا اطلاع دی اور یہ اطمینان دلایا کہ ہم نے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے اعلان کر دیا ہے کہ اگر یکم اگست 1921 تک مسلمانوں کے مطالبات پورے نہ ہوئے تو ہم عدم تعاون کی تحریک شروع کرنے پر مجبور ہوں گے۔

خلافت و سَوراج

وفد کے ناکام واپس آنے پر ملک میں حکومت کے خلاف غم و غصہ کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ حکومت کے وعدے کیا حیثیت رکھتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو وہ کس طرح ان کو بھول جاتی ہے۔ ایسی حکومت کس برتے پر ان سے تعاون کی امید کر سکتی تھی۔

یہ بھی اب ظاہر ہو گیا تھا کہ مشرق میں برطانوی اقتدار کی جڑ ان کا ہندوستان پر قبضہ ہے۔ اگر ہندوستان آزاد ہو جائے تو ممالک اسلامی سے برطانوی اثر مٹانا آسان ہوگا۔

ہندوؤں نے بھی دیکھا کہ جس طرح حکومت نے مسلمانوں سے وعدے کر کے پورے نہیں کیے، اسی طرح اور ہندوستانیوں کے ساتھ بھی کریں گے، حکومت کو خود اختیاری کا سبز باغ

جو جنگ کے شروع ہونے پر دکھایا گیا تھا، اب فریب نظر ثابت ہو چکا تھا۔ دونوں قوموں نے مشترکہ قوت کے ساتھ وہ تحریک شروع کی جو موجودہ ہندوستان کی تاریخ میں 'تحریک خلافت و سوراج' کے نام سے یادگار رہے گی۔

یہ بے ہتھیار کی جنگ جو مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی کی سرداری میں شروع ہوئی، ہندوستان کی تاریخ قومیت کا پہلا سنہری باب ہے، اس کا مفصل ذکر خود ایک بڑی کتاب کا محتاج ہے اس لیے ہم ان چند واقعات پر اکتفا کریں گے جو بلا واسطہ مولانا محمد علی کی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔

عدم تعاون کی تحریک کا ایک پہلو سرکاری تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ بھی تھا۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں طالب علم گورنمنٹ کے کالجوں اور اسکولوں کو خیر باد کہہ کر قومی جنگ میں شریک ہو چکے تھے۔ قومی لیڈروں کا ارادہ یہ تھا کہ تمام سرکاری اور نیم سرکاری تعلیمی اداروں کو بند کر کے قومی ادارے قائم کیے جائیں۔ اسی ارادہ سے محمد علی اپنے رفقاء کے ساتھ علی گڑھ آئے تاکہ پہلے یہاں کے کرتا دھرتا کو دعوت دیں کہ حکومت کا دامن چھوڑ کر قوم اور مذہب کا ساتھ دیں اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو طالب علموں کو ترغیب دیں کہ کالج چھوڑ دیں۔ محمد علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خان کورٹ کے اجلاس میں شریک ہوئے اور ارا کین کورٹ سے اپیل کی کہ سرکاری تعلق کو چھوڑ کر کالج کو ایک قومی ادارہ بنائیں۔ کورٹ میں سرکاری عنصر آج کی طرح اس وقت بھی غالب تھا۔ اس لیے یہ تجویز ٹھکرا دی گئی۔

پھر محمد علی نے یونین میں طلباء کے سامنے ایک زبردست تقریر کی اور کہا کہ اسلام اور وطن کی خدمت کے لیے انھیں تعلیم کو خیر باد کہہ کر قومی جنگ میں شریک ہو جانا چاہیے۔ تقریر اتنی پر اثر تھی کہ اُسی وقت سینکڑوں طالب علموں نے اعلان کر دیا کہ وہ کالج چھوڑ دیں گے۔ ایک بڑی تعداد نے یہ اعلان فقط وقتی جوش میں کیا تھا لیکن پھر بھی ان طالب علموں میں سے محمد علی کو بہت سے کام کے ساتھی ملے۔

محمد علی اور ان کے ساتھی علی گڑھ میں اولڈ بوائز لاج میں ٹھہرے ہوئے تھے جو خود انھی کی کوششوں سے تعمیر ہوا تھا۔ خداوندان کالج کو یہ کب منظور تھا کہ یہ 'باغی اور سرکش' حدود کالج میں رہ سکیں۔ انھیں حکم دیا گیا کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ جب اس سے انکار ہوا تو کالج کے افسروں

نے وہ کیا جو آج تک نہ ہوا تھا۔ یعنی کالج کی حدود میں پولس بلا لی گئی۔ علی گڑھ کے قابلِ فخر اولڈ بوائز خود ان کے بنائے ہوئے اولڈ بوائز لاج سے نکلوا دیے گئے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

علی گڑھ کالج سے محمد علی کی محبت ضرب المثل تھی۔ یہاں کے زمین و آسمان، عمارات اور مکانات غرض چپے چپے سے محمد علی کو عشق تھا۔ یہ ان کی مادرِ علمی تھی جس کی گود میں انھوں نے پرورش پائی تھی اور انھیں اس سے اسی قدر محبت تھی جتنی بیٹے کو ماں سے ہوتی ہے لیکن اس وقت جب مسلمانوں کی عزت کا سوال تھا محمد علی نے ذاتی محبت کو قومی محبت پر قربان کر دیا اور جس کالج کے لیے کبھی وہ جان دینے کو تیار تھے اسی کے احاطے کے باہر انھوں نے اس کے مقابل میں ایک نیا ادارہ قائم کیا جس کا نام 'جامعہ ملیہ اسلامیہ' رکھا گیا۔

علامہ شیخ الہند مرحوم اس درس گاہ کے بانی تھے۔ حکیم اجمل خان مربی اور محمد علی اس کے پرنسپل جو طالب علم ایم۔ اے۔ او کالج چھوڑ کر آتے تھے وہ جامعہ میں داخل ہو جاتے تھے۔ دو دو ادارے جن کے درمیان مشکل سے نصف میل کا فاصلہ ہوگا۔ دونوں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے قائم ہوئے تھے۔ دونوں کی بنیاد خلوص اور دردِ اسلامی پر رکھی گئی مگر 1920 میں ان دونوں کی حالت میں عبرت انگیز فرق تھا۔ ایک طرف عظیم الشان عمارتیں تھیں لیکن خالی۔ طالب علم یا تو کالج چھوڑ چکے تھے یا ان 'باغیوں' کے ڈر سے گھر بھیج دیے گئے تھے۔ دوسری طرف چند بوسیدہ خیمے تھے مگر طالب علموں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے۔ ایک طرف اگر شاندار لکچر روم اور ہال خالی پڑے تھے تو دوسری طرف درختوں کے نیچے فرشِ خاک یا چٹائیوں پر درس ہو رہا تھا۔ اُدھر اگر کالج کا خزانہ روپیہ سے پُر تھا تو اِدھر جامعہ کے بانی اور استاد اور طالب علموں کے دل جوشِ قومی سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف مادّی ساز و سامان کی فراوانی لیکن اخلاقی جرأت اور حوصلے کی کمی تھی تو دوسری طرف بے سر و سامانی میں بھی حوصلے بلند اور ارادے مستحکم تھے۔ ایک طرف اگر سرکاری امداد پر بھروسہ تھا تو دوسری طرف تائیدِ الٰہی پر۔

اس طرح جامعہ ملیہ کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد اپنی سیاسی مصروفیات کے باعث محمد علی

کو جامعہ کی باگ اپنے عزیز دوست خواجہ عبدالمجید کے ہاتھ میں دینی پڑی۔ مگر اس ادارے سے ان کو ہمیشہ وہی دلچسپی اور محبت رہی اور جامعہ کی ہر ممکن مدد میں انھوں نے کبھی دریغ نہ کیا۔

ناگپور کانگریس و خلافت کانفرنس

جامعہ قائم کرنے کے بعد محمد علی نے ملک کا ایک دورہ کیا اور ہر جگہ لوگوں کو ترکِ موالات کی تحریک کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ دسمبر 1920 میں ناگپور میں کانگریس کا تاریخی اجلاس ہوا۔ عدم تعاون کا پروگرام منظور کیا گیا اور مہاتما گاندھی کو اس کی قیادت سونپ دی گئی۔ کانگریس کے ساتھ ہی خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا اور وہاں بھی ترکِ موالات کی تحریک میں شرکت کی تجویز پاس ہوگئی اور مہاتما گاندھی کی لیڈری منظور کر لی گئی۔

کانگریس کے اس اجلاس میں اعتدال پسند بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے تھے۔ تاکہ تحریک عدم تعاون کی مخالفت کریں اور 'احتجاج' کو بدستور 'آئینی' طریقے پر جاری رکھیں۔ 'معتدل' حضرات میں۔ سی۔ آر۔ داس، پنڈت مدن موہن مالویہ اور محمد علی جناح پیش پیش تھے۔ محمد علی نے ان سب کو سمجھانے کی انتہائی کوشش کی لیکن پنڈت مالویہ اور جناح نے 'آئینیت' کا دامن نہ چھوڑا۔ البتہ کئی دن کی مسلسل بحث و مباحثہ کے بعد وہ سی۔ آر۔ داس کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

یہ کانگریس کئی لحاظ سے نہایت اہم تھی۔ اول تو ہندو اور مسلمان دونوں نے ایک متحدہ پروگرام منظور کیا۔ دوسرے 'معتدل' فریق ہمیشہ کے لیے کانگریس سے خارج ہوگیا۔ یہاں سے کانگریس کا 'غیر آئینی' اور 'باغیانہ' دور شروع ہوتا ہے۔ تیسرے محمد علی کے جوہر قیادت کے سب قائل ہوگئے اور مہاتما گاندھی کے بعد ان کو ہندوستان کا سب سے بڑا لیڈر تسلیم کیا گیا۔ اب تک محمد علی کی علمی قابلیت، سلجھے ہوئے دماغ اور ان کی تقریر کی شہرت تھی۔ اب وہ زمانہ آیا کہ لوگ ان کی سرفروشی اور حب الوطنی کے جوہر دیکھیں۔

مہاتما گاندھی اور مولانا شوکت علی صاحب کے ساتھ انھوں نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا۔ محمد علی اور گاندھی، گاندھی اور محمد علی۔ یہی دو نام ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھے۔ اور ان ناموں کا اتحاد ہندو مسلمانوں کے عملی اتحاد کی نشانی بن گیا تھا۔ اس سفر میں محمد علی نے وہ ولولہ انگیز

اور زبردست تقریریں کیں کہ ملک کے اِس سرے سے اُس سرے تک حب الوطنی کی ایک آگ لگادی۔ ہر شخص کو آزادی کا متوالا بنادیا۔ بڑے بڑے آستانۂ حکومت کے پرستار سرکار سے منحرف ہوگئے۔ ملک بھر حکومت کا مخالف ہوگیا۔ انگریز کا ڈر ہندوستانی کے دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ قید خانوں کو لوگ اپنا گھر سمجھنے لگے۔ لاٹھیاں اور گولیاں کھانا ایک کھیل ہوگیا۔ اتحاد کا یہ حال تھا کہ ہندو 'اللہ اکبر' کے نعرے لگاتے تھے اور مسلمان 'بھارت ماتا کی جے' پکارتے تھے۔ ملک کے گوشے گوشے سے اگر کوئی آواز آتی تھی تو وہ یہی تھی کہ 'بولو مہاتما گاندھی کی جے' 'بولو مولانا محمد علی کی جے۔'

مدراس کی تقریر

خلافت کی تحریک ایک مذہبی تحریک تھی، اس لیے بعض لوگوں کو شبہ تھا کہ محمد علی اور ان کے رفقاء کو ملکی مفاد کا اتنا خیال نہیں ہے جتنا مذہب کا جوش ہے۔ اس زمانے میں افغانستان کے حملے کی افواہ بھی مشہور کردی گئی تھی۔ اس سلسلے میں مدراس کے مقام پر محمد علی نے جو تقریر کی تھی وہ یادگار رہے گی۔ اس تقریر کے دوران (میں) انھوں نے اپنی حب الوطنی کے متعلق تمام شکوک کو یہ کہہ کر مٹادیا کہ:

> "اگر کوئی غیر ملکی طاقت خواہ وہ جرمنی ہو یا روس یا ترکی یا افغانستان ہمارے ملک پر حملہ کرے گی ہم سب سے پہلے اپنے ملک کی حفاظت میں جان دیں گے۔ ہم ایک دفعہ غلام بنائے جاچکے ہیں ہمیں دوبارہ غلام بننے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔"

عدم تشدد

محمد علی نے شروع سے عدم تشدد کو اس تحریک کا اور اپنا بنیادی اصول مان لیا تھا لیکن ان کی جوشیلی تقریروں کے متعلق حکومت کا خیال تھا کہ وہ لوگوں کو تشدد کی ترغیب دیتی ہیں۔ اسی زمانے میں پنڈت مالویہ کی کوشش سے لارڈ ریڈنگ اور مہاتما گاندھی کی ملاقات ہوئی جس کے دوران وائسرائے نے شکایت کی کہ علی برادران کی تقریریں حکومت کے خلاف، نہ صرف بغاوت بلکہ

تشدد کی ترغیب دیتی ہیں۔ مہاتما گاندھی نے کہا یہ محض غلط فہمی ہے کہ علی برادران تشدد کی تعلیم دے رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ دونوں بھائی مکمل طور پر عدم تشدد کے پابند ہیں۔ بہر حال مہاتما گاندھی نے محمد علی کو لکھا کہ تم اس کے متعلق ایک بیان شائع کردو۔

معافی

اس زمانے میں مشہور کیا گیا کہ علی برادران نے حکومت سے معافی مانگ لی۔ مگر لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ ایسے زبردست 'باغی' حکومت کے ڈر سے معافی نامہ لکھ دیں۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ مہاتما گاندھی کی فرمائش کے بموجب دونوں بھائیوں نے ایک بیان شائع کیا تھا جس میں صراحت کے ساتھ انھوں نے عدم تشدد کے اصول کو تسلیم کیا تھا اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ ان کی تقریروں سے یہ مطلب نکالا گیا کہ وہ تشدد کے حامی ہیں۔ اس بیان کو حکومت کے موافقین نے علی برادران کی معافی کے نام سے مشہور کیا۔

کراچی کا مقدمہ

کراچی میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا اور اس میں محمد علی کی صدارت میں ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا جس کی رو سے اعلان کیا گیا کہ مسلمان کے لیے اسلام کے دشمنوں کی امداد اور خدمت حرام ہے۔ اس تجویز کی تائید سارے ہندوستان میں نہ صرف مسلمان علماء نے کی بلکہ ہندو پنڈتوں نے بھی کہا کہ ہمارے مذہب کی رو سے بھی ظالم حکومت کی امداد حرام ہے۔ مہاتما گاندھی اور سینکڑوں ہندو لیڈروں نے اس کی موافقت کی اور کانگریس نے بھی اسی مضمون کا ریزولیوشن پاس کیا۔

اسی ریزولیوشن کی بنا پر علی برادران پر بغاوت پھیلانے کا الزام لگایا گیا اور کراچی میں مقدمہ چلایا گیا۔ محمد علی اور ان کے ملزم رفقاء نے نہایت بے پروائی اور اطمینان سے مقدمے کی کارروائی کو سنا اور جب دو سال قید بامشقت کا حکم سنایا گیا تو ہنستے ہوئے جیل چلے گئے۔

رہائی اور کانگریس کی صدارت

محمد علی کے ایام اسیری میں ملک میں جو جو انقلابات ہوئے وہ لوگوں کو اب بھی یاد ہوں

گے۔ ان کے بعد ہزاروں آدمی جیل گئے۔ مہاتما گاندھی اور تمام لیڈر قید کر دیے گئے مگر جو آگ محمد علی کی گرفتاری نے لگائی تھی وہ کم نہ ہوئی۔ دو سال بعد اگست 1923 میں محمد علی رہا ہو گئے۔ اس موقع پر انھوں نے جو بیان دیا اُس کا ایک فقرہ نہایت مؤثر تھا۔

'میں ایک چھوٹے جیل خانہ سے نکل کر بڑے جیل خانے میں آ گیا ہوں۔ مجھے بڑے جیل کی کنجی کی تلاش ہے تا کہ میں گاندھی جی کو رہا کرا سکوں اور اس کے حصول کا انحصار آزادی پر ہے۔'

اسی سال محمد علی کی خدمات اور قربانیوں کے اعتراف میں ان کو وہ اعزاز نصیب ہوا جس سے بڑھ کر کسی ہندوستانی کو کوئی عزت نہیں دی جا سکتی۔ یعنی کانگریس کی صدارت۔ محمد علی کا خطبۂ صدارت اپنے غیر معمولی حجم اور ادبی چاشنی کی وجہ سے یادگار رہے گا۔ خطبہ کیا تھا، ہندوستان کی تحریک آزادی کی 1923 تک کی تاریخ تھا۔ یہ خطبہ اسلام اور جذبۂ قومیت کے اتحاد کی بھی بہترین مثال تھی۔ 'اللہ اکبر' سے شروع ہوتا تھا اور 'وندے ماترم، مہاتما گاندھی کی جے' پر ختم۔ اس خطبے میں انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے بھی پرزور اپیل کی اور بتایا کہ کس طرح دونوں قوموں کا فائدہ ساتھ کام کرنے میں ہے۔

دورِ صدارت

محمد علی کا دورِ صدارت ملک کی تاریخ میں نہایت اہم سال تھا۔ تحریک عدم تعاون کا ردعمل شروع ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ پنڈت موتی لال کی قیادت میں اسمبلی میں جانا چاہتے تھے۔ محمد علی خود اس کے خلاف تھے لیکن انھوں نے سوراج پارٹی کے اراکین کے ساتھ نہایت رواداری کا سلوک کیا اور ان کو اپنی رائے کے اظہار کا پورا موقع دیا۔

اسی زمانے میں فرقہ وارانہ تحریکیں بھی زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ سوامی شردھانند نے جیل سے معافی مانگ کر رہا ہونے کے بعد شدھی اور سنگھٹن کی تحریک شروع کر دی تھی۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے تبلیغ اور تنظیم کی تحریکیں شروع کیں اور کوشش کی کہ محمد علی کو بھی اپنے ساتھ شامل کریں لیکن محمد علی نے ان کے ساتھ مل کر کام کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی قومی و ملکی خدمات میں مصروف رہے۔

فرقہ وارانہ فسادات

یہ فرقہ وارانہ تحریکات اپنا اثر کیے بغیر نہ رہ سکتی تھیں۔ ایک وہ زمانہ تھا جب تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کا دور دورہ تھا۔ ایک یہ زمانہ آیا کہ ہر دوسرے تیسرے مہینے ملک کے کسی نہ کسی گوشہ سے ہندو مسلم فساد کی خبر آتی تھی بہت سے سابق قوم پرست اب کھلم کھلا قوم پرستی کی تعلیم دے رہے تھے۔ کوئی شدھی میں مصروف تھا تو کوئی تنظیم میں ـــ ہندو مسلمانوں کو فسادات کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے اور مسلمان ہندوؤں کو لیکن محمد علی کا نظریہ یہ تھا کہ کسی ایک فرقہ کو الزام دینا بے کار ہے۔ وہ کہتے تھے کہ فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ اس قسم کے فسادوں کا ہونا لازمی ہے۔ انھوں نے اتحاد پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ ملک بھر میں مارے مارے پھرے۔ اتحاد کانفرنس منعقد کرائی۔ ہندو مسلمان لیڈروں کی خوشامد کی لیکن ساری دوڑ دھوپ بے کار ثابت ہوئی اور ملک کی سیاسی فضا خراب ہی ہوتی چلی گئی۔

حجاز و حج

اسی زمانے میں حجاز میں غیر معمولی انقلابات رونما ہو رہے تھے۔ شریف حسین اور ابن سعود کی جنگ جاری تھی۔ حکومت نے ایک اعلان شائع کیا جس میں حجاز کی حالت نا قابل اطمینان بتائی گئی اور حاجیوں کو 'مشورہ' دیا گیا کہ وہ حج کو ملتوی کر دیں۔ محمد علی نے اس کی سخت مخالفت کی اور ملک بھر میں کوشش کی کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں حج کو جائیں۔ ہزاروں حاجی اس سال محمد علی کی کوشش سے گئے اور کسی کا بال بیکا نہ ہوا۔

شریف حسین کی بد اعمالیوں کی وجہ سے محمد علی اس کے مخالف تھے اور چونکہ ابن سعود نے اعلان کیا تھا کہ وہ شخصی حکومت نہیں بلکہ حجاز کی جمہوری حکومت قائم کرے گا، اس لیے اس کی موافقت کر رہے تھے مگر ابن سعود کی مخالفت اس کے 'وہابی' ہونے کے سبب سے نہایت زوروں پر تھی۔ اسی سلسلہ میں محمد علی کی بھی شدت سے مخالفت کی گئی۔ طرح طرح کے الزامات لگائے گئے مگر انھوں نے اپنی رائے کو نہیں بدلا۔ مزارات مقدسہ کے انہدام کے مسئلہ میں محمد علی مخالفین ابن سعود کی بھیجی ہوئی خبروں پر یقین کرنے سے پہلے یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے نمائندے خود جا کر

صورت حال کا معائنہ کریں۔

مگر اصول پرستی اس کا نام ہے کہ علی الاعلان ابن سعود کے حامی ہونے کے باوجود جس وقت خبر آئی کہ اس نے حجاز کی 'بادشاہی' قبول کر لی ہے، محمد علی اس کی مخالفت میں پیش پیش ہو گئے۔ وہ فطرتاً جمہوریت پسند واقع ہوئے تھے اور خدا کے گھر پر کسی شخصی حکومت کا قبضہ ہونا انھیں ہرگز گوارا نہ تھا۔

مؤتمر اسلامی

1926 میں ابن سعود نے مؤتمر اسلامی کا اعلان کیا اور محمد علی مع وفدِ خلافت کے اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے۔ خود ابن سعود نے مؤتمر کی صدارت کی مگر محمد علی رعب میں آنے والے نہ تھے۔ انھوں نے وہیں بھرے جلسے میں ابن سعود کو مخاطب کر کے بے باکانہ طریقہ سے تقریر کی اور کہا کہ اسلام نے شخصی حکومت اور ملوکیت کی مخالفت کی ہے۔ تم جو اپنے آپ کو رسول کا نائب بتاتے ہو کیوں قیصر و کسریٰ کی پیروی میں 'بادشاہی' قائم کر رہے ہو۔

حجاز میں منہدم کی ہوئی عمارات مقدسہ کو بھی محمد علی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جب ابن سعود نے ان کو دوبارہ تعمیر کرانے کا ذمہ نہیں لیا تو ان کی مخالفت اور مستحکم ہو گئی۔

فرقہ پرستی

اب وہ زمانہ آتا ہے جب یہ خیال کیا جانے لگا کہ محمد علی کا رجحان قوم پرستی سے ہٹ کر فرقہ پرستی کی طرف ہونے لگا ہے۔ ملک کی فضا اس وقت عجیب تھی فرقہ پرستانہ ذہنیت کا دور دورہ تھا۔ شدھی اور سنگھٹن اور تبلیغ اور تنظیم کا چرچا تھا۔ ہندو مسلم فسادات عام تھے۔ محمد علی اس قسم کی تحریکات سے شروع ہی میں بیزاری کا اظہار کر چکے تھے اور مسلمانوں کے فرقہ پرست اور دشمن اتحاد فریق سے جنگ آزما تھے۔ مگر انھوں نے یہ محسوس کیا کہ جس دلیری سے وہ مسلمان فرقہ پرستوں سے لڑ رہے تھے۔ اس طرح ہندو لیڈر اور اکثر کانگریسی ہندو اپنے یہاں کے فرقہ پرستوں سے لڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ہندو مہا سبھا، سونجے اور شردھانند کے خلاف مورچہ قائم کرے۔

مئی 1926 میں اسپیشل خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی غرض وغایت محمد علی نے یوں بیان کی کہ 'جب پنڈت موتی لال نے مہا سبھائیوں کو ایک حرف بھی کہنے سے انکار کر دیا تو حکیم اجمل خان صاحب مرحوم نے مجبور ہو کر ان سے صاف کہہ دیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کچھ امید نہ رکھیں۔'

بہر حال اس کانفرنس میں کوئی تجویز ایسی پاس نہیں ہوئی جس میں اعلان جنگ یا کانگریس اور ہندوؤں سے بیزاری کا اظہار ہو بلکہ کانفرنس کے بعد محمد علی نے جو مسلمانوں کے نام اپیل کی اس میں فرمایا:

> ''یہ ملک کے لیے سخت ترین ابتلا و آزمائش کا زمانہ ہے نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہل ہنود کو مشتعل ہونے کا موقع دیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمہارے اوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو۔ اگر چھری دکھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔''

مگر یہ اب صاف ظاہر تھا کہ وجہ خواہ کچھ بھی ہو وہ اشتراک عمل اور اتحاد جو اب تک محمد علی اور دیگر کانگریسی لیڈروں کے درمیان رہا تھا اب آہستہ آہستہ غائب نہیں تو کمزور ہوتا جا رہا تھا۔

کتاب راجپال

جولائی 1927 میں ایک شخص راجپال نامی نے ایک کتاب شائع کی جس میں رسول کریمؐ پر نہایت بے ادبانہ اور رکیک حملے کیے گئے تھے۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی مہاتما گاندھی نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مسلمانوں میں تو اس کی اشاعت سے ایک آگ لگ گئی۔ ہر شخص اس کی ضبطی اور مصنف کو سزا دہی کا مدعی تھا۔ پنجاب ہائی کورٹ میں جسٹس دلیپ سنگھ نے مصنف کو بری کر دیا اس پر شورش اور بڑھی اور 'جسٹس دلیپ سنگھ مستعفی ہو جاؤ' کی آواز تمام اسلامی ہند سے بلند ہوئی۔ ایسے وقت میں عوام کی رائے کی مخالفت کرنے کی ہمت سوائے محمد علی کے کوئی نہ کر سکتا تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ دلیپ سنگھ نے جان بوجھ کر بے انصافی نہیں کی۔ قصور اس کا نہیں بلکہ قانون ضابطۂ فوجداری کا ہے کہ اس میں کوئی صاف اور واضح دفعہ مذہبی پیشواؤں کی توہین کو روکنے کے

لیے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ہنگامے میں محمد علی کی کون سنتا تھا۔ رائے عامہ کے سیلاب کے ساتھ بہنا آسان ہے۔ اس کی مخالفت ہمت اور جوانمردی کا کام ہے۔ محمد علی کو دشمنوں نے گالیاں دیں، دوستوں نے برا بھلا کہا مگر انھوں نے اپنی رائے کو نہ بدلا بلکہ پیہم کوششوں سے شورش کو ٹھنڈا کیا۔ اسی وقت انھوں نے ایک قانون کا مسودہ بنایا، جس کی رو سے کسی مذہب یا مذہبی پیشوا کی توہین قانونی جرم قرار دیا جائے، یہ قانون سر ذوالفقار علی خاں نے پیش کیا اور کثرت رائے سے اسمبلی میں پاس ہوا۔

آل پارٹیز کانفرنس

باوجود ناموافق فضا کے محمد علی اب بھی اسی کوشش میں تھے کہ کسی طرح ہندو اور مسلمانوں میں مصالحت ہو جائے۔ کئی 'یونٹی کانفرنسیں' ہوئیں مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ 1927 میں پھر کوشش ہوئی کہ ایک کانفرنس تمام قابل ذکر انجمنوں کے نمائندوں کی 'آل پارٹیز کانفرنس' کے نام سے کی جائے۔ کانفرنس کے ابتدائی جلسوں میں ملک کے نمائندوں کی کافی تعداد شریک ہوئی مگر جب طرفین تعصب کا جواب تعصب سے اور غصہ کا جواب غصہ سے دیں تو صلح کیا خاک ہوگی۔ مہاسبھا اور مسلم لیگ کے نمائندوں کی تو تو میں میں کے بعد یہ کانفرنس بھی 'ملتوی' ہوئی۔

'چودہ نکات'

جب دوسری کوششیں ناکام رہیں تو محمد علی نے چاہا کہ مسلمان پہلے آپس میں متفق ہو جائیں اور پھر کانگریس سے اتفاق کر لیں تاکہ قومی آزادی کا کام جاری رہے۔ دہلی میں اسمبلی کے اجلاس کے زمانے میں انھوں نے مسٹر جناح کی شرکت میں مسلمانوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس کی۔ محمد علی کی کوشش سے اکثریت مخلوط انتخاب کے موافق ہوگئی اور 'چودہ نکات' منظور کیے گئے، جن پر سب متفق تھے۔ یہ چودہ نکات اب ملک بھر میں 'جناح کے چودہ نکات' کے نام سے مشہور ہیں اور مسلمانوں کی سیاسی انجمنوں کی عقل وفکر کا مدار ان ہی پر ہے۔ یہ نکات محمد علی نے کانگریس کے سامنے پیش کیے اور وہاں بھی منظور کرا لیے مگر فرقہ پرست ہندوؤں اور فرقہ پرست مسلمانوں کی مخالفت جاری رہی اور ملک کی فضا میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی۔

سائمن کمیشن

1927 میں انگلستان کی مزدور گورنمنٹ نے سائمن کمیشن کا تقرر کیا جس کے ممبر سب انگریز تھے اور جس کا مقصد ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک دستور اساسی تجویز کرنا تھا۔ کانگریس تو اس کمیشن سے بیزار تھی ہی۔ معتدل طبقہ نے جب دیکھا کہ حکومت نے اس کو بھی نظر انداز کیا ہے تو وہ بھی مخالف ہو گیا۔ مسلمانوں کے جتنے خطاب یافتہ خود ساختہ 'لیڈر' تھے وہ تو اس کمیشن کے ساتھ مل کر کے کام کرنا فرض سمجھتے تھے لیکن بعض قوم پرست مسلمان بھی ہندوؤں سے اتنے دل برداشتہ تھے کہ اس کمیشن سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

سر محمد شفیع سرکاری پارٹی کے سرگروہ تھے۔ اتفاق سے اس سال ان کا انتخاب مسلم لیگ کی صدارت کے لیے ہوا تھا۔ مسٹر جناح جو لیگ کی کاؤنسل کے صدر تھے وہ کمیشن کے مخالف تھے۔ غرض ان دو صدروں میں مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس سال لیگ کے دو اجلاس ہوئے سر شفیع نے لاہور میں جلسہ کر کے کمیشن کی مخالفت کا ریزولیوشن پاس کرایا۔ کلکتہ میں محمد علی کی کوشش سے کمیشن کی مخالفت کی تجویز پاس ہوئی اور چودہ نکات جن میں بہت سی شرطوں کے ساتھ مخلوط انتخاب کی حمایت تھی منظور ہو گئے۔ محمد علی نے کمیشن کی مخالفت میں تقریریں کیں، مضامین لکھے اور ہر طرح بائیکاٹ کو کامیاب بنانے میں مدد دی۔

نہرو رپورٹ

سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے وقت جو تھوڑا بہت اتفاق رائے اور اتحاد عمل ہندوؤں اور مسلمانوں میں قائم ہوا تھا وہ نہرو رپورٹ نے بالکل ہی ختم کر دیا۔ لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستانیوں کو چیلنج دیا تھا کہ اگر ان میں اتنی قابلیت ہو تو ایک دستور اساسی بنا کر دکھائیں۔ اس کے جواب میں بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی گئی جس نے ایک کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں بنا دی تا کہ وہ ہندوستان کے لیے ایک دستور اساسی تیار کرے۔

اگست 1928 میں لکھنؤ میں یہ رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں پیش کی گئی۔ محمد علی اس وقت علاج کے لیے یورپ گئے ہوئے تھے۔ شوکت علی شریک جلسہ تھے۔

رپورٹ میں 'حکومت بہ طرز نوآبادیات' (ڈومینین اسٹیٹس) کے اصول پر دستور اساسی تیار کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو یہ شکایت تھی کہ ان کے پورے 'چودہ نکات' اس میں نہیں رکھے گئے۔ حسرت موہانی اور شوکت صاحب نے رپورٹ سے اختلاف کیا مگر وہ بہ کثرت رائے پاس ہوگئی۔ محمد علی جب اپنے علاج کو بیچ میں چھوڑ کر ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے بھی اس رپوٹ کی مخالفت کی۔ عام مسلمان رپورٹ سے ناراض تھے مگر ایک معقول تعداد قوم پروروں کی اس کی حامی تھی۔

نہرو رپورٹ کے شائع ہوتے ہی نااتفاقی اور فرقہ وارانہ مخالفتوں کا بازار گرم ہوگیا۔ کانگریس نے رپورٹ کو منظور کرلیا۔ اس سے محمد علی اور بھی بددل ہوگئے۔ قومی کنونشن میں مخالفت کی مگر وہاں بھی ناکامی ہوئی۔ محمد علی کی مخالفت دو وجوہ پر مبنی تھی۔ ایک تو یہ کہ رپورٹ میں مکمل آزادی کا نصب العین بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے مطالبات منظور نہیں کیے گئے تھے۔

اس وقت محمد علی نے ایک دردناک بیان شائع کیا جس میں کانگریس سے اپنے اختلافات کی وجوہ کو بیان کیا۔ خواہ کانگریس کا ساتھ چھوڑنے میں محمد علی حق بجانب ہوں یا نہ ہوں یہ بیان پڑھنے کے بعد ان کے خلوص سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

مسلم کانفرنس

دل برداشتہ اور مایوس انسان کہاں سے کہاں پہنچتا ہے۔ کانگریس کو چھوڑ کر محمد علی آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شریک ہوئے جو آغا خان کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ قوم پرست مسلمانوں نے اس میں شرکت سے انکار کر دیا تھا اور یہ ظاہر تھا کہ صدر اور اراکین کانفرنس کی اکثریت محمد علی کے تخیل مکمل آزادی سے کوسوں دور ہیں۔

سر شفیع مرحوم اس کے روح رواں تھے اور لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ یہ دونوں جو آج تک ایک دوسرے کے شدید سیاسی مخالف تھے، آج ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہیں۔ کانفرنس کے اراکین نے محمد علی کو شریک کرنے کے لیے یہ طے کیا کہ کانفرنس اپنا سیاسی نصب العین مقرر نہ کرے تاکہ ہر جماعت کو اختیار رہے کہ وہ اپنے اپنے نصب العین پر قائم رہے مگر مسلمانوں کے

حقوق کی حفاظت کے لیے سب جماعتیں ساتھ کام کریں۔ سر محمد شفیع نے اصل تجویز پیش کی جس میں مسلمانوں کے مطالب بیان کیے گئے تھے اور یہ اعلان تھا کہ جب تک یہ منظور نہ کیے جائیں مسلمان کسی دستور اساسی کو قبول نہ کریں گے۔

محمد علی نے اس موقع پر اس ریزولیوشن کی تائید میں جو تقریر کی اس کا ایک حصہ قابل ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے ان کے دل میں اب بھی اتحاد کا جذبہ کس زور شور سے موجود تھا۔ آپ نے فرمایا:

> ''میں انگریزی حکومت سے بیزار ہوں۔ میں دوسروں کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میرے ہم خیال بن جائیں۔ میں تو انگریزی حکومت سے اس قدر بیزار ہوں کہ اگر مجھے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہندوؤں کی غلامی قبول کرنی پڑے تو میں اسے قبول کرلوں گا......میں نے ابھی تک صلح کا دروازہ بند نہیں کیا ہے۔ میں صلح کو پسند کرتا ہوں اور امن واتحاد کا حامی ہوں۔''

گول میز کانفرنس

کیا وجوہ تھے جن کی بنا پر محمد علی جیسے شخص نے جو مکمل آزادی کے حامی تھے۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت کو منظور کرلیا؟ یہ بحث اب بے کار ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ باوجود شدید علالت کے محمد علی نے یہ طول طویل سفر قوم اور ملک کی خدمت کے لیے اختیار کیا۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ شیر مرد اپنے آخری سفر پر روانہ ہو رہا ہے۔

انگلستان جا کر محمد علی نے ہندو اور مسلمان نمائندوں کے درمیان مصالحت کی پوری کوششیں کیں تاکہ کم سے کم دیار غیر میں تو آپس کی رقابتوں کا راز نہ کھلے۔ مگر یہاں مسلمان نمائندے چن چن کر ایسے بھیجے گئے تھے جو کسی طرح مصالحت پر آمادہ نہ ہوں۔ ادھر ہندو بھی ہٹ دھرمی پر تلے ہوئے تھے۔ ایک کا ایمان اگر فرقہ وارانہ نیابت تھی تو دوسرے کا دھرم مشترکہ انتخاب۔ بہر حال باوجود شدید علالت اور نقاہت کے محمد علی نے ایک ایسی تجویز تیار کی تھی کہ اگر فرشتۂ موت نے مہلت دی ہوتی تو خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سب کو اس تجویز پر متفق کرانے میں کامیاب ہو جاتے۔

تاریخی تقریر

گول میز کانفرنس میں انھوں نے وہ زبردست تقریر جس نے دوملکوں کو ہلا دیا ایسی بے دھڑک آزاد تقریر، کبھی گول میز کانفرنس میں کاہے کو سنی گئی تھی۔ محمد علی کی خطابت ان کا پاکیزہ مذاق، زبان کی سلاست اور روانی خیالات کا زور اور جوش اور سب سے بڑھ کر سچے قومی جذبات کی بے باکانہ نمائندگی، یہ ایسی چیزیں تھیں کہ وہ تقریر ہندوستان اور انگلستان کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ وہ تقریر جس وقت ہندوستان کے اخباروں میں شائع ہوئی تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ مخالفوں کی مخالفت ہوا ہو گئی اور ان قومی اخباروں نے جو آج تک محمد علی کا مذاق اڑا رہے تھے اس کی تعریف میں کالم کے کالم رنگ ڈالے۔

اس تقریر کا ایک حصہ تو ایسا ہے کہ وہ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں سونے کے الفاظ سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ انگریز اور ہندوستانی نمائندوں کے اس بھرے مجمع میں آپ نے فرمایا:

> ''میں آپ سے درجۂ مستعمرات لینے نہیں آیا' میں مکمل آزادی کے عقیدے کا پابند ہوں۔
>
> آج جس مقصد کے لیے یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو واپس جاؤں تو آزادی کا منشور میرے ہاتھ میں ہو۔ میں غلام ملک میں لوٹ کر نہیں جاؤں گا۔ مجھے ایک غیر ملک میں جسے آزادی کا شرف حاصل ہے، غربت کی موت منظور ہے اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو مجھے یہاں قبر کے لیے جگہ دینی پڑے گی۔''

محمد علی قول کا دھنی تھا۔ اس نے جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔ بیمار پہلے سے تھے۔ سفر کی صعوبت، ڈاکٹروں کی سخت ممانعت کے باوجود فرقہ وارانہ مفاہمت کے لیے دوڑ دھوپ اور اس تقریر کی تکان سے حالت اور خطرناک ہو گئی۔ ان الفاظ کے ادا کرنے کے چند ہی دن بعد یہ جواں مرد اور جواں ہمت انسان اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

○

ایک جامع شخصیت

محمد علی جوہر کے بعد ہندوستان میں اور بہت سے ملک اور قوم کے فدائی اور لیڈر پیدا ہوں گے لیکن ایسی جامع شخصیت کا پیدا ہونا دشوار ہے جو ایک ہی وقت میں اسلام کا شیدا بھی ہو اور ملک کا عاشق بھی۔ شاعر بھی ہو اور نثار بھی، بذلہ سنج بھی ہو اور حق گو بھی، جس کا عزم اور استقلال پہاڑ سے ٹکر کھائے اور جس کی نرم اور شیریں گفتگو میں آب رواں کا لطف آئے۔ جس کی دوستی خلوص کی تصویر اور دشمنی شرافت کا مرقع ہو، جس کی اصول پرستی مسلم اور رواداری مشہور ہو۔

محمد علی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مفصل بحث خود ایک کتاب کی محتاج ہے۔ اس لیے یہاں مختصراً ان کی چند ممتاز خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

دلیری اور حق گوئی

موجودہ زمانے میں سیاست اسی کا نام ہے کہ سچی بات نہ کہی جائے یا اگر کہی جائے تو اس طرح گول گول اور مبہم الفاظ میں کہ اس کا تمام اثر زائل ہو جائے۔ مگر محمد علی نے عمر بھر انتہا درجہ کی دلیری اور حق گوئی کا ثبوت دیا۔ جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے اس کے کہنے میں دوست اور دشمن، حاکم، بادشاہ کسی سے نہ جھجکتے تھے۔ اکثر لیڈر ایسے مجمعوں سے بہت گھبراتے ہیں جہاں اکثریت ان کی مخالف ہو۔ رائے عامہ کے سیلاب کے ساتھ ساتھ بہنا آسان ہے۔ اس کے دھارے پر چڑھنا مشکل۔ مگر محمد علی کبھی کسی مجمع سے نہیں دبے۔ ہندوستان کے عوام کا ہو یا انگلستان کے دارالعلوم کا مؤتمر اسلامی میں ابن سعود کو اس کے منہ پر ایسی کھری کھری سنائیں کہ لوگ ان کی بیباکی پر دنگ رہ گئے۔

ایک دفعہ وائسرائے کے پاس مسلمانوں کا ایک وفد لے کر گئے۔ لارڈ ارون نے ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ محمد علی نے اسی وقت ان سے کہا کہ 'اب ہماری آپ کی جنگ ہوگی صلح و سلام کا خاتمہ ہے۔' اور جب وائسرائے نے کہا کہ '' مجھے امید ہے آپ کی جنگ آئینی اور قانون کی حدود میں ہوگی'' تو آپ نے فوراً جواب دیا:

'' خدائی قانون کی اطاعت میرا اولین فرض ہے اور اسی کی اطاعت میں کروں گا۔ اگر اس کی بجا آوری میں لارڈ ارون کی حکومت کے قوانین مانع آتے ہیں تو مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔''

اسلام کا سپاہی

محمد علی کی زندگی کے دورِ آخر میں ان پر مذہبیت کا رنگ بہت غالب تھا۔ اگرچہ انھوں نے انگریزی تعلیم پائی تھی لیکن طالب علمی کے بعد اپنے شوق سے اسلامی فلسفہ، فقہ اور ادب کا کافی مطالعہ کیا تھا اور جتنا زیادہ انھوں نے اپنے مذہب کا مطالعہ اور اس پر غور کیا اتنا ہی وہ اسلام کی سچائی اور عظمت کے قائل ہوتے گئے۔ اسلام اور مسلمانوں سے ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ تمام دنیا میں کسی جگہ مسلمانوں پر کوئی آفت یا مصیبت آئی اور وہ ان کی حمایت کو کھڑے ہو گئے۔

محمد علی ہمیشہ فخر سے کہتے تھے کہ میں اسلام کا سپاہی ہوں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ حسنِ لیاقت اور جواں مردی سے وہ اسلام کی عظمت و شوکت، عزت و حرمت کے لیے لڑتے رہے۔ وہ اسلام کے ایک سچے سپاہی کی شان تھے۔

تحریک خلافت کا مقصد یہی تھا کہ اسلامی دنیا کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے اور اسلام کی عظمت و وقار کو صدمہ نہ پہنچے۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں انھوں نے کیا کچھ قربانیاں نہیں کیں۔ نظر بند رہے، جیل گئے، مالی مشکلات برداشت کیں، چین اور آرام اپنے پر حرام کر لیا مگر جب تک دم میں دم رہا اسلام کی خدمت سے منہ نہ موڑا۔

ملک بھر میں جہاں کوئی تحریک مسلمانوں کی بہبودی کے لیے شروع ہوتی تھی وہ اس کی امداد میں دامے درمے سخنے کسی طرح دریغ نہ کرتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے لیے انھوں نے کیا کچھ کوششیں نہ کیں لیکن جب ان کو یقین ہو گیا کہ اس کالج کا وجود مسلمانوں کے لیے مفید نہیں بلکہ

مضر ہے تو اسے چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی تا کہ مسلمان اصل معنوں میں آزاد قومی اور ملی تعلیم حاصل کر سکیں اور اس نئے ادارے کے استحکام اور ترقی کی وہ مرتے دم تک کوشش کرتے رہے۔

مسئلہ حجاز میں جب تک وہ یہ سمجھتے رہے کہ ابن سعود کی امارت اسلام کے لیے فائدہ مند ہوگی وہ اس کی حمایت میں کمر بستہ رہے۔ گو انھیں اپنے دیرینہ دوستوں اور رفیقوں کی مخالفت برداشت کرنی پڑی لیکن جب حجاز جا کر ان کو یقین ہو گیا کہ ابن سعود اسلامی جمہوریت کے بجائے اپنی خاندانی بادشاہت قائم کر رہا ہے تو ان کو بھرے جلسہ میں ابن سعود کی مخالفت کرنے میں کوئی تکلف نہ ہوا۔

اسلام کے متعلق محمد علی کا جو نظریہ تھا وہ انھوں نے خود اپنی گول میز کانفرنس والی تقریر میں بیان کیا تھا۔

"مذہب صرف عقیدے اور رسم کا نام نہیں ہے۔ میرے نزدیک مذہب زندگی کے حقائق کا ترجمان ہے۔ مجھے اسلام کے صدقے میں تہذیب، معاشرتی نظام اور زندگی کا امید افزا مستقبل حاصل ہے۔ اسلام ان تمام باتوں کا مکمل مجموعہ ہے جہاں خدا کے حکم کا سوال ہو وہاں میں پہلے مسلمان ہوں اور آخر تک مسلمان رہوں گا...... میرا پہلا فرض یہ ہے کہ میں اپنے خدا کا حکم مانوں نہ کہ ملکِ معظم کا۔"

قوم پرست

ہندوستان کے موجودہ دور کے مورّخ کو منجملہ اور سوالوں کے اس سوال کا بھی جواب دینا ہوگا کہ آیا محمد علی حقیقی معنوں میں قوم پرست تھے یا نہیں اور اگر وہ مورّخ غیر متعصبانہ نظر سے محمد علی کی سیرت کا مطالعہ کرے گا تو اس کو بھی یہی جواب دینا ہوگا کہ قوم پرست ہوں یا نہ ہوں قوم پرور اور قومی خادم ضرور تھے۔ محمد علی 'قوم پرستی' کے قائل نہ تھے یعنی وہ یورپ کے قوم پرستوں کی طرح قوم کو دیوتا بنا کر پوجنے کے خلاف تھے۔ طبعیتاً وہ بین الاقوامیت کے قائل تھے اور جغرافی حدود کے پابند ہونے سے انکار کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ 'قوم پرستی' کا جنون ترقی پانے پر کس طرح دنیا کے امن اور ترقی میں حارج ہوتا ہے۔ جنگیں 'قوم پرستی' کے نام پر لڑی جاتی ہیں اور ہزاروں بلکہ لاکھوں کا خون اس دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ پھر وہ فطرتاً ایک مذہبی انسان واقع ہوئے تھے اور وہ اس مذہب کے شیدائی تھے جو تمام عالم کو ایک نظر سے دیکھتا ہے، جس میں جغرافی

حدود اور سیاسی تقسیم کوئی معنی نہیں رکھتیں، جو حقیقی معنوں میں ایک بین الاقوامی مذہب ہے۔ محمد علی نے اپنے اس نظریہ کو اپنی گول میز کانفرنس والی تقریر میں نہایت خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا تھا:

''میں کہتا ہوں کہ خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے قوموں کو۔ قوم پرستی انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے لیکن مذہب انسانوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہے۔''

ایک موقع پر انھوں نے فرمایا: ''اسلام وطن پرور ہے، وطن پرست نہیں۔''

اور یہی حقیقت میں محمد علی کا مسلک تھا۔ باوجود قومیت کے تنگ نظریہ کے مخالف ہونے کے وہ اپنے وطن کی سچی محبت رکھتے تھے اور اس کی خدمت کو وہ اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔ اس کی آزادی کے لیے وہ برابر کوشاں رہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ اگر امیر کابل ہندوستان پر حملہ آور ہوں تو آپ کا کیا فرض ہوگا تو آپ نے فرمایا: ''میں ان کے خلاف صف آرا ہو کر ان کا مقابلہ کروں گا۔ اور اپنے عزیز وطن کو کسی غیر کا غلام نہ ہونے دوں گا۔''

وطن سے ان کی محبت آخر وقت تک قائم رہی اور ہندوستان کی آزادی کے لیے انھوں نے کبھی کوشش اور قربانی سے دریغ نہ کیا۔ یہاں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب 1927 کی کانگریس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنا 'مکمل آزادی' کا ریزولیوشن پاس کرانا چاہا تو یہ محمد علی ہی تھے جنھوں نے اس تجویز کی پرزور موافقت کی تھی۔

اپنی عمر کے آخری حصہ میں وہ کانگریس سے علیحدہ ہو کر مسلمانوں کی تنظیم میں مصروف رہے تھے اور لوگوں کا خیال ہو چلا تھا کہ محمد علی بھی اور فرقہ پرستوں کی طرح اب قوم پرور نہیں رہے لیکن گول میز کانفرنس میں اپنی ولولہ انگیز تقریر سے انھوں نے ثابت کر دیا کہ مرتے دم تک ان کا دل وطن پرستی کے جذبہ سے معمور تھا۔

شاعر

بہت کم لوگ محمد علی کی شاعری سے واقف ہیں۔ ان کی سیاسی اور قومی شخصیت اس قدر زبردست تھی کہ کسی کو خیال بھی نہ گزرتا تھا کہ یہ شخص جو ملک و قوم کی خدمت میں ان تھک کوششیں کرتا ہے، یہ ایک شاعر کی نظر اور شاعر کا دل بھی رکھتا ہے۔ فن کے نقطۂ نظر سے محمد علی اردو شعرا کی صف اول میں جگہ نہیں پاسکتے۔ ممکن ہے کہ ان کی شاعری اور ترقی کرتی، اگر وہ پورے انہماک سے اس میں دلچسپی لیتے

لیکن ان کا مستقل کام شاعری نہیں بلکہ قومی خدمت تھا۔ کبھی کبھی فرصت میں شعر کہہ لیتے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے شعروں میں ایک خاص درد اور سوز ہوتا تھا جو سننے والوں پر اثر کیے بغیر نہ رہتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ محمد علی جوہر کے شعر ان کے دل کی آواز ہوتے تھے۔ بقول مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی:

''جوہر کی شاعری ان کے قلب کی زبان، ان کے جذبات کی ترجمان اور ان کے واردات کا بیان ہے آورد، تصنع اور تکلف کا ان کے ہاں گزر نہیں۔''

مثال کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لیے ہے	پر غیب سے سامانِ بقا میرے لیے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؑ ابن علیؑ کو	خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے	یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف	کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے
گلہ اے دل ابھی سے کرتا ہے	عشق کا دم اسی پہ بھرتا ہے
جان دیتا ہے عیشِ فانی پر	بس اسی زندگی پہ مرتا ہے
جس کو دنیا نے نامراد کہا	وہی ناکام کام کرتا ہے

اخبار نویس

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محمد علی اخبار نویسی کے لیے بنائے گئے تھے اور یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے انگریزی اور اردو اخبار نویسی میں وہ کامیابی حاصل کی جو ہندوستان میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو۔ جس وقت 'کامریڈ' نکلا تو کس کو امید تھی کہ تھوڑے ہی دن میں اس نوجوان صحافی کا پرچہ اس قدر مقبول عام ہو جائے گا کہ وائسرائے سے لے کر قوم پرست رہنما تک سب اس کی اشاعت کے منتظر رہا کریں گے۔

اس زمانے کے اخبار نویسوں کی طرح محمد علی بھی بے حد زود نویس اور طول پسند واقع ہوئے تھے لیکن ان کا اندازِ بیان اتنا دلچسپ ہوتا تھا کہ ان کے لمبے مضامین کا پڑھنا گراں نہ گزرتا تھا اور مزاحیہ نگاری کی تو گویا انھوں نے ہندوستان میں بنیاد ڈالی تھی۔ 'گپ' کے کالم پڑھنے والوں کو اس پر لندن کے 'پنچ' کا دھوکا ہوتا تھا۔

اردو صحافت میں انھوں نے 'ہمدرد' نکال کر ایک بیش بہا اضافہ کیا۔ اس وقت تک اردو روزناموں

میں سوائے انگریزی اخبار کے غلط تراجم کے کچھ نہ ہوتا تھا اور یہ 'ہمدرد' ہی تھا کہ اس نے ایسا اعلیٰ معیار صحافت قائم کیا جو اکثر انگریزی اخباروں کو بھی نصیب نہ تھا۔ 'کامریڈ' اور 'ہمدرد' دونوں میں محمد علی نے چن چن کر قابل شریک کار رکھے، جنھوں نے محمد علی کی نگرانی میں دونوں اخباروں کو مشہور و ممتاز بنا دیا اگرچہ بعد میں سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے محمد علی صحافت کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے لیکن پھر بھی 'ہمدرد' اور 'کامریڈ' نے اپنے زمانے میں اتنی قابل قدر خدمت انجام دیں کہ ان کے نام ہندوستانی صحافت کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

ایک دلچسپ انسان

محمد علی فقط ایک دلیر قومی لیڈر، ایک قابل ادیب و اخبار نویس اور ایک عمدہ شاعر ہی نہیں تھے۔ ان سب خصوصیات سے بڑھ کر ان کی بذلہ سنجی تھی۔ وہ ایک دلچسپ انسان تھے۔ وہ بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اپنی ظرافت طبع اور شوخی کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ حاضر جوابی میں کمال رکھتے تھے، حاضر جوابی بھی کیسی؟ پھکڑ اور فضول گوئی نہیں بلکہ نہایت ستھرا اور پاکیزہ مذاق۔

اگر محمد علی کی زندگی کے دلچسپ لطیفے جمع کیے جائیں تو اس سے زیادہ ضخامت کی کتاب مرتب ہوسکتی ہے۔ لہٰذا دو دلچسپ لطائف پر اکتفا کی جاتی ہے۔

محمد علی ہمیشہ اسمبلی میں داخلہ کے خلاف رہے لیکن کبھی کبھی بحیثیت 'ہمدرد' کے نمائندے کے پریس گیلری میں چلے جاتے تھے۔ ایک بار وہ اوپر بیٹھے تھے کہ نیچے سے ان کے ایک کانگریسی دوست نے مذاق میں کہا 'محمد علی جب یہاں تک آ گئے ہو تو دو قدم اور اتر کر ہمارے پاس ہی کیوں نہ آ جاؤ؟'

محمد علی نے فوراً جواب دیا:

'جی نہیں میں تو اس بلندی سے آپ کی پستی کا نظارہ دیکھ رہا ہوں۔'

'ہمدرد' کی ایک سالگرہ کے موقع پر محمد علی نے دہلی کے مشہور شہریوں اور اخبار نویسوں کی ایک پرتکلف دعوت کی۔ مہمانوں کی طرف سے شکریہ کی تقریر حکیم اجمل خاں مرحوم نے کی اور فرمایا: 'خدا کرے ایسی سال گرہ ہر تیسرے مہینے ہوا کرے' اس پر محمد علی نے برجستہ کہا: 'ضرور، مگر اخبار کا چندہ بھی اسی حساب سے وصول کیا جائے گا۔'

O

خروش چیف کیا چاہتا ہے؟

پہلا حصہ

ایک چہرہ

انسان کا چہرہ اس کی روح کا آئینہ ہوتا ہے

(روسی کہاوت)

پہلا ایڈیشن جولائی 1960

ناشران: مشورہ بک ڈپو، رام نگر، دہلی

یہ کتاب پہلی بار مشورہ بک ڈپو، رام نگر، گاندھی نگر، پوسٹ بکس 1635 دہلی سے جولائی 1960 میں شائع ہوئی

کالینو کے کسان کا لڑکا

اگر تم درد سے آشنا نہیں۔ تو مسرت سے بھی لطف اندوز نہ ہو سکو گے (روسی کہاوت)

شیشے کی اونچی کھڑکیوں کے اُس پار۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ برف بہت آہستہ اور خاموشی کے ساتھ گر رہی ہے۔ جیسے یہ کسی کے خواب کا دھندلکا ہو۔۔۔ اچانک باہر سڑک پر ہری بتیاں جگمگا اٹھیں اور اُن کے اوپر کریملن کے میناروں کے مشہور سرخ ستاروں میں جیسے زندگی کی لہر دوڑنے لگی۔

اندر کا آرام دہ کمرہ باوقار اور روزمرہ کے کام کاج کے لیے موزوں ہے دیوار پر محض ایک ہی تصویر آویزاں ہے، یہ لینن کی تصویر ہے جو بہت بڑی نہیں ہے۔ کمرے کے آخری سرے پر ایک بڑی میز ہے جس پر بہت سے کاغذ رکھے ہیں۔ اسی میز پر اسپوتنک کے دو ماڈل سجے ہوئے ہیں جو ٹیبل لیمپ کے ہرے شیڈ سے چھن کر آنے والی روشنی میں چمک رہے ہیں۔ میز پر سنگ مرمر کی ایک بھاری دوات رکھی ہے، اس کے پاس روسی زبان میں ایک تازہ چھپی کتاب پڑی ہے۔ کتاب پر لکھا ہے: "امریکہ کے آمنے سامنے۔" یہ محض صرف ایک کتاب ہے یا چیلنج؟۔

ہری مخمل سے ڈھکے لمبے کانفرنس ٹیبل کے اس پار سے نکیتا خروشچیف اپنے فکریہ لہجے میں بات کر رہے ہیں۔ ان کے لہجے میں وہ روانی نہیں جو کسی عام جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ان کے ہاں اکثر پائی جاتی ہے۔ اس کے باوجود بات چیت کے دوران میں نہ تو وہ الفاظ کی کمی

محسوس کر رہے ہیں اور نہ ہی کسی ڈپلومیٹک ڈھنگ سے ناپسندیدہ سوالوں سے پیچھا چھڑا رہے ہیں۔ روسی زبان سے میری واقفیت محدود ہی ہے۔ اس لیے میں ہی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ میرے سوال کے جواب میں وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جواب کے لیے مجھے ترجمان کے صحیح انگریزی ترجمے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

مترجم ایک چست نوجوان ہے۔ اس کے تلفظ میں آکسفورڈ کا لہجہ ہے اور میز کے سرے پر ہم دونوں کے درمیان ایک ثالث کی حیثیت سے بیٹھا ہے۔

میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے چہرے کا جائزہ لے رہا ہوں۔ ایک ایسا چہرہ جس سے اس ملک کے کروڑوں عوام محبت کرتے ہیں۔ ایک ایسا چہرہ جو دنیا کے لاکھوں لوگوں کے لیے اچنبھا اور ایک پہیلی ہے۔ جو کئی بار دنیا کے لوگوں کو انگیخت کرتا ہے اور شاید اب بھی یورپ اور امریکہ کے کئی سیاست دانوں کے خوابوں میں ایسا بھوت بن کر خلل انداز ہوتا ہے جس کا ذکر مارکس نے 'کمیونسٹ مینی فیسٹو' میں کیا تھا۔ اس سیدھے سادھے چہرے کی بے لوث سادگی کے پیچھے کون سے ارادے اور کیسے منصوبے چھپے ہوئے ہیں؟ اس گول سے چہرے کی گہری لکیریں کون سے تجربوں کی مرہون منت ہیں، ان بھاری پپوٹوں کے پیچھے تھرکنے والی آنکھوں کی پتلیوں نے اپنی چھیاسٹھ سالہ زندگی میں کیا کچھ دیکھا ہے؟ ان آنکھوں کی نیلگوں گہرائی میں کون سے نظارے پوشیدہ ہیں؟ یہ کہاں سے آیا اور کہاں جا رہا ہے؟ اپنے ملک کے عوام کی زندگی میں یہ شخص کیا رول ادا کر رہا ہے اور کیا رول ادا کرے گا؟ زندگی کے زینے پر اس شخص کی ترقی کو دنیا کے لوگ کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ اس کی طاقت اور مقبولیت کے ذرائع کیا ہیں؟ اس مشہور گنجے سر کے نیچے کیسے خیالات گھومتے رہتے ہیں؟ وہ کون سے نظریے ہیں جو اس کے عمل کو قوت دیتے ہیں؟ اور اسے ہمیشہ مصروف رکھتے ہیں — جیسا کہ امریکہ میں اکثر کہا جاتا ہے۔ یہ وہ چونسٹھ کروڑ ڈالر والا سوال ہے جو دنیا بار بار اس موقعہ پر پوچھ رہی ہے —

نکیتا خروش چیف کے والد کا نام سرگی خروش چیف تھا نکیتا خروش چیف سوویت روس کے وزراء کی کونسل کے صدر ہیں اور سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے پہلے سکریٹری ہیں۔ اس

دو ہرے عہدہ سے وہ اپنے ملک کے سب سے زیادہ طاقتور شخص ہیں اور دنیا کے ایک اہم ترین انسان ہیں۔ آج سے 66 سال پہلے آپ روس اور یوکرین کی سرحد پر ایک گاؤں کالینووکا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد ایک غریب کسان تھے جو سردی کے موسم میں کوئلے کی کانوں میں محنت مزدوری کیا کرتے تھے۔ لڑکپن میں آپ سُوروں اور بھیڑوں کے ریوڑ چرایا کرتے تھے۔ پھٹے پرانے بوسیدہ کپڑے پہنتے تھے اور ننگے پاؤں گھومتے تھے۔

آج وہ چاہیں تو محض ایک بٹن دبا کے خلا کے راستے چاند تک یا بحرالکاہل کے کسی نشانے پر راکٹ بھیج سکتے ہیں۔ ایک دستخط سے وہ اپنی مسلح فوجوں کے لاکھوں افسروں اور سپاہیوں کو برطرف کر سکتے ہیں اور دوسرے دستخط سے ان افسروں اور سپاہیوں کو دوسری نوعیت کے کام مہیا کر سکتے ہیں۔ اس کے باوجود نکیتا خروش چیف کے دادا جان غریب کسان تھے جنھیں ان کے جاگیردار مالک حسب منشا خرید و فروخت کر سکتے تھے۔

> '' ہماری حکومت میں محنت کش طبقہ کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ امریکہ سے روانہ ہوتے وقت ٹیلی ویژن پر تقریر کرتے ہوئے خروش چیف نے یہ بات کہی تھی۔ میں آپ لوگوں کو اپنے بارے میں بتاتا ہوں۔ میرے دادا جان ایک ان پڑھ کسان تھے۔ وہ جاگیردار کے غلام تھے۔ جنھیں کسی وقت بھی فروخت کیا جاسکتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک کتے سے ان کا تبادلہ کیا جاسکتا تھا۔
>
> میرے والد کوئلے کی کان میں کام کرنے والے ایک مزدور تھے۔ خود میں نے بھی کوئلے کی ایک کان میں کام کیا تھا۔ میں نے اپنے ملک کی خانہ جنگی میں حصہ لیا۔ اس کے بعد سوویت حکومت نے مجھے مزدوروں کے اسکول میں اور بعدازاں صنعتی اکادمی میں تربیت کے لیے بھیجا— اور اب میرے ملک کے عوام نے مجھے وزراء کی کونسل کے صدر کی ذمہ داری سونپی ہے۔''

ہالی ووڈ میں بیسویں سنچری فاکس کے اسٹوڈیوز میں اسپائیروز پی سکیوراس نے سرمایہ دارانہ نظام کی شان میں قصیدے پڑھتے ہوئے کہا کہ اس نے 12 سال کی عمر میں کام کرنا شروع کیا تھا

اور آج وہ امریکہ کی ایک بہت بڑی کارپوریشن کا صدر ہے۔''اس بات کا اثر تو ضرور پڑتا ہے۔''
خروش چیف نے اپنی تقریر میں کیور اس کو جواب دیتے ہوئے کہا۔''لیکن اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ آپ جاننا چاہتے ہیں کہ میں کیا تھا؟ میں نے اس وقت کام کرنا شروع کیا جب میں نے بمشکل چلنا سیکھا تھا۔15 سال کی عمر تک میں بھیڑ بکریاں اور جاگیرداروں کی گائیں چراتا رہا۔ اس کے بعد میں نے ایک ایسے کارخانے میں کام کیا جس کے مالکان جرمن تھے۔ بعد ازاں میں نے ایک کان میں کام کرنا شروع کیا۔ جو فرانسیسیوں کی ملکیت تھی۔ میں نے دواؤں کے ایک پلانٹ میں بھی کام کیا۔ جو بلجیم کے سرمایہ داروں کی ملکیت تھی اور آج عظیم سوویت روس کا وزیر اعظم ہوں۔''اور تالیوں کی آواز میں جب کسی نے چلا کر کہا۔'یہ سب ہمیں معلوم تھا' تو خروش چیف نے فوراً جواب دیا۔ تو کیا ہوا؟ میں اپنے ماضی پر شرمندہ نہیں ہوں۔ کسی بھی قسم کی ایماندارانہ محنت عزت کے قابل ہے۔ کام کبھی بھی گندہ نہیں ہو سکتا محض ذہنی شعور اسے ایسا بنا دیتا ہے۔'

خروش چیف کو اپنے پرولتاری آغاز پر فخر ہے۔ اسی لیے اسے دوسرے ملکوں کے ہم پلہ سیاست دانوں کے مقابلہ پہ ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ صدر آئزن ہاور ایک ایسے امیر کاشتکار کے بیٹے تھے جس کی اپنی زمین تھی۔ انھوں نے ایک پبلک اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی اور ابتدائی عمر سے انھیں افسر بننے کی تربیت دی گئی تھی۔ میکملن کے والد برطانیہ کے ایک بہت بڑے امیر ناشر تھے اور انھوں نے اپنے بیٹے کو ایٹن اور آکسفورڈ میں اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ ڈیگال کے والد رؤسا کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اعلیٰ فوجی افسر کی تربیت حاصل کرنے کے بعد آج تک یہ ان کا پیشہ رہا ہے۔ جواہر لال نہرو کے والد بہت امیر وکیل تھے۔ اپنی سوانح حیات میں پنڈت نہرو نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ کس طرح اپنے طبقہ سے ناطہ توڑ کر آپ سوشلزم کی راہ تک آئے۔ کمیونسٹ لیڈروں میں بھی ماؤ زے تنگ پہلے استاد رہ چکے ہیں اور شاعری کرنے کے بعد انقلاب کی راہ پر آئے جبکہ چو این لائی امیر طبقہ سے آئے۔ آپ نے جرمنی میں تعلیم حاصل کی اور ایک ایسے دانشور ہیں جنھوں نے بعد ازاں مارکسزم کو اپنایا۔

خروش چیف کو پرولتاری طبقہ میں شامل ہونے کے لیے اپنے طبقہ سے ناطہ توڑنے کا مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ انھیں طبقاتی کش مکش کا سبق مارکس کی کتابوں سے نہیں سیکھنا پڑا۔ معاشیات

کے پہلے سبق انھوں نے اپنے گاؤں کی کڑی محنت اور زندگی سے حاصل کیے تھے۔

کرسک کا علاقہ جہاں کالینوکا کا گاؤں واقع ہے، بہت زرخیز ہے لیکن انقلاب سے پہلے اس علاقے میں کسان بہت غریب تھے۔ ان کسان کے پاس اپنی زمین نہیں تھی۔ وہ جاگیرداروں کی زمین پر کام کرتے تھے اور مزارعوں کے مقابلہ پر ان کی حالت قدرے بہتر تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں پچاس سالوں میں روسی کسانوں کی حالت زار کا ذکر کرتے ہوئے مشہور روسی ادیب سالٹی کوف شیشدرن نے لکھا ہے۔ 'اس بات میں کوئی شک نہیں کہ روسی کسان انتہائی مفلس ہے، افلاس کی ہر مشکل روسی کسان کی زندگی کا حصہ ہے۔'

خروش چیف کا کنبہ ان کسانوں میں سب سے غریب تھا۔ سردی کے موسم میں خروش چیف کے والد یوکرین کے علاقہ میں ڈونباس کی کانوں میں کام ڈھونڈنے جایا کرتے تھے۔ یہ کام بھی وہ پولیس سے ڈر کر کیا کرتے تھے کیونکہ زار کے زمانے میں کوئی بھی کسان اپنا گاؤں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔

خروش چیف کو شروع سے ہی اقتصادی ناہمواری کے تکلیف وحقائق سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ لڑکپن کی کچھ سردیاں انھوں نے مقامی پادری سے تعلیم حاصل کرنے میں صرف کیں لیکن گرمیوں میں انھیں بڑے جاگیرداروں کے مویشی چرا کر گھر کا کچھ بوجھ سنبھالنا پڑتا تھا۔ معاوضہ میں اپنی جو تھوڑی رقم ملتی تھی وہ سردیوں میں جوتوں کے ایک جوڑے یا ایک نئی قمیض کے لیے بھی ناکافی تھی خروش چیف نے اپنے گرد جاگیرداروں کی امیری اور کسانوں کی غریبی کا تضاد دیکھا اور حساس طبیعت کے باعث پوری شدت سے اس کا اثر محسوس کیا۔ سردیوں میں جاگیردار قیمتی گرم کھالیں پہنے برف کی گاڑیوں میں گھوما کرتے تھے جبکہ غریب کسان پرانے کپڑوں یا کاغذ کے ٹکڑوں میں اپنے پاؤں لپیٹ کر برف پر چلا کرتے تھے۔

طبقاتی شعور کا پہلا اظہار خروش چیف کے ان سوالوں سے ملتا ہے جو وہ اتوار کے دن گرجے کے اسکول میں اپنے پادری استاد سے پوچھا کرتے تھے۔ آپ پوچھا کرتے تھے کہ پادری کے بھڑکدار کپڑوں کی قیمت کیا ہے اور خود کو روسی عوام کا باپ کہنے والا زار اپنے بچوں کی حالت زار دیکھنے کے لیے کالینوکا کے گاؤں میں کیوں نہیں آتا ہے۔ ان سوالوں کے باوجود

پادری خروش چیف سے خوش تھا اور اس بات پر اکثر زور دیا کرتا تھا کہ خروش چیف کو تعلیم جاری رکھنی چاہیے لیکن گھر کے لوگوں کے پاس تعلیم جاری رکھنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اس لیے اپنے باپ کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اسے جاگیرداروں کی زمین پر مزدوری کرنے جانا پڑتا تھا۔

پندرہ سال کی عمر میں خروش چیف گاؤں چھوڑ کر ڈونباس میں کام کرنے چلے گئے اس پھیلی ہوئی دنیا میں یہ ان کا پہلا قدم تھا۔ ڈونباس کی کانوں سے آپ کیف جانے والے تھے۔ وہاں سے ماسکو اور پھر کچھ سالوں کے بعد آپ دنیا کے مختلف ملکوں کے دارالخلافوں — پیکنگ، لندن، واشنگٹن، دہلی اور جکارتا — جانے والے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے گاؤں کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا ہے جو آج ایک ترقی پذیر باہمی فارم کا مرکز ہے۔ خروش چیف کے دل میں آج بھی اپنے گاؤں کے لیے بے حد نازک احساس موجود ہے۔ اپنی چھٹیاں گذارنے کے لیے آپ اکثر وہاں جایا کرتے ہیں اور گاؤں کی حالت بہتر بنانے کے لیے اپنے پرانے ساتھیوں اور کسانوں کو نئی نئی تجویزیں پیش کیا کرتے ہیں۔

ماسکو میں 14 اور 15 جنوری کو سپریم سوویت کے اجلاس میں کالینووکا کے ایک سیدھے سادھے کسان وی۔ وی۔ گریچوف کی تقریر میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ جذبات سے بھرپور آواز میں اپنے گاؤں کے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا:

'پیارے نکیتا خروش چیف'

سمندر کے پار بہت دور امریکہ کا دیش ہے لیکن ہمارے اپنے ہاں صوبہ کرشک کے شمال مغرب میں کالینووکا کا چھوٹا سا گاؤں ہے آپ جب امریکہ میں تھے تو ہم ریڈیو پر آپ کا ہر لفظ سُنا کرتے تھے ہمیں اس بات کا فخر حاصل ہے کہ آپ نے پوری قوت آزادی کے ساتھ وہاں ہمارے مادر وطن اور مزدوروں اور کسانوں کے پرچم کو بلند رکھا۔ کیلی فورنیا میں ایک تقریر کے دوران آپ نے اپنے بچپن کا تذکرہ کیا۔ آپ کے گاؤں کے لوگ ریڈیو سے لگے بیٹھے ان باتوں کو سن رہے تھے۔ ہمیں وہ دن آج بھی یاد ہیں جب آپ بھیڑیں چرانے جایا کرتے تھے۔ ہمیں وہ دن بھی یاد ہیں جب آپ کانوں

میں کام کرنے تشریف لے گئے۔ آپ کے گاؤں کے ساتھی آپ پر فخر کرتے ہیں......

گریچوف نے اپنی تقریر میں خروش چیف کے اس دورے کا بھی ذکر کیا جب 1953 میں آپ کالینووکا گئے تھے۔ آپ کی تجاویز پر عمل کرنے کے بعد گاؤں اب مزید ترقی کر چکا ہے۔ سیدھے سادھے کسان نے اپنے سیدھے سادھے دیہاتی لہجے میں 'بورژوا اقتصادی ماہرین' کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جو ماہرین اس شبہ میں مبتلا ہیں کہ ہم امریکہ کے مقابلہ پر ترقی نہیں کر سکتے۔ انھیں کالینووکا کے چھوٹے سے گاؤں میں ترقی کی رفتار کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہ ہماری سوویت ترقی کی رفتار ہے۔' گاؤں کی پیداوار کے جو اعداد و شمار انھوں نے پیش کیے۔ انھیں سن کر ہم حیران رہ گئے—

میرے خیال میں اس تقریر سے خروش چیف کی طاقت اور مقبولیت کے دونوں ذرائع کا ذکر ملتا ہے۔ وہ خود کو عوام کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس امر سے عوام کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ عوام سے ذاتی اور جذباتی رشتے کو آپ ہمیشہ برقرار رکھتے ہیں۔ آپ عوام میں محض نظریاتی دلچسپی نہیں لیتے بلکہ ذاتی اور عملی دلچسپی لیتے ہیں اور اس طرح عوام کو مزید محنت کے لیے اکساتے ہیں! اور عوام کو بھی اس بات کا یقین ہے کہ بہتر مستقبل اور کمیونزم کے حصول کا یہی ایک راستہ ہے۔

کالینووکا کے لوگوں کے لیے اور سوویت روس کے عوام کے لیے خروش چیف گاؤں کا ایک غریب لڑکا ہے جو آج دنیا میں ایک بہت بڑی حیثیت رکھتا ہے لیکن جس نے اپنے عوام کو فراموش نہیں کیا ہے بلکہ اعلیٰ فصل تیار کرنے کے لیے جس نے ہمیشہ کام میں حصہ لیا ہے۔

O

کان کن کے ہاتھ

''کبھی کبھی تلخی کو نگل کر مٹھاس اگلنا پڑتی ہے۔'' (روسی کہاوت)

انٹرویو چار بجے شروع ہوا تھا اور اب ساڑھے چار بجے ہیں۔ خروش چیف میرے دوسرے سوال کا جواب دے رہے ہیں۔ آواز بلند کیے بغیر خروش چیف آہستہ اور صاف لہجے میں دھیرے دھیرے جو کہہ رہے ہیں۔ ترجمان اس کے اہم نکات نوٹ کر رہا ہے۔ میں خروش چیف کے ہاتھوں کی جانب دیکھ رہا ہوں۔ جنھیں کسی خاص بات پر زور دینے کے لیے وہ کئی بار اٹھا لیتے ہیں۔ ان کا رنگ ان کے چہرے کی مانند نیم گلابی ہے لیکن مجھے یاد ہے کہ ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے محسوس کیا تھا کہ ان کی ہتھیلیاں سخت ہیں اور انگلیوں کے جوڑوں پر گانٹھیں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ ایک محنت کش کے ہاتھ ہیں ایک سپاہی کے ہاتھ ہیں۔ بھٹی میں کوئلہ جھونکنے والے ہاتھ ہیں۔ ایک بحری سپاہی اور ایک کان کن کے ہاتھ ہیں اور ماسکو کے ایک ہوٹل میں بال کاٹنے والے باربر سے میری جو گفتگو ہوئی تھی، مجھے وہ بھی یاد ہے۔

وہ حجام انگریزی کے چند الفاظ جانتا تھا اور روسی زبان سے میری واقفیت محض دو سو الفاظ تک محدود تھی۔ اس کے باوجود ہم ٹوٹی پھوٹی روسی انگریزی میں بات چیت کرتے رہے۔

''آپ کیا کام کرتے ہیں۔۔؟'' نائی نے میرے سر کے گنے چنے بالوں کو کاٹتے ہوئے پوچھے۔

''ادیب۔۔۔ میں نے روسی زبان کا لفظ استعمال کیا۔

''عراق سے آئے ہو — ؟''

''نہیں ہندوستان سے — ''

''اوہ — ہندوستان! بہت خوب — ایک بار میں نے ایک ہندوستانی ادیب کا ناول پڑھا تھا۔ کیا نام تھا اس کا — ؟ بھلا سا نام تھا — یاں یاد آیا — ٹیگور بہت اچھا ناول تھا۔''

''ٹیگور — بہت بڑا ادیب — آپ کے ٹالسٹائے کی طرح — ''

''ٹالسٹائے — آپ ہندوستان میں ٹالسٹائے کو پڑھتے ہیں؟''

''ہاں — ''

''اور مارکس — آپ کے لوگ مارکس پڑھتے ہیں — ؟''

''ہاں — ''

''لینن — اس کی کتابیں بھی آپ پڑھتے ہیں کیا — ؟''

''ہاں' بالکل — ''

''اور اسٹالین؟''

''کچھ زیادہ نہیں — ''

سامنے کے آئینے میں نائی کے چہرے کا عکس دکھائی دے رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ اسٹالن کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔

''خیر کوئی بات نہیں — '' وہ کہتا ہے — ''اسٹالین اچھا نہیں — ''

اور میں پوچھتا ہوں۔ ''اور خرو شچیف؟' خروش چیف کیسا ہے۔ ؟''

نائی خوش ہو جاتا ہے اور اس جوش مسرت میں وہ میرے سر کے پیچھے سے پہلے سے ہی کافی کٹ چکے بالوں کو ایک انچ اور اڑا دیتا ہے۔

''اوہ خروش چیف — کیا کمال کا آدمی ہے۔ ہماری مانند ایک محنت کش وہ محنت کش لوگوں کی زندگی کو پورا سمجھتا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ وہ خود ایک — شختور تھا — ؟''

''شخ تور؟ شخ تور؟'' اور پھر مجھے اچانک یاد آیا کہ اس کا مطلب کان کھودنے والا مزدور ہے۔

ڈونباس کی کانوں میں نوجوان خروش چیف کو پہلی بار سرمایہ داری کے کام کاج کا تجربہ حاصل ہوا۔ ان کی زندگی میں یہ تجربہ بیرونی سرمایہ داری سے وابستہ تھا کیونکہ یوکرین (بلکہ پورے روس) میں تمام کارخانے اور کانیں فرانسیسیوں، جرمنوں اور بلجیم کے صنعتی اداروں کی ملکیت تھے۔ طبقاتی شعور جو کالینووکا کے جاگیرداری ماحول میں دھندلا دھندلا موہوم اور کچا تھا ڈونباس کی کانوں میں کام کرنے سے پختہ اور مضبوط ہو گیا۔

''ہمارے مالک چاہتے ہیں کہ ہم کام زیادہ کریں اور کمائی کم۔ کئی سال کے بعد خروش چیف نے اس بات کو دہرایا۔'' میں جب بھی ایمل زولا EMILE ZOLA کا ناول جرمینل GERMINAL پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ فرانس کے بارے میں نہیں لکھ رہا تھا بلکہ اس کان کے متعلق لکھ رہا تھا جہاں میں اپنے والد کے ساتھ کام کیا کرتا تھا۔

فرانس اور روس میں مزدوروں کی حالت زار ایک جیسی تھی۔ بعد از اں جب میں نے سیاسی اقتصادیات کے لیکچر سننے شروع کیے تو ایک لیکچر میں پروفیسر نے سرمایہ داری نظام کے تحت معاوضے کی ادائیگی کے ڈھانچے اور مزدوروں کی کس مپرسی کا ذکر کیا اور میں نے محسوس کیا کہ کارل مارکس نے اس کان کو ضرور دیکھا ہوگا جہاں میں اپنے والد کے ساتھ کام کر چکا تھا۔''

دوسرے روسی لیڈروں کی طرف خروش چیف بھی اپنی زندگی کی تفصیلات کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ نوجوانی کے دنوں میں انھیں مالی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کانوں کارخانوں میں کام کرنے والے دوسرے مزدوروں کی زندگی ان سے مختلف نہیں تھی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ جب بھی وہ ان دنوں کا ذکر کرتے ہیں تو ایمل زولا EMILE ZOLA کے ناول جرمینل GERMINAL کا ذکر ضرور آتا ہے۔ جو فرانس کے کان مزدوروں کی زندگی کا ایک عظیم نمائندہ شاہکار ہے۔ اس ناول میں ضرور کوئی ایسی بات ہوگی جس کا خروش چیف کی زندگی پر اس قدر بھرپور اثر پڑا۔

کالینووکا کا نوجوان کیا اس طرح ڈونباس کی کانوں تک پیدل آیا تھا؟

''آسمان میں ایک ستارہ نہیں تھا۔ چاروں طرف ایک گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اکیلا شخص اس سڑک پر جا رہا تھا جو...... لیکن اس بے روزگار اور بے سہارا نوجوان کے ذہن میں محض ایک خیال گھوم رہا تھا......ایک امید...... کہ پو پھوٹتے ہی سردی کم ہو جائے گی...... نیچے ایک

دوسرے منظر نے اس کے پاؤں تھام لیے۔ ان کھڑکیوں سے کبھی کبھی روشنی جھلک رہی تھی اور دھیمی روشنی دینے والے پانچ چھ لیمپ لکڑی کے ایک سیاہ ڈھانچے سے لٹکے ہوئے جل رہے تھے— اور تاریکی اور دھوئیں کے غلاف میں چھپی ہوئی اس پراسرار جگہ سے محض ایک آواز آرہی تھی— بھاپ سے چلنے والے ایک انجن کی گہری اور لمبی آواز—

''اس وقت اس شخص کو محسوس ہوا کہ وہ کوئلے کی ایک کان کے قریب پہنچ چکا ہے......''

جس کان میں خروش چیف— باپ اور بیٹے— نے کام کیا (زولا ZOLA کے ناول کے ذکر یا اس کے باپ کے مانند) اس کے مالکان فرانسیسی تھے اور یہ نیا مزدور نکیتا ہوسکتا ہے جو ایک پرانے کان کن سے پوچھ رہا ہے۔

''آپ کی کمپنی بہت امیر ہے کیا— ؟''

بوڑھے شخص نے اپنے شانوں کو جنبش دی اور پھر اپنے شانوں کو جھکالیا جیسے ان پر سرمائے کا بوجھ گرا ہو۔

''امیر؟ سچ مچ۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں، کروڑوں کا بے حساب سرمایہ ہے۔ انیس کانیں ہیں۔ دس ہزار مزدور ہیں ایک دن میں پانچ ہزار ٹن کوئلہ نکلتا ہے.....ظاہر ہے اس میں تانبے کی ملاوٹ بھی ہے۔

خروش چیف نے ڈونباس کی کوئلہ کانوں کے اندر کیا ایسے ہی تجربے محسوس کیے تھے— ؟

جیسے کہ کنوئیں میں کسی نے پتھر پھینکا ہو...... ہمیشہ وہی ٹریمپ ٹریمپ کی آواز جبکہ ہر گروپ کے مزدور تھکے ہارے گھسٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اسے گلیوں سے زیادہ کان کی منزلوں اور راستوں کا بہتر علم ہوگیا۔ اب اسے بخوبی یہ علم تھا کہ کہاں گھومنا ہے، کہاں رکنا ہے، کہاں پانی سے بچنا ہے...... تین ہفتوں کے بعد کان کے تجربہ کار مزدوروں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ لوگ اسے اپنے کام میں مشاق اور ماہر سمجھنے لگے اور دھیرے دھیرے عادت ہو جانے کے بعد وہ خود بھی محض ایک مشین ہو کر رہ گیا۔

محنت اور تباہ حالی اور ایک کان مزدور کی مسلسل بے تحفظ زندگی سے اقتصادی حقائق کی چھان بین شروع ہوئی۔ طبقاتی تضاد کا شعور بڑھا— زولا کے اٹین ITIEMAN کے لیے شمالی فرانس کی کانوں میں اور نکیتا کے لیے ڈونباس کی کانوں میں!

"اس کے ذہن میں تو مختلف قسم کے خیالات ابھرتے رہے۔ایک طبقہ کے لوگ تباہ حال کیوں ہیں۔دوسرے خوشحال کیوں ہیں؟ کچھ لوگ دوسروں کی ایڑیوں تلے کیوں کچلے جاتے ہیں۔جب کہ انھیں اپنی حالت زار بدلنے کی کوئی بھی امید نہیں ہے؟"

اور اگر کبھی کسی بزرگ کان کن نے اسے یہ دلیل سنا کر تسلی دینے کی کوشش کی کہ "مالک اکثر چھٹے ہوئے بدمعاش ہوتے ہیں لیکن مالک لوگ ہمیشہ ایسے ہی ہوا کریں گے۔کیا یہ صحیح نہیں ہے؟ ان باتوں کے بارے میں مغز پچی کرنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں؟۔تو یہ دلیل سنتے ہی وہ غصے میں بھڑک کر جواب دیتا۔

"کیا؟ مزدور کو کیا سوچنے کا بھی حق حاصل نہیں ہے؟۔یہ بات تھی لیکن اب وہ وقت دور نہیں۔جب حالات بدلیں گے کیونکہ آج کل مزدور بھی ضرور سوچتا ہے......کان کے اندر مزدور جاگ رہا تھا۔زمین میں بیج کی مانند پھوٹ رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ ایک حسین صبح کو دنیا دیکھ لے گی کہ کھیتوں کے درمیان اچانک کیسا پودا ابھرا ہے۔ہاں لوگ آگے بڑھیں گے،لوگوں کی ایک پوری فوج جو انصاف کو بحال کرے گی......انقلاب آرہا تھا۔آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے۔سورج کی دھوپ میں انسانوں کی ایک عجیب فصل تیار ہو رہی تھی۔

روس کی سرحدوں کے پار، زار شاہی کے سرحدی فوجی دستوں کے قریب سے گزرتے ہوئے، خفیہ پولس کی نگاہوں سے بچتے ہوئے، جلاوطن لینن کی آواز آرہی تھی یہ آواز انقلاب کا پیغام تھی۔جو سوئیزرلینڈ سے ہوتی ہوئی پورا فاصلہ طے کرنے کے بعد ڈونباس کی کانوں تک پہنچ رہی تھی۔پورے روس میں انقلاب کی جو تحریک ابھری تھی 'ڈونباس کے کان کن اور فولاد کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور اس تحریک کا ہراول دستہ تھے۔خروش چیف کے نوجوان دل میں نئے خیالوں کی دھڑکن تھی۔ یوکرین کی بھٹیوں اور کانوں میں بہت سے ایسے مزدور تھے جو طبقاتی اور سیاسی طور پر باشعور تھے وہاں کمیونسٹ پارٹی کی سرگرم خفیہ تنظیمیں بھی تھیں۔وہاں ڈونباس کے مزدوروں میں خروش چیف کی سیاسی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا۔پرولتاری انقلابی آواز کو اس کی صاف نگاہی اور تجسس نے فوراً لبیک کہا اور فوراً بعد خفیہ انقلابی تحریک میں اس نے ایک 'ڈاکخانے' کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔احتجاجی کتابوں کی تقسیم ہونے لگی۔خفیہ انقلابی اخبار 'پراودا' PRAVDA غیر قانونی طور پر بٹنے لگا۔فرانسیسی مالک اور ان

کے روسی ایجنٹ ڈونباس کی کانوں اور فیکٹریوں میں اس امر کی پوری کوشش کر رہے تھے کہ دلیل یا دھمکی کے ذریعہ مزدوروں کو حالات سے مطمئن رکھا جائے۔ جیسا کہ اس سے پہلے فرانس میں کیا جاتا تھا۔

تم فوراً اس بات کا اقرار کرلو کہ تم باغیوں کے اشاروں پر ناچ رہے ہو۔ یہ ایک ایسی وبا ہے جس میں ہزاروں مزدور مبتلا ہیں...... میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ بہت بدل گئے ہو۔ تم لوگ جو پہلے ہمیشہ خاموش رہا کرتے تھے۔ تمھیں یہ بتایا گیا ہے کہ اب تم لوگوں کی باری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوگ اس مشہور انٹرنیشنل کے رکن بن رہے ہو جو سماج کا ڈھانچہ الٹنے والے غنڈوں کی تنظیم ہے—

لیکن کان مزدور—اور نکیتا خروش چیف—اب مالکوں کی باتیں نہیں سن رہے تھے۔ وہ اب ایک نئی آواز کی جانب متوجہ تھے۔ کان پر کان کے مزدوروں کا حق ہے، جیسے کہ سمندر پر مچھیروں کا حق ہے۔ جیسے کہ زمین پر کسان کا حق ملکیت ہے!

یہ ایک خطرناک سبق تھا اور اسے عوام تک پہنچانے کی سزا موت تھی اور کم سے کم سزا سائبیریا میں جلا وطنی تھی۔ ان تمام خطروں سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود نکیتا نے کان کا کام چھوڑ کر میکینک اور کان کے تالے مرمت کرنے کا کام سیکھا۔ تاکہ مختلف کانوں کے دہانوں اور فولاد کے کارخانوں میں مرمّت کے چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے وہ غیر قانونی اخبار "پراودا" PRAVDA کی کاپیاں تقسیم کر سکے— 'پراودا' کے معنی سچائی ہیں اور سچائی کی مانند زار کے محکوم علاقوں میں اس کا داخلہ ممنوع تھا اور کالی دھرتی پر چلتے وقت اسے ان ساتھیوں کی موجودگی کا احساس رہتا تھا جو اس دھرتی کے نیچے کوئلہ کھود کر نکال رہے تھے۔

اس کے پاؤں تلے ہتوڑوں کی مہیب آواز ابھرتی گئی......ایک بار دو بار پھر وہ آواز مسلسل بڑھتی گئی جیسے زمین کی سطح کے قریب پہنچ کر ساتھی مزدوروں نے دستک دی ہو۔ سورج کی تیز کرنوں کے تلے نئی جوانی کی اس صبح کے لیے وہ محبت کی ایک ایسی آواز تھی جو ملک کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ انسان پودوں کی مانند ابھر رہے تھے۔ دھرتی میں انقلاب کا بیج پڑ چکا تھا اور جلد یہ سیاہ فوج پوری دھرتی پر پھیل جائے گی۔

یہاں زولا کا ناول GERMINAL ختم ہوتا ہے—اور اس سے یہ اندازہ لگانا غلط نہ ہوگا کہ عظیم اکتوبر انقلاب کے موقعہ پر نکیتا خروش چیف نے ایسا ہی محسوس کیا ہوگا!

O

ایک انقلابی تربیت

خدا کا قیام طاقت میں نہیں علم میں ہے!'' (الکزینڈر نیوسکی)

باہر برف تھم چکی تھی اور کہرے نے کریملن کے درختوں پر کٹیلے نقش و نگار بنا دیے تھے اور ان کے اوپر کریملن کے سرخ تارے موسم سرما کی سرد شام میں چمک رہے تھے۔

خروشچیف ایک گھنٹے سے زیادہ گفتگو کرتے رہے اور ہم مختلف موضوعات پر بات چیت کر چکے تھے — نہ صرف امن اور ہتھیار بندی کے بارے میں عام قسم کے سوال و جواب بلکہ بنیادی نوعیت کے نظریاتی مسائل پر بھی بات چیت ہوئی۔ مثلاً مارکسی نظریوں کی ابدیت اور یورپ و امریکہ میں سرمایہ داری کی نئی شکل جیسے مسائل پر بھی گفتگو ہوئی۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ لینن یا اسٹالن کے اوّلیں دور کی مانند بنیادی طور پر مفکر نہیں ہیں لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ مختلف موضوعات پر انھیں حیرت انگیز حد تک عبور حاصل ہے اور نہ صرف سوویت یونین بلکہ بہت سے ملکوں کے اندرونی حالات کے بارے میں بھی پوری واقفیت حاصل ہے اور اس میں کالینووکا کے۔ ان پڑھ لڑکے یا ڈونباس کے نوجوان کان مزدور کو ڈھونڈھنا مشکل ہے۔

جس نوجوان نے انقلاب کے موقعہ پر 'پراودا' کی کاپیاں اداریہ کی پوری اہمیت کو سمجھے بغیر تقسیم کی تھیں۔ اسے اس بات کا خیال تک نہیں آیا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب اسی

پرچے کے صفحوں کے صفحے اس کی تقریر اور رپورٹوں پر مشتمل ہوں گے۔

خروش چیف نے ایک بار کہا تھا' میں ڈونباس میں بڑا ہوا تھا' محض جسمانی طور پر بڑا نہیں ہوا تھا— جہاں انھوں نے اپنی جوانی کے دن بسر کیے تھے— بلکہ ذہنی اور نظریاتی طور پر بھی۔ کانوں اور دھات کی بھٹیوں میں سیاسی طور پر بیدار مزدوروں اور انقلاب پسندوں سے ان کی جان پہچان ہوئی۔ وہاں مزدوروں کی روزمرہ کی جدوجہد میں ان کی سیاسی سوجھ بوجھ میں اضافہ ہوا۔ وہیں 1917 کے انقلاب کے بعد 23 سال کی عمر میں وہ کیمونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ یہ ان کی زندگی کا انتہائی فیصلہ کن عمل تھا۔ 40 سال کے بعد 1957 میں ایک امریکی صحافی نے خروش چیف سے پوچھا۔ ''کیمونسٹ پارٹی آپ کے لیے زندگی بھر کیا اہمیت رکھتی ہے اور اب آپ کے ذاتی احساسات کے پیش نظر آپ کی زندگی میں اسے کس قدر دخل ہے؟''

جواب میں خروش چیف نے کہا۔ ''کیمونسٹ پارٹی مجھے عزیز ہے۔ کیونکہ نئے سماج کی تعمیر کے لیے میرے تمام خوابوں کی تعبیر اسی میں ہے۔''

یہ بات قابل غور ہے کہ خروش چیف مارکسی ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد محض نظریاتی تبدیلی سے کیمونسٹ پارٹی میں نہیں آئے تھے بلکہ طبقاتی کش مکش کے ذاتی تجربوں کے بعد پارٹی میں شامل ہوئے تھے۔ دراصل عام تعلیم کی سہولتیں انھیں 1920 میں میسّر ہوئی تھیں۔ جبکہ خانہ جنگی کے دوران آپ نئی سرخ فوج میں دو سال تک دشمنوں سے لڑے تھے۔

خانہ جنگی بھی اس نوجوان سپاہی کے لیے ایک اذیت ناک حقیقت تھی۔ بیرونی دخل انداز اور مقامی رجعت پسندوں کی فوجیں ملک کو اجاڑ رہی تھیں۔ انھوں نے انقلابی فوجوں کے ساتھ تمام مصیبتیں برداشت کیں۔ اس فوج نے جس میں فیکٹریوں کے مزدور بھرتی ہوئے تھے۔ جبکہ بہت سے سپاہی تربیت اور وردی کے بغیر محاذ پر گئے تھے اور بیشتر سپاہیوں کے پاس معمولی سے ہتھیار اور تھوڑا سا اسلحہ تھا۔ دشمنوں کا جم کر مقابلہ کیا لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی— رجعت پرست ڈینی کن نے کالینودکا کے باشندوں پر جو ستم توڑے انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

جنرل ڈینی کن یوکرین میں رجعت پرست سفید دستوں کا کمانڈر تھا اور فرانس اور برطانیہ

کی حکومتیں اسے مالی امداد دے رہی تھیں۔ صرف برطانیہ نے روسی انقلاب اور نئی سودیت حکومت کے خاتمہ کے لیے دس کروڑ ڈالر صرف کیے تھے۔ ڈینی کن نے روسی عوام پر جو ظلم ڈھائے اس کی مثال جنگ کی کسی تاریخ میں نہیں تھی۔ کسی بھی گاؤں کے لوگوں نے اس کے دستے کو کھانا پہنچانے یا کمیونسٹوں کے متعلق اطلاع دینے سے اگر اعتراض کیا تو پورا گاؤں جلا دیا گیا اور گاؤں کے تمام لوگ قتل کر دیے گئے کالینووکا میں غریب کسانوں کو اسی ظلم اور استبداد کا سامنا کرنا پڑا اور جب خروش چیف اپنے دوستوں کے ہمراہ وہاں پہنچا تو پورا گاؤں راکھ ہو چکا تھا اور گاؤں کے تمام لوگ، خروش چیف کے والد سمیت گولی مار دینے کے بعد ایک مشترکہ قبر میں دفنا دیئے گئے تھے لیکن ظلم اور استبداد کی اس تحریک سے سرخ فوج کے سپاہیوں میں غم اور غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ جس کے سامنے آخرکار رجعت پرستی نے دم توڑ دیا۔ کہا جاتا ہے کہ خروش چیف اور دوسرے نوجوان سپاہیوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور بالآخر دشمنوں کی کمر توڑ دی۔ ایک سال کے اندر ڈینی کن کی فوج کے بچے کچھے دستوں نے جنرل دارشلوف کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ رجعت پرستوں کی شکست کے اس تاریخی موقعہ پر خروش چیف بھی دوسرے افسروں کے ساتھ موجود تھے۔

خروش چیف نے خانہ جنگی کے دنوں کی یاد کو کبھی فراموش نہیں کیا ہے۔ امریکی دورے کے دوران اپنی تقریروں میں کئی بار وہ اس کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ نیویارک کے میئر کی جانب سے دی گئی تقریب کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے بتایا: ''ایک وقت تھا کہ ہمارے ملک کے عوام ستائش اور شک کی نگاہ سے امریکہ کی ترقی کو دیکھا کرتے تھے جو ترقی امریکہ نے آزادی حاصل کرنے کے بعد کی تھی۔

—یہ سچ مچ ایک انقلابی تحریک تھی۔ لیکن جس وقت ہم انقلاب لائے، اس وقت آپ شاید اپنے ملک کے انقلاب کو فراموش کر چکے تھے۔ اسی لیے آپ نے روسی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی امداد کے لیے اپنے دستے روانہ کیے۔ اس کے نتیجوں سے بخوبی واقف ہیں۔ ہمارے ملک کے عوام نے بیرونی مداخلت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہم نے فرانسیسی اور سفید فوجی دستوں کے ساتھ آپ کے دستوں کو بھی مار بھگایا......''

اور پھر جب کسی نے انھیں یاد دلایا کہ خانہ جنگی 23-1921 کے بھیانک قحط کے دنوں میں امریکہ نے روسی عوام کو مدد بھی پہنچائی تھی تو خروش چیف نے کہا'' ۔ ہمیں بخوبی یاد ہے اور ہم آپ کے شکر گزار ہیں...... ہمارے ملک کے عوام کو اچھی طرح یاد ہے کہ امریکی امداد سے والگا کے علاقہ میں ہزاروں لوگ بھوک اور قحط سالی کے ہاتھوں لقمۂ اجل ہونے سے بچا لیے گئے تھے۔ لیکن ہمارے عوام نے اس امر کو بھی فراموش نہیں کیا کہ امریکی جرنیل اور امریکی دستے سفید رجعت پرستوں کی امداد کے لیے ہمارے علاقے میں گھس آئے تھے۔ جاپانی دستے بھی آئے تھے۔ فرانسیسی دستے روڈیسا میں پہنچے تھے۔ جرمن دستے سوویت کا کیشیا تک گھس آئے تھے۔ پولینڈ کی فوجوں نے کیف پر قبضہ کر لیا تھا۔ برطانیہ نے بھی ہمارے خلاف فوجیں روانہ کیں...... اس وقت ہم کن مشکلات سے دوچار تھے۔ اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ پہلی عالمی جنگ اور خانہ جنگی سے ہم تباہ ہو چکے تھے۔ ہماری کانیں اور کارخانے بند پڑے تھے۔ ہم فاقے کاٹ رہے تھے۔ ہمارے پاس پہننے کے لیے کچھ نہیں تھا اور ہم ننگے پاؤں گھوم رہے تھے لیکن کیا ہوا؟ ۔ ان تمام مشکلات کے باجود ہم نے آپ کے دستوں کو شکست دی۔ تمام حملہ آوروں کو سمندر میں دھکیل دیا اور سفید دستوں کو مار بھگایا ۔ ''

۔ غصے سے زیادہ غم سے بھر پور لہجے میں خروش چیف نے کہا۔ اس وقت آپ اور دوسرے ملک ہمارے خلاف اپنے دستے روانہ نہیں کرتے تو ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ ہم فوری طور پر سفید دستوں سے نپٹ لیتے اور خانہ جنگی نہیں ہوتی۔ قحط بھی نہیں پڑتا اور امریکہ کو روسی عوام کے لیے امداد بھیجنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی...... ''

لیکن اس کے علاوہ ایسے بہت سے واقعات بھی انھیں یاد تھے۔ جن کا سیاست سے کچھ زیادہ تعلق نہیں تھا۔ مثال کے طور پر انھیں یاد ہے کہ ان دنوں ان کا دستہ کوبن کے علاقے میں رکا ہوا تھا اور خروش چیف ایک پڑھے لکھے گھرانے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ گھر کی مالکن پیٹرز برگ میں اعلیٰ خاندان کی نوجوان لڑکیوں کے انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کر چکی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ جب میں ان کے گھر میں رکا ہوا تھا تو میرے بدن سے تب تک کوئلے کی بو آیا کرتی تھی۔ ان کے گھر میں دانشور طبقہ کے بعض دوسرے افراد بھی موجود تھے۔ ایک وکیل، ایک انجینئر،

ایک استاد اور ایک موسیقار — انھوں نے بالشویکوں کے متعلق کئی بھیانک کہانیاں سن رکھی تھیں لیکن زندگی میں پہلی بار وہ ایک جیتے جاگتے بالشویک کو دیکھ رہے تھے — ''جب وہ مجھے ملے تو انھوں نے دیکھا کہ انسانی گوشت کھانے کی بجائے میں تو فاقے کاٹ رہا تھا۔ بعض دفعہ مجھے روٹی تک نصیب نہیں ہوتی تھی لیکن میں نے ان سے کبھی بھی کھانے کی درخواست نہیں کی اور نہ ہی کبھی کسی دوسری چیز کا مطالبہ کیا۔'' تب انھیں یقین آیا کہ بالشویک اس قسم کی بلا نہیں ہیں جس قسم کی بلا کا پرچار ان کے دشمنوں نے کر رکھا تھا۔''

''اس وقت ہم غیر تربیت یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ مزدور تھے۔'' خروشچیف نے بتایا۔'' لیکن ہم تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہم حکومت چلانا چاہتے تھے۔ ہم ایک نئے سماج کی تعمیر کرنا چاہتے تھے اور ہم اس کام کے لیے اپنی تمام قوتیں لگا دیں — ''

ایک روز گھر کی مالکن نے سرخ سپاہی سے پوچھا ''بتاؤ کہ تم بیلے ناچ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ تم تو ایک سیدھے سادھے کان مزدور ہو؟''

''اور حقیقت یہ ہے۔'' خروشچیف نے تسلیم کیا۔'' کہ اس وقت تک مجھے بیلے ناچ کے بارے میں کچھ علم نہ تھا کیونکہ میں نے اس وقت تک نہ تو کبھی بیلے ناچ دیکھا تھا اور نہ بیلے ناچنے والی بیلرینا کو دیکھا تھا لیکن میں نے اسے اتنا ضرور بتایا کہ کچھ عرصہ انتظار کرلو۔ ہمارے پاس سب کچھ ہوگا۔ بیلے کے ناچ بھی ہمارے پاس ہوں گے۔ سچ پوچھو تو اس وقت اگر کوئی مجھ سے یہ سوال کرتا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں تو شاید میں ٹھیک جواب نہ دے سکتا لیکن میں یہ ضرور جانتا تھا کہ ہمارے سامنے ایک بہتر زندگی کا راستہ کھل چکا ہے۔''

یہ تھی اس شخص کی تعلیم جو ایک روز اپنے ملک میں سب سے اہم ہستی بننے والا تھا لیکن آخر کار خانہ جنگی ختم ہوگئی اور لینن نے اعلان کیا کہ پرولتاری طبقہ اگر سچ مچ دنیا کے پہلے سوشلسٹ ملک کی قسمت کا مالک بننا چاہتا ہے تو اسے تعلیم کی ضرورت ہے اور ان دنوں لاکھوں محنت کش انقلابی نکیتا خروشچیف کی طرح اسکول میں داخل ہوئے۔

دنیا کی سب سے بڑی یونی ورسٹی ماسکو میں ہے۔ یہاں بارہ ہزار طالب علم تعلیم حاصل

کرتے ہیں۔ اس کی 32 منزلہ عمارت آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ روسی دارالخلافہ میں کسی بھی گرجا حتیٰ کہ کریملن کے کسی بھی مینار سے یہ عمارت بلند تر ہے۔ حال میں سوویت حکومت نے ایک قانون پاس کیا جس کے تحت بنیادی لازی تعلیم میں ایک سال کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ سوویت روس کے ہر لڑکے اور ہر لڑکی کو کم سے کم آٹھ سال تک پڑھنا ہوگا۔ اس منصوبے پر عمل کرنے کے لیے سویت حکومت کو کئی ارب ڈالر صرف کرنا ہوں گے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ جس شخص نے اپنے ملک کے کروڑوں بچوں کو تعلیم کا یہ نیا سال دیا ہے۔ وہ خود تعلیم سے محروم رہا۔ اسے کسی اسکول یا یونی ورسٹی میں تعلیم میسر نہ ہوئی۔

خروش چیف میں ایک دانشور کی ظاہری چمک کا بے شک فقدان ہے لیکن وہ غیر تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ درحقیقت وہ دنیا کے ہر مسئلے — سائنس اور ادب — پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ یہ تعلیم انھوں نے ایک ایسے ادارے میں حاصل کی تھی جو پرولتاری انقلاب کی پیداوار تھا۔ مزدوروں کی ان یونی درسٹیوں میں تین یا چار برس کے کورس پڑھائے جاتے تھے۔ ان اداروں میں مزدوروں اور کسانوں نے اپنے کام کے علاوہ قدرتی سائنس، ادب، تاریخ اور اقتصادیات کی تعلیم حاصل کی۔ سوویت روس کے بیشتر لیڈروں نے — سیاست، سائنس ٹیکنولوجی اور حتیٰ کہ ادب کے میدانوں میں بھی — ان مزدور یونی ورسٹیوں سے تعلیم حاصل کی تھیں۔

خروش چیف نے ڈونباس کے ایک صنعتی ادارے میں ایسی تعلیم حاصل کی جبکہ وہ نئے سوشلسٹ سماج کی ایک کان میں معاون مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ "میرے ہم عصر دوستوں کو وہ دن اچھی طرح سے یاد ہیں —" خروش چیف نے بعد ازاں بتایا۔ "نوجوان اپنے کام کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ آٹھ گھنٹے بھٹی یا کان میں کام کرنے کے بعد یہ نوجوان اتنا ہی وقت تعلیم کے حصول پر صرف کر رہے تھے۔ نیند کے لیے بمشکل کچھ وقت ملتا تھا......"

لیکن مستقبل میں سوویت روس کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے انھیں ایک اور تعلیم بھی حاصل کرنا تھی۔ پارٹی کی ایک ضلع کمیٹی کے سکریٹری کے بطور آپ نے علاقے کی کانوں اور سانجھی کھیتی باڑی سے متعلقہ تمام مسائل کو سمجھا پارٹی کے مختلف اداروں میں کام کرنے کے بعد 1929

میں انھیں صنعتی اکادمی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے ماسکو بھیجا گیا۔

اکادمی میں سوویت یونین کی اشتراکی معاشیات کے مختلف شعبوں کے لیے اعلیٰ افسروں کو نظم ونسق کی تعلیم دی گئی تھی۔ اس کے بعد انھیں پارٹی کے مزید اعلیٰ عہدے ملتے رہے۔ 1934 میں وہ مرکزی کمیٹی میں شامل کر لیے گئے۔ 1935 میں وہ ماسکو پارٹی کمیٹی کے پہلے سکریٹری چنے گئے۔ 1938 میں انھیں یوکرین کی پارٹی کا پہلا سکریٹری چنا گیا۔

باہری دنیا کے لوگوں کو محض اپنے ملک کی کیمونسٹ پارٹیوں کا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ جہاں کیمونسٹ پارٹیوں کا کام محض احتجاجی ہے۔ اس لیے وہ سوویت یونین کے کیمونسٹ عہدیداروں کے کام کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ سوویت یونین، کیمونسٹ کارکن، سرکاری عہدیداروں کی مانند حکومت کا حصہ ہے۔ خروشچیف نے مثال کے طور پر 1930 میں کیا کیا؟

ماسکو پارٹی کے سکریٹری ہوتے ہوئے انھوں نے ماسکو کی تعمیر نو اور ترقی کے لیے کام کیا اور مزدوروں کی حالت بہتر بنانے کے لیے کوشاں رہے۔ انہی دنوں ماسکو میں زمین دوز ریل گاڑی اور 'میٹرو' کے عظیم اسٹیشن قائم کیے گئے۔ سڑکوں کو کشادہ کیا گیا۔ پارک بنائے گئے اور شہر میں نئے فلیٹوں کے سینکڑوں نئے فلیٹ تعمیر کیے گئے۔ یہ بھی خروشچیف کی تعلیم کا حصہ تھا۔ یوکرین کے پارٹی کے سکریٹری ہوتے ہوئے انھوں نے یوکرین کی زراعت کی حالت بہتر بنانے کے کام کیا۔ انہی دنوں یوکرین کی صنعت میں تیزی سے ترقی شروع ہوئی۔

بدقسمتی سے دنیا کے بہت سے لوگ جن میں اپنی ملک کی حکومتوں کی پالیسی پر اثر انداز ہونے والے اور کنٹرول کرنے والے بہت سے سیاستداں بھی شامل ہیں، ابھی تک اس وہم میں مبتلا ہیں کہ سوویت یونین کے کیمونسٹ لیڈر بم پھینکتے ہیں۔ یا عالمی انقلاب کے لیے سازش کرنے اور ہتھیاروں کے ذریعہ سرمایہ داری کا تختہ الٹنے والا باغی ہوتا ہے یا محض بڑ ہانکنے والا احمق۔ اسی لیے وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ خروشچیف مارکسی جدلیات کے ــ مسائل پہ بحث کرنے کے بجائے امریکی کسانوں کے ساتھ مکئی کے پیداوار کے طریقوں پر کیسے بات کر سکتا ہے؟ ہندوستان کے فولاد کی صنعت کے ماہرین سے کیسے تبادلۂ خیالات کر سکتا ہے؟ اور ماسکو میں رہائشی مکانوں کی بہتر تعمیر کے لیے جدید تعلیم کے مسائل کا مطالعہ کرنے کے لیے کیسے وقت نکال

سکتا ہے؟

خروش چیف جب بھی دوسرے ملکوں کا دورہ کرنے جاتے ہیں تو مختلف مسائل کی جانب ان کا عملی رویہ اور صنعت وزراعت کے مختلف مسائل کے متعلق ان کی بھرپور واقفیت کا کافی ثبوت ملتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر جب آپ امریکہ گئے تو روزویل گارسٹ کا مشہور ومعروف فارم دیکھنے کے لیے کون ویپڈز تشریف لے گئے۔ وہاں انھوں نے مکئی کی فصل بڑھانے کے نئے زراعتی طریقوں اور مویشیوں کو بہتر نسل بنانے کے مسائل پر اس ماہرانہ ڈھنگ سے تبادلہ خیال کیا کہ گارسٹ اور موقعہ پر دوسرے لوگ حیران رہ گئے۔ خروش چیف نے گارسٹ سے ان مسائل پر محض تبادلۂ خیال ہی نہیں کیا بلکہ تکنیکی تنقید بھی پیش کی۔ گارسٹ نے اس تنقید کو تسلیم کرلیا۔

اپنے ملک میں جب بھی وہ اشتراکی کھیتوں یا کانوں میں اچانک معائنہ کرنے جاتے ہیں تو ماہرین کو ہمیشہ چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ پارٹی کی مرکزی کمیٹی اور سپریم سویٹ میں آپ جو رپورٹیں پیش کرتے ہیں ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ کو نظریاتی اور جدلیاتی بحث مباحثے کے مقابلے پر زراعت اور صنعت کے عملی پہلوؤں سے زیادہ شغف اور عبور حاصل ہے۔

ہندوستان کے دونوں دوروں کے دوران جن نامہ نگاروں نے — جن میں میں بھی شامل تھا — ان کے دورہ کی رپورٹیں پڑھیں۔ وہ خروش چیف کی عملی واقفیت سے بہت متاثر ہوئے۔

سورت گڑھ کے سرکاری فارم میں جہاں خروش چیف کی بھیجی ہوئی روسی مشینوں سے کام ہوتا۔ انھوں نے پندرہ منٹ تک تکنیکی مسائل پر فارم کے افسروں اور ماہروں سے تبادلۂ خیال کیا اور انھیں بتایا کہ بہتر فصل تیار کرنے کے لیے ان مشینوں کو کیسے استعمال کیا جائے۔ انھوں نے ماہرین اور تکنیکی کارکنوں کا ایک بار مذاق بھی اڑایا۔ ''عموماً لوگ آپ کو وہ باتیں بتاتے ہیں جو انھوں نے بیس برس پہلے کتابوں میں پڑھی تھیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس دوران میں زندگی اور علم کے دائرے بہت وسیع ہو چکے ہیں۔'' انھوں نے فارم کے ماہرین سے کہا کہ کتابی ہدایات کے بجائے انھیں خود نئے تجربے کرنے چاہئیں۔ ''تم لوگ مشین کے مالک ہو۔ ایسا نہ ہونے دو کہ مشین آپ کو ہدایتیں دینے لگے اور جب آپ اپنے نئے تجربوں میں کامیاب ہوجائیں گے تو کوئی پروفیسر آئے گا۔ آپ کے تجربوں کی بنیاد پر کتاب لکھے گا اور ڈاکٹریٹ کا

سرٹی فیکیٹ حاصل کرے گا۔''

بمبئی میں ملک کالونی (MILK COLONY) کا دورہ کرتے وقت آپ نے مشینوں کی تعریف کی اور ہندوستان، روس کے دودھ میں مکھن کی مقدار پر بحث کرتے وقت ملک کمشنر ڈی۔این کھر وڈی سے آپ کی بہت دلچسپ باتیں ہوئیں۔ کھر وڈی نے کہا کہ دودھ میں مکھن کی مقدار سات فیصد ہوتی ہے لیکن خروش چیف اس بات پر بضد تھے کہ دودھ میں مکھن کی مقدار زیادہ سے زیادہ پانچ فیصدی ہوتی ہے۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اپنی اپنی جگہ دونوں صحیح تھے۔ خروش چیف گائے کے دودھ کی بات کررہے تھے۔ جب کہ ہندوستانی ماہرین کا اشارہ بھینس کے دودھ کی طرف تھا۔ بھینس کے دودھ میں مکھن کی مقدار زیادہ ہوتی ہے لیکن روس میں بھینس نہیں ہوتیں۔ ساری بحث ہنسی اور باہمی تفریح میں ختم ہوئی اور خروش چیف نے کہا کہ تمام بحث مباحثہ اسی طرح ختم ہونا چاہیے کیونکہ 'بحث مباحثے سے ہی حقیقت جنم لیتی ہے۔'

O

جنگ کے گھاؤ

''جنگ ایک ایسی بلا ہے جو انسان کا خون پی کر زندہ رہتی ہے۔''
''جنگ سے آپ کو فصل حاصل نہیں ہوتی'' (روسی کہاوتیں)

جب وہ بولتا ہے یا سنتا ہے تو ان چھوٹی چھوٹی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی چمک دوڑنے لگتی ہے۔ ان میں سے تجسس جھلکنے لگتا ہے کبھی کبھی ان میں شرارت کی مسکراہٹ بھی دوڑ نے لگتی ہے لیکن دراصل وہ تھکی ہوئی آنکھیں ہیں جنھوں نے بہت دکھ جھیلے ہیں، بہت مصائب دیکھے ہیں، خصوصاً جب وہ جنگ اور ایٹمی جنگ کی باتیں کرتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں انسانیت کے تمام مصائب کا دکھ بھر آتا ہے۔

کیا یہ محض دکھاوا ہے؟ جنگ بندی اور ہتھیار بندی کے مسئلے خروشچیف کے لیے کیا محض ایک ڈھونگ ہیں؟ سوویت روس کے عوام میں امن کے استحکام کی بھرپور خواہش کیا محض ایک بناوٹ ہے؟

کوئی بھی ان سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ کوئی بھی ان وجوہات کو نہیں سمجھ سکتا جو سوویت حکومت کی خواہش امن کے پیچھے کارگر ہیں۔ جب تک کہ اسے اس بات کا علم نہ ہو کہ خروشچیف سمیت سوویت عوام کے لیے جنگ کے معنی کیا ہیں؟

اعداد وشمار تو انتہائی افسوسناک ہیں ہی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران سوویت روس کے بیس کروڑ آبادی میں سے ایک کروڑ افراد ہلاک ہوئے لگ بھگ اتنے ہی افراد زخمی ہوئے۔ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد عمر بھر کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں جنگ کی بھینٹ کر چکی ہے۔ نازیوں نے 1710 شہروں کو جلایا اور برباد کیا۔ ستر ہزار دیہات تباہ کر دیئے گئے۔ ڈھائی کروڑ افراد بے گھر ہوئے اور جنگ کے دوران 5 کھرب ڈالر کا مالی نقصان ہوا لیکن انسانی مصائب اس سے بھی زیادہ بھیانک ہیں۔ سوویت یونین میں ایسا کوئی کنبہ نہیں۔ جن کے گھر کا کم سے کم ایک فرد ہلاک نہ ہوا ہو۔ بہت سے کنبے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔

1945 میں جب میں پہلی بار ماسکو گیا تھا۔ تو میرے ہوٹل کے ایک کونے میں ایک شخص روز بیٹھا ہُ ودکا پیا کرتا تھا۔ رات ہوٹل بند ہونے پر اسے گھسیٹ کر اٹھایا جاتا تھا۔ وہ شراب کا مریض نہیں تھا۔ اس کی مسلسل شراب نوشی میں کسی شان بے نیازی نہیں بلکہ کسی گہرے المیہ کا ہاتھ تھا۔

میں نے اپنے ترجمان سے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ وہ ایک سرکاری تجارتی ادارے میں ایک چھوٹا سا افسر تھا۔ جنگ کے دنوں میں وہ لینن گراڈ کے محاذ پر لڑنے چلا گیا۔ پیچھے ماسکو میں بمباری کے دوران اس کے گھر پہ ایک بم گرا اور اس کے بزرگ والدین، اس کی بیوی، دو بیٹیاں اور تین سال کا بیٹا ہلاک ہو گئے۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد وہ اکیلا ہے اور رات نشے میں مکمل طور پر دھت ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے کی سنسان زندگی میں واپس چلا جاتا ہے۔ ''میں وہاں اس کمرے کے خالی پن کو برداشت نہیں کر سکتا۔'' اس نے اپنے دوستوں کو اداسی سے بتایا جب کہ وہ اسے شراب کی بوتل سے الگ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مجھے بتایا گیا کہ روس میں ایسے لاکھوں کیس تھے اور یہی وجہ ہے کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد روس میں شراب نوشی کے اعداد وشمار میں اضافہ ہو چکا ہے۔

مجھے ایک نوجوان عورت ملی جس کے دو چہرے تھے — اس کے بائیں رخسار میں جوانی کھیلتی تھی۔ صاف چمڑی جس میں گڑھا پڑا ہوا تھا لیکن اس کے دائیں رخسار پر بڑھاپے کی جھریاں پڑی ہوئی تھیں جو دراصل سلے ہوئے زخموں کے ٹانکوں کے نشان تھے۔ اس کے بالوں کا رنگ برف کی مانند سفید ہو چکا ہے۔ محض ایک رات میں وہ بوڑھی ہو گئی کیونکہ اس وقت اس کی

عمر محض سترہ سال تھی۔ جب وہ ایمبولنس گاڑی میں سپاہیوں اور لاشوں کو ماسکو کے مضافاتی محاذ سے لایا کرتی تھی۔ ماسکو سے باہر محاذ محض بیس میل کے فاصلے پر تھا۔

اس ماں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو ہزاروں دوسری ماؤں کی طرح ہر ماہ ایک جنگل کے 'خاص اسکول' میں اپنے بیٹے کو دیکھنے جایا کرتی تھی۔ جہاں ایسے بچوں کو رکھا گیا ہے۔ جن کے دماغ جنگ کے زمانے میں چل گئے! اور اب جن کا کوئی علاج نہیں۔ اس ماں کا بچہ محض چند ماہ کا تھا کہ قریبی عمارت پر بم گرا اور بم کے دھماکے سے بچے کے دماغ کا نازک اعصابی نظام بگڑ گیا۔ صرف اس ایک لمحے میں صحت مند اور مسکرانے والا بچہ ایک مستقل پاگل بن کر رہ گیا۔

میں ایک ادیب کو بھی جانتا ہوں۔ جس کی پوری لائبریری ایک رات میں جل کر خاکستر ہو گئی۔ زندگی بھر میں اس نے ہزاروں کتابیں جمع کی تھیں۔ ساتھی ادیبوں نے اپنی کتابوں کے پہلے ایڈیشن اسے بطور تحفہ پیش کیے تھے۔ سب کتابیں راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔ اس کے بعد آج تک نہ تو وہ کوئی کتاب خریدتا ہے اور نہ کسی دوست سے کوئی کتاب بطور تحفہ قبول کرتا ہے۔ متوسط عمر کی ایک عورت کے پاس ان دنوں کپڑے کے کئی جوڑے اور درجن سے زیادہ جوتے ہوا کرتے تھے لیکن ایک فوجی اسپتال میں نرس کی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد جب وہ واپس لوٹی تو سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اس دن کے بعد وہ کپڑوں کے محض دو جوڑے اور جوتوں کا محض ایک جوڑا رکھتی ہے۔ وہ اتنا کماتی ہے کہ مزید جوڑے خرید سکتی ہے لیکن اس کے دل میں ایک ڈر ہے کہ اگر پھر کبھی جنگ ہوئی تو شاید وہ پھر سب کچھ کھو بیٹھے۔

اس کے ساتھ ہی لوگوں کی فاقہ کشی کا اندازہ کیجیے۔ کئی ماہ تک لوگ محاصرے کی حالت میں پھنسے رہے۔ لینن گراڈ کے لوگ کتے اور بلّیاں کھانے پر مجبور ہوئے۔ بوڑھے بزرگوں نے نیند میں بھوک سے دم توڑ دیا اور کوئی لاشیں اٹھانے والا نہ تھا۔ مسلسل گولہ باری، ہر وقت بمباری۔ چار سال کی ہولناک سردی جبکہ گھروں میں ایندھن تک نہ تھا۔ اسپتالوں میں زخمیوں کی چیخ و پکار۔ کسی کے بازو کٹے ہوئے، کسی کے چہرے کی جلد جلی ہوئی جس کے نیچے محض تھوڑا سا گوشت رہ گیا تھا۔

ان اعداد و شمار کو لاکھوں سے ضرب دیجیے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ سوویت عوام کے لیے جنگ کیا معنی رکھتی ہے۔ وہ اس ثابت قدمی اور اس بے صبری سے امن کے خواہاں کیوں ہیں؟

نکیتا خروش چیف تو سوویت عوام کا محض ایک فرد تھے۔

ہنری کیباٹ لاج نے نیویارک میں خروش چیف کا استقبال کرتے ہوئے کہا:

''مجھے امید ہے کہ ہم اور سوویت یونین اس مشترکہ خواہش کے ناطے سے متحد ہیں کہ ہم دونوں کسی دوسری جنگ سے اب تباہ نہیں ہونا چاہتے۔''

''خاص طور پر میں یہ جانتا ہوں، صدر خروش چیف کہ آپ بھی امن چاہتے ہیں۔ محض اس لیے نہیں کہ آپ ایک ملک کے سربراہ ہیں۔ محض ان ذمہ داریوں کے ناطے سے ہی نہیں بلکہ اس لیے بھی کہ آپ اس بچّے کے باپ ہیں جس نے دوسری بڑی جنگ میں اپنی جان کی قربانی دی تھی......''

خروش چیف نے جب یہ سنا اور اس کی آنکھوں میں اداسی اور گہری ہوگئی ہوگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے بڑے لڑکے لیونڈ LEONID کی تصویر گھوم گئی ہوگی۔ جو سوویت فضائیہ کا ایک لڑاکا ہواباز تھا۔ کئی بار وہ جرمن جہازوں کے خلاف لڑتے ہوئے زخمی ہوا لیکن اس کے باوجود وہ مسلسل لڑتا رہا لیکن 1943 میں اس کا جہاز نازیوں نے مار گرایا اور لڑتے لڑتے وہ خود مارا گیا۔

خروش چیف کے لیے جنگ اور امن کا مسئلہ ــ اور لاکھوں سوویت والدین کے لیے بیوہ سوویت عورتوں کے لیے یتیم سوویت بچوں کے لیے ــ محض ایک نعرہ نہیں ہے محض ایک دلیل نہیں ہے۔ اور نہ ہی طبقاتی جنگ کا ہتھیار ہے بلکہ یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ جن میں ان کے گہرے انسانی جذبات کا دخل ہے۔

1938 میں برطانوی فلاسفر برٹرینڈ رسل نے خروش چیف اور جان فوسٹر ڈلز کے نام ایک کھلا خط لکھا تھا۔ اس کے جواب میں خروش چیف نے مارچ 1938 میں لکھا:

''دوسری جنگ کے پہلے دن سے میں اپنی فوج کے ساتھ تھا اور جنگ کی تباہ کاریوں کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے......

میں نے اپنے بہت سے ساتھیوں کو مرتے ہوئے دیکھا۔ بہت سے شہروں کو تباہ ہوتے دیکھا ــ یقین کیجیے۔ وہ سب کچھ بہت بھیانک تھا۔''

22 جون کو نازی فوجوں نے سوویت یونین پر جب اچانک حملہ کیا تو نکیتا خروش چیف یوکرین کی کمیونسٹ پارٹی کے پہلے سیکریٹری تھے۔ سوویت یونین کی اس دوسری بڑی ری پبلک کے آپ اعلیٰ ترین افسر تھے۔ معاشی طور پر یوکرین ملک کا ایک اہم ترین حصہ تھا۔ یہ سوویت روس کا 'روٹی کا تھیلہ' تھا۔ روس میں گندم کی پیداوار کا سب سے اہم مرکز۔ صنعتی طور پر بھی یوکرین بہت ترقی یافتہ تھا۔ کوئلے کی بڑی کانیں اور دھات ڈھالنے کی بھٹیاں بھی یوکرین میں ہی تھیں۔ علاقے میں زراعت اور صنعت کی تمام ذمہ داری خروش چیف کے کندھوں پر تھی۔ پارٹی کے اعلیٰ لیڈروں میں اسے یوکرین کا ماہر گنا جاتا تھا۔

پارٹی سیکریٹری کا دفتر کیف میں تھا۔ اس شہر کی ثقافتی روایات ماسکو اور لنین گراڈ سے بھی پرانی ہیں، لیکن خروش چیف کبھی اپنے میز پر نہیں ملتے تھے۔ عملی طور پر کام میں جٹے رہنے والے اس شخص کو محض کرسی گرمانے کی عادت نہیں تھی۔ نوکرشاہی کے آپ سخت مخالف تھے بھٹیوں میں آپ اکثر ماہرین سے گفتگو کرتے رہتے تھے۔

ورکروں سے آپ ڈونباس کی کوئلے کی کانوں کی باتیں کیا کرتے تھے اور کسانوں کو قدامت پرست خیالات کے اثر سے نکالنے کے لیے مشینی اور مشترکہ کھیتی باڑی کی ہدایات دیا کرتے تھے۔

شہروں اور دیہاتوں میں لوگ آپ سے پوری طرح آشنا تھے۔ بہت سے لوگوں کو وہ خود جانتے تھے۔ وہ نہ صرف علاقہ کے بہترین کسانوں اور مزدوروں کو جانتے تھے بلکہ اکثر ان کے خاندانوں کے بارے میں کافی معلومات رکھتے تھے۔ اسی لیے وہ لوگ محبت سے آپ کو — ان کے پہلے دو ناموں — نکیتا سرگیوچ کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے! جس وقت ہٹلر نے یوکرین پر حملہ کیا تو خروش چیف علاقہ کی مقبول ترین شخصیت تھے۔ سوویت یونین کی آخری فتح کے لیے یہ بات ایک نیک فال تھی اور فیصلہ کن حیثیت رکھتی تھی۔

22 جون کو جب ہٹلر کے لٹیرے دستے مغربی یوکرین میں گھس آئے تو سوویت یونین کے تمام لیڈروں میں خروش چیف سب سے زیادہ سرحد کے قریب تھے۔ انھوں نے سیکریٹری کی کرسی کو خیر باد کہا۔ اپنا قلم رکھا اور فوج میں بھرتی ہو گئے۔ فوراً آپ کو لیفٹیننٹ جنرل کا عہدہ دے دیا گیا۔ یوکرین اور جنوب مغربی علاقے کے تحفظ کی ذمہ داری بھی آپ کے حوالے کر دی گئی۔ ایک دن کے اندر آپ محاذ پر آگ اور بارود کا مقابلہ کر رہے تھے۔

فولاد کے ایک طوفان کی مانند جرمن ڈویژن لیتھوآنیا، لاٹویا، بائیلوروس پر چھا گئے اور ایک ہفتہ کے اندر وہ یوکرین کے ایک بہت بڑے حصے پر قابض ہو گئے۔ اچانک حملے کے باوجود روسی فوجیں دشمن کا مقابلہ کرتی رہیں۔ شہری والنٹیئروں کے دستے بھی فوج کی امداد کرتے رہے۔ خروشچیف اور دیگر سیاسی افسران کی آواز کو لبیک کہتے ہوئے شہری اور فوجی برابر لڑتے رہے لیکن وہ دشمن کی پیش قدمی کو محض کچھ دیر کے لیے روک سکتے تھے وہ اسے ختم نہیں کر سکتے تھے لیکن خروشچیف کے والنٹیئروں نے سرخ فوج کو جو لداد مہم پہنچائی اس سے اندرونی علاقوں میں مدافعت کو مزید مضبوط کرنے میں کافی امداد حاصل ہوئی۔ نو روز تک انھوں نے جرمنوں کو بریسٹ لیٹواسک کے قلعے کے باہر روکے رکھا اور لگ بھگ ایک ماہ تک جرمن فوجیں اسمولینسک سے آگے نہ بڑھ سکیں۔

3 جولائی کو محاصرہ میں گھرے ہوئے اسمولینسک میں خروشچیف اور اس کی فوج کے شہری والنٹیئروں نے اسٹالین کی تاریخی تقریر کو سنا جس میں اس نے سوویت عوام سے اپیل کی تھی کہ اپنے ملک اور سوشلزم کے تحفظ کے لیے اسی طرح اٹھ کھڑے ہوں جس طرح تیرھویں صدی میں انھوں نے جرمنوں کا مقابلہ کیا تھا۔ جس طرح سترھویں صدی میں پولینڈ سے آنے والے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا تھا۔ جس طرح 1812 میں نپولین کا سامنا کیا تھا۔''

اسٹالین کی تقریر سننے کے بعد خروشچیف جس نے ٹالسٹائے کے ناول ''جنگ و امن'' کو بار بار پڑھا تھا۔ اچانک محسوس کیا کہ ایک بار پھر روسیوں کو فوجی اکادمی کے قدامت پرست اصولوں کی بجائے کٹوسوف کی مانند نئی حکمت عملی کو جنم دینا ہوگا۔

جب اسمولینسک خالی کرنے کا حکم آیا تو خروشچیف نے ''دھرتی جلادو'' کی پالیسی کو جنم دیا اور پھر یوکرین سے ماسکو کے دروازوں تک نازیوں کے خلاف جدوجہد میں اس پالیسی پر ہمیشہ عمل کیا۔ ''اگر ہمیں پیچھے ہٹنا ہے'' اس نے کہا ''تو ہم ایسی کوئی بھی چیز پیچھے نہیں چھوڑیں جو دشمن کے لیے ذرا سی بھی اہمیت رکھتی ہو۔ کوئی بھی ایسا گھر نہیں چھوڑا جائے گا جو رہائش کے قابل ہو۔ گیہوں کا ایک دانہ بھی ان کے کھانے کے لیے نہیں چھوڑا جائے گا۔ کوئی بھی پل سلامت نہیں رہنے دیا جائے گا تاکہ دشمنوں کے ٹینک یا ہتھیار بند گاڑیاں آگے نہ بڑھ سکیں۔ کوئی بھی کارخانہ

ایسا نہیں چھوڑا جائے گا جسے چرا کر نازی واپس جرمنی لے جا سکیں۔'دھرتی جلادؤ' کی پہلی مثال اسمولینسک تھا۔ جہاں خروش چیف نے سب سے آخر میں شہر کو چھوڑا اور اپنی نگہداشت میں اس شہر کو جلوا کر راکھ کا ڈھیر کرا دیا اور جب نازی شہر میں گھسے تو چاروں طرف ایک دھواں اٹھ رہا تھا کسی وقت وہاں ایک خوب صورت شہر بسا ہوا تھا۔ لیکن مختلف اور مشکل ترین کام کسانوں کو اس امر کے لیے رضامندی کرنا تھا کہ وہ مشترکہ کھیتوں کی تیار فصلیں جلا ڈالیں۔ مویشیوں کو ہلاک کر ڈالیں اور اپنے گھروں کو تباہ کر ڈالیں۔ وہ گھر جو انھوں نے اپنے ہاتھوں کی محنت سے تیار کیے تھے لیکن انھیں نکیتا خروش چیف کے الفاظ پر پورا اعتماد تھا۔ اس نے جو بات کہہ دی اس پر عمل کرنا ضروری تھا۔ کسانوں سے اس کی دوستی کئی سال پرانی تھی۔ جس کے ناطے کسانوں کو رضامند کرنا بہت آسان ہو گیا۔ وہ سمجھ گئے کہ 'دھرتی جلادؤ' کی تحریک جارحانہ حملے کے خلاف سوویت عوام کی مدافعت کا اظہار ہے۔

'سوال یہ نہیں ہے کہ آپ نے فصل تیار کی ہے اور اسے جلانا ہے۔'

اس نے کسانوں کو بتایا: ''بلکہ سوال یہ ہے کہ آپ یہ فصل دشمنوں کے حوالے کرنا چاہتے ہیں یا دشمن کے آنے سے پہلے اسے تباہ کر دینا چاہتے ہیں۔'

جرمن فوجوں نے پیش قدمی کے بعد جب جلے ہوئے خالی گاؤں، تباہ پل، شہری عمارتوں کا ملبہ اور کھیتوں میں دور تک جلی ہوئی فصلوں کی راکھ دیکھی تو پہلے تو جرمن حملہ آور بہت حیران ہوئے اور پھر بھنا کر رہ گئے۔

اور اس طرح جن دنوں محاذ پیچھے ہٹتا گیا۔ ان دنوں — بیس سال کے عرصہ میں — کالینووکا کا گاؤں دوسری دفعہ جلایا گیا۔ نکیتا کی جائے پیدائش کالینووکا کو اس بار خود نکیتو شکا کے کہنے پر گاؤں والوں نے اپنے ہاتھوں سے جلایا تھا! اور شاید اسی روز خروش چیف نے حلف اٹھایا ہوگا کہ وہ ایک ایسی دنیا کے قیام کے لیے جدوجہد کرے گا جس میں خود اس کے اپنے گاؤں کی مانند کوئی بھی کالینووکا گاؤں نہیں جلایا جائے گا۔

دوسروں کے ساتھ خروش چیف نے بھی محکوم یوکرین میں محاذ کے اس پار جرمنوں کے خلاف چھاپہ ماروں کی تنظیم کو جنم دیا۔ کئی بار اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر وہ جرمن محاذ کے پیچھے گئے۔ خروش چیف گو فوجی کونسل کے ممبر تھے لیکن کبھی بھی انھیں ہیڈ کوارٹر میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ الگ

تھلگ ہمیشہ میدان جنگ میں رہتے تھے۔ ویدل وکی اور ایسے ہی دیگر ایک درجن امریکی اور برطانوی نامہ نگار جو جنگ کے دنوں میں ماسکو اور عارضی دارالخلافہ کیوبیشیف میں موجود تھے۔ وہ نہ تو کبھی خروش چیف سے ملے تھے اور نہ ہی کبھی اس کا نام سنا تھا۔ ان کی خبروں میں خروش چیف کے نام کا کبھی ذکر تک نہیں آیا تھا۔ وکی نے اپنی کتاب 'ایک دنیا' میں اسٹالین، مولوٹوف ڈشنکی، وارشلوف اور میکوآن کا ذکر کیا ہے جو اسٹالین کے صلاح کار تھے۔ اور راجدھانی میں موجود تھے۔ صرف خروش چیف کے نام کا ذکر نہیں ہے کیونکہ جنگ کے دنوں میں وہ کبھی ماسکو نہیں گئے تھے۔ محاذ ان کا گھر تھا۔ وہ ہمیشہ اس جگہ پر رہے جہاں لڑائی زور پر تھی۔ اسی لیے اس نے لارڈ رسل کو لکھا تھا۔ یقین کیجیے وہ سب کچھ بہت بھیانک تھا......'

ماسکو میں روسی فوج کے میوزیم میں موجود ہزاروں اشیا میں ڈیسک کلینڈر میں سے پھاڑا ہوا ایک کاغذ بھی رکھا ہے۔ یہ کاغذ اسٹالین گراڈ کی ڈیفینس کمیٹی کے چیئر مین اے۔ ایس چیویا نوف کی جانب سے بھیجا گیا ہے۔ اس کاغذ پر لکھا ہے:

> ''کامریڈ خروش چیف نے یکم ستمبر 1942 کی رات فون پر بات چیت کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ شہر کے مرکزی محاذ پر حالات نازک شکل اختیار کر چکے ہیں۔ انھوں نے زور دیا کہ مزید فوری دستے منظم کیے جائیں۔ 2 ستمبر کی صبح دس بجے تک ایک ہزار مزدور دالینٹیر وں نے اپنی اپنی جگہیں سنبھال لی ہیں......''

اس میوزیم میں بہت سے فوٹو بھی ہیں۔ ان میں ایک فوٹو اسٹالین گراڈ کے محاذ کی فوجی کونسل کے اجلاس کا ہے جو ستمبر 1942 میں وانگا کے گاؤں یامی میں ہوئی تھی۔ تین جرنیل جو کئی راتوں سے سوئے نہیں ہیں۔ ایک نقشے کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان میں سے ایک خروش چیف ہیں۔ دوسری تصویریں ان محاذوں کی ہیں جہاں خروش چیف گئے تھے۔ ایک تصویر میں جنرل این۔ ایف وٹیوٹن کے ساتھ آپ ٹینک کارپس کے ایک کمانڈر کو پرچم دے رہے ہیں۔ ایک تصویر میں آپ کیف کے قریب منیئیر کے کنارے مشاہدہ کی چوٹی سے فوج کا معائنہ کر رہے ہیں۔ ایک تصویر میں آپ ایک جلتی ہوئی چوکی کے قریب کھڑے دوربین کے سہارے دشمن کے

جہازوں کو آسمان میں دیکھ رہے ہیں۔ ان تصویروں میں خروش چیف نے تمغوں کے بغیر وردی پہنی ہوئی ہے اور کافی نوجوان اور مضبوط دکھائی دیتے ہیں لیکن کیف کے محاذ کے فوٹو میں آپ کے چہرے پر فکر اور تکلیف کی لکیریں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ تصویر مارچ 1944 کی ہے جب یوکرین کا دارالخلافہ نازی فوجوں سے آزاد کرایا جاچکا تھا۔ تصویر میں ملبے کے قریب خروش چیف فتح مند لیکن جنگ سے تھکے ہوئے سپاہیوں کے درمیان کھڑے ہیں۔

اسٹالین گراڈ کی جنگ کے دس سال بعد میں وہاں گیا۔ والگا کے کنارے سیمایف کی پہاڑی پر جنگ کی یادگاریں کھڑے کیے گئے، ستون کے قریب میں دیر تک کھڑا رہا۔ یہاں پر سب سے سخت جنگ اور گولے بارود کا زبردست تبادلہ ہوا تھا۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ ان فیصلہ کن دنوں میں صورت حال کیسی تھی، جب کہ نہ صرف جنگ کی قسمت کا فیصلہ بلکہ پوری انسانیت کے مستقبل کا فیصلہ اسٹالین گراڈ میں ہورہا تھا۔ پہاڑی پر کہیں بھی پیڑ یا ہریالی کا نام تک نہ تھا۔ بموں کے گولوں کے ٹکڑے اب بھی وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہاں کی زمین میں اتنا فولاد گھس چکا ہے کہ سیمایف کی پہاڑی پر کبھی بھی گھاس نہیں اگ سکتی۔

وہاں سے ہم شہر میں چلے آئے۔ نیا شہر جو نادرالوجود پرندے کی مانند پرانے اسٹالین گراڈ کی راکھ سے ابھرا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے عجیب وغریب اور قدیم شہر ہے کیونکہ وہاں کچھ بھی پرانا نہیں ہے اور اس کے کشادہ چوک اور کھلی دھوپ دار عمارتیں بالکل ایک قدرتی صورت رکھتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اسٹالین گراڈ کی ہر عمارت نئی ہے۔ اس سے ہمیں صرف اس بھیانک حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ پرانے شہر کی ہر عمارت جنگ کی نذر ہوچکی تھی لیکن وہاں اب بھی ایک پرانی عمارت کھڑی ہے جو اپنی اُڑی ہوئی کھڑکیوں کی بے نور نگاہوں سے اب بھی دنیا کو جھانک رہی ہے۔ اور بغیر چھتوں کے گھر ان بڑے بڑے شگافوں کا منہ اس بھیانک حقیقت کی یاددلاتا ہے کہ جنگ بری چیز ہے۔ میرے ایک روسی دوست جنگ کے دنوں میں اسٹالین گراڈ کے محاذ پر بطور نامہ نگار کام کررہا تھا اس نے شہر کے محاصرہ کے بارے میں مجھے کئی بھیانک تجربے بتائے۔ تباہ حال شہر کے لیے نازیوں کے خلاف ہر علاقے، ہر گلی، ہر عمارت میں لڑائی ہوئی اور آخر کار

ایک ایسی صورت حال پیدا ہوئی جب نازیوں کو شہر کے ہر کمرے میں سے پکڑ پکڑ کر مارنا پڑا تھا۔ اس نے مجھے ان دنوں کے بارے میں بتایا، جب کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔ ان راتوں کے بارے میں بتایا جب نیند کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ جنگ کی اس اعصاب تھکن کشیدگی کے بارے میں بتایا جو اس شہر کا کوئی محدود محاذ نہ تھا۔ راتوں رات کسی بھی کوچے یا کسی بھی عمارت میں محاذ کھل جاتا تھا۔ اسٹالین گراڈ کے عظیم محافظوں کی یاد میں کہانیاں اور ناول لکھے گئے ہیں نظمیں کہی گئی ہیں گیت گائے گئے ہیں۔ فلمیں تیار کی گئی ہیں لیکن آج تک جو کچھ بھی کہا یا لکھا گیا ہے حقیقت اس سے کہیں زیادہ اندوہناک اور کہیں زیادہ عظیم تھی۔

ان بھیانک دنوں میں مسلسل گولہ باری اور بم باری، بھوک اور تھکاوٹ خون کی بو اور لاشوں کی بدبو کے باوجود بہت سے ایسے افسر اور سپاہی بھی تھے جو لوہے جیسے مضبوط اعصاب کے مالک تھے اور جو کبھی بھی امید کا دامن چھوڑ کر مایوس نہیں ہوئے تھے لیکن ان میں ایک ایسا بھی تھا جس نے نہ صرف اپنے ہوش وحواس کو بالکل برقرار رکھا بلکہ مزاح کی حس کو بھی نہیں چھوڑا وہ ہر جگہ موجود رہتا تھا۔ پیدل فوج کے بارود کے ذخیروں کے پاس، خندقوں میں نشانہ بازوں کے پاس، جرنیلوں کے ساتھ کمانڈر کی چوکی میں اور رات کو وہ والگا میں کشتیوں کے ذریعہ سپلائی کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ یہ شخص ہنستا ہوا' مذاق کرتا ہوا' سرخ فوج کے ہر سپاہی سے گھل مل جاتا ہے اور اپنی رجائیت سے ساری فوج میں ایک نئی قوت اور ہمت کا اضافہ کرتا۔

ایک دن خروش چیف کے ہونٹوں سے یہ مسکراہٹ چھین لی گئی۔ یہ المیہ اس وقت پیش آیا جب اسٹالین گراڈ فتح کے زینے پر کھڑا تھا۔ اس وقت خروش چیف کو ایک تار ملا۔ جس میں اس کے اپنے بیٹے کی موت کی اطلاع تھی جو محاذ پر لڑتے لڑتے مارا گیا تھا۔

خروش چیف روس کی فتح اور کامرانی کا معمار ہی نہیں بلکہ وہ ایسا باپ ہے' جس کا بیٹا اس منحوس جنگ کی نذر ہوا۔

'ہمیں اپنے نکیتا سے محبت ہے۔' ایک بڑھی عورت نے کہا۔ اس عورت کے دولڑکے اس جنگ کی نذر ہو گئے تھے!'' نکیتا امن کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جنگ کتنی بھیانک ہے۔ یہ دکھ درد جو میں نے برداشت کیا ہے، وہی دکھ ہمارے نکیتا نے بھی جھیلا ہے۔''

○

دوسرا حصہ

انسان کا عمل!

'جس قسم کا بیج ہوگا ویسا ہی پھل پیدا ہوگا'

(روسی کہاوت)

کریملن کے دروازے کھلتے ہیں

'آپ کھڑکی میں سے ساری روشنی کو نہیں دیکھ سکتے، دروازہ کھول کر باہر نکل جایئے بہت کچھ دیکھنے کو ملے گا۔' (روسی کہاوت)

آپ نے وہ پرانا اشتہار دیکھا ہوگا جس میں یہ لکھا ہوتا ہے۔
'استعمال سے پہلے اور استعمال کے بعد'۔
بائیں طرف ایک گنجے آدمی کا فوٹو نظر آئے گا اور دائیں طرف اس آدمی کو دکھایا جاتا ہے جس کے سر پر گھنے بال اگ آئے ہیں کیونکہ اس آدمی نے بال اگانے کا تیل استعمال کیا ہے۔
اسی طرح بائیں طرف موٹی عورت کی تصویر دیکھیے اور دائیں طرف ایک نازک اندام عورت کا جسم ملاحظہ فرمایئے جو وزن کم کرنے کے لیے گولیاں کھاتی ہے۔
جب کبھی میرے ذہن میں سوویت یونین کا خیال آتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے خروشچیف کے آنے سے پہلے کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ میں نے 1953 میں پراگ سے ماسکو تک سفر کیا تھا، ایک ڈیکوٹا ہوائی جہاز میں تنگ، گندی کرسیاں، پیٹیاں ندارد اور ٹھنڈی بدمزہ چائے اور کھردرے بسکٹ۔

مجھے یاد ہے جب طوفان آیا تو جہاز چیخنے لگا اور اس کے مقابلہ میں سرمایہ داروں کے جہاز کے کیا کہنے۔ لمبا، راحت بخش، خوب صورت جس میں چڑھ کر ہم پراگ تک پہنچے تھے۔ پانچ سال کے بعد جب میں نے دوبارہ لندن سے ماسکو تک سفر کیا تو میں دنگ رہ گیا۔ اس سوشلسٹ جہاز کی سواری واقعی راحت بخش تھی، لمبا، چوڑا، خوب صورت، تیز اور اس کا مقابلہ کسی بھی سرمایہ دار ایئر لائن سے کیا جا سکتا ہے۔

یہ تصویر دائیں بازو کی ہے جب کہ خروش چیف کا دور شروع ہو گیا تھا۔ واقعی ناقابلِ یقین بات ہے کہ صرف چھ سال پہلے جب میں پہلی بار ماسکو کے ہوائی اڈہ پر اترا تھا تو اس وقت صورت حال کتنی مختلف تھی۔ جب میں ہوائی اڈے کے ہال میں پہنچا تو اسٹالن کا بُت ہر آنے جانے والے کی طرف گھورتا ہوا نظر آیا۔ مسافر اتنے کم تھے کہ معلوم ہوتا تھا کسی چھوٹے سے قصبے کے ہوائی اڈہ پر ہم لوگ اترے ہیں۔ ستمبر 1954 تک کسی غیر سوشلسٹ ملک کا ایک ہوائی جہاز بھی ماسکو کے ہوائی اڈہ پر نہیں اترتا تھا۔

سرکاری طور پر مدعو کیے گئے چند ڈیلی گیٹ نظر آتے تھے لیکن کوئی غیر ملکی ٹورسٹ دور دور تک نظر نہ آتا تھا اور اسی طرح کوئی افسر جو کسی سفیر کو الوداع کہنے آئے تھے، وہ نظر آ جائے لیکن کوئی روسی باہر سیر کرنے کی غرض سے نہ جا سکتا تھا۔ ہوائی اڈے پر استادہ اسٹالن کا بُت۔ اس قسم کی بین الاقوامی آمد و رفت میں ایک بہت بڑی دیوار بن کر کھڑا تھا۔

اور آج آپ 'T U-104' میں بیٹھ کر مختلف ملکوں کا سفر کر سکتے ہیں۔ یہ نہایت ہی خوشنما اور راحت بخش ہوائی جہاز ہے۔ اب برطانیہ، فرانس، ہندوستان، اسکینڈے، نیویا، بلجیم اور ڈچ ایئر لائن سے متحد ہیں اور ان ملکوں کے مابین ہوائی جہازوں کی آمد و رفت جاری ہے۔

اگر ہندوستان سے مغربی یورپ کی سیر کرنی ہو۔ مثلاً برطانیہ، فرانس، بلجیم یا جرمنی، دیکھنا ہو تو بخوشی ماسکو جاتی ہوئی ہوائی شاہراہ کو استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ ہوائی سفر تیز رفتار، تسلی بخش، آرام دہ اور مسافروں کی خوشی پر نگاہ رکھنے والا سفر ہوگا۔ اگر آپ چند گھنٹوں کے لیے ماسکو آ سکیں تو بالشوائے اسٹیج پر آپ ناچ دیکھ سکتے ہیں اور اس کے بعد اپنے سفر کو دوبارہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ جلدی میں ماسکو سے نیویارک تک ہوائی جہاز کا سفر شروع ہو جائے گا اور اس طرح امریکہ کے

جہاز اس آمد و رفت کے سلسلہ کو قائم کریں گے۔ یہ سب ہوائی جہاز ماسکو میں خالی نہیں اترتے اور نہ ہی جب وداع ہوتے ہیں تو کرسیاں خالی نظر آتی ہیں بلکہ ان تین سالوں میں سوویت یونین میں کتنے ہی ٹورسٹ آئے تاکہ سوویت یونین کو دیکھ سکیں۔ ہوائی جہازوں کے علاوہ ٹرینوں سے بسوں سے، پرائیویٹ موٹروں سے حتیٰ کہ ڈبل ڈیکر بس سے جس میں لندن کے کچھ طلباء، سفر کر رہے تھے ماسکو آئے۔

پچھلے سال '60' ملکوں سے کم سے کم 50 ہزار ٹورسٹ ماسکو آئے ہوں گے اور اسی طرح روس کے باشندوں نے 50 مختلف ملکوں کا سفر کیا ہوگا۔

حال ہی میں جب میں ماسکو گیا تو میں نے دیکھا 'نوکووا' ہوائی اڈہ پر سے اسٹالن کے بُت کو ہٹا لیا گیا ہے۔

مجھے 1954 کا وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ جب میرا ترجمان حواس باختہ میرے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے بتایا کہ کریملن کے دروازے عوام کے لیے کھل گئے ہیں اور اب ہمارا ڈیلی گیشن زار کے محل اور اس کے عجائب گھر کے جواہرات دیکھ سکے گا۔ مجھے اس خبر کی پوری اہمیت کو سمجھنے کے لیے چند منٹ ضرور لگے۔ جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے کریملن کے متعلق یہی مشہور تھا کہ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں کوئی داخل نہیں ہوسکتا۔ اس جگہ کے اردگرد ایک عجیب قسم کا پراسرار ماحول وابستہ ہوگیا تھا۔ سازش ڈر، دہشت اور دیگر پُراسرار سائے اس محل کے اندر باہر نظر آتے تھے۔

زار روس کے وقت اس جگہ کو بہت ہی متبرک سمجھا جاتا تھا۔ جہاں زار روس اور اس کے وزیر جب کبھی ماسکو آتے تھے تو اسی محل میں ٹھہرتے تھے اور کوئی عام آدمی کریملن کے دروازہ کے اندر نہ جا سکتا تھا۔ انقلاب کے بعد بھی یہ جگہ عوام سے الگ تھلگ رہی۔

ایچ۔ جی۔ ویلس نے اپنی کتاب ''RUSSIA IN THE SHADOW'' میں لکھا تھا جب 1920 میں وہ ماسکو آیا اور لینن سے ملاقات کی اس وقت بھی کریملن کے دروازے لوگوں کے لیے بند تھے اور بڑی مشکل سے ہمیں پاس اور پرمٹ ملتے تھے تاکہ ہم محل کے دروازوں سے باہر نکل سکیں۔

اسٹالن کے بعد، خاص کر اس کے آخری دور میں جب کہ وہ مکمل ڈکٹیٹر بن چکا تھا اور عوام اور پارٹی سے بہت دور ہوگیا تھا۔ اس وقت بھی کریملن کی ایک پراسرار شخصیت تھی۔ کریملن کا

ہر دروازہ بند تھا اور چاروں طرف خفیہ ماحول، زیرِ لب اور ان کہی باتوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔

روسیوں کے لیے یہ جگہ طاقت اور اقتدار کا مرکز بن کے رہ گئی اور لوگوں نے اس جگہ سے دور رہنا ہی مناسب سمجھا اور باہر کی دنیا کے لیے یہ جگہ اور پُر اسرار ہوتی گئی۔ طاقت کا بے جا استعمال جس کو سوشلزم کے دشمنوں اور پرچارکوں نے جبر و استبداد کا نام دیا۔

کریملن کی اس پالیسی کو جہاں کہ لوگ نہ آپس میں مل سکتے تھے نہ آ سکتے تھے اور نہ ہی باہر جا سکتے تھے۔ آئرن کرٹن IRON CURTAIN کے نام سے پکارا گیا اور اس پالیسی کی وجہ سے سوویت یونین باقی دنیا سے بالکل علیحدہ ہو گیا۔

اب یہ بند دروازے کھل رہے تھے اور اب ہم لوگ کیو 'Q' میں کھڑے ہو کر کریملن میں جانے کا ٹکٹ خرید سکتے تھے اور جہاں ہمارا جی چاہتا تھا جا سکتے تھے۔ ہم زار کے محلوں کے اندر جا کر دیواروں پر بنائی ہوئی خوب صورت تصویروں کو دیکھ سکتے تھے۔ ہم ان انمول خزانوں کا مطالعہ کر سکتے تھے جو ایک مدت ہوئی زارِ روس کی ملکیت تھے اور آج عوام کی ملکیت سمجھے جاتے ہیں۔

یہ اس دن کی بات ہے کہ میں نے نکیتا خروش چیف کا نام پہلی بار سنا۔ یہ خروش چیف ہی کا خیال تھا کہ کریملن کے راستے عوام پر کھول دیے جائیں۔ یہ بات مجھے ایک روسی دوست نے بتائی اور میں نے اسے کہا کہ میں سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے پہلے سکریٹری کا نام پہلی بار سن رہا ہوں۔ جس نے اسٹالن کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیا ہے اور سوویت یونین سے باہر اسے کوئی نہیں جانتا۔

میرے دوست نے مجھے اس دوست کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ اس نے کہا کہ یہ انسان صرف ایک خیال کا جنم داتا نہیں بلکہ کئی دلچسپ اور اہم خیال اس کے دل و دماغ سے نکلتے ہیں۔

یہ زراعتی نمائش جو نقش و نگار سے ملبوس ہے جسے دیکھ کر روسی زراعت کی لا مثال کامیابی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ بھی خروش چیف ہی کے دماغ کی ایجاد ہے۔ جیسا میرے دوست نے 'کنواری زمین' کے پروگرام کے متعلق قصہ سنایا کہ کس طرح اسّی ہزار لڑکے اور لڑکیاں جو کوسومال KOMSOMAL اسکول، کالج اور دیگر اداروں میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ خروش چیف کے کہنے پر سائبیریا کے بنجر علاقوں میں گئے اور قزاقستان اور اس بنجر زمین میں ہل چلا کر کئی لاکھ ایکڑ زمین کو سرسبز و شاداب کر دیا اور اس خوراک کی کمی کے مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے خاص کر دیا یہ کرشمہ خروش چیف کا ہی تھا۔

جب میں نے اس زراعتی انقلاب کے بارے میں یہ ان سے سنا کہ کس طرح 20 ہزار ٹریکٹر کی فوج اور دس ہزار کمبائنس COMBINES نے مل کر ایک وسیع علاقہ جو رقبہ کے لحاظ سے کئی یورپ کے چھوٹے ملکوں سے زیادہ ہوگا اس میں ہل چلایا۔

'یہ تجربہ واقعی ایک معجزہ کے برابر تھا'

لیکن اس سے زیادہ اس بات سے متاثر ہوا کہ کریملن کے دروازے عوام پر کھل گئے ہیں اور میں اپنی آنکھوں سے ہزاروں پردیسیوں کو آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی اپنی ہی آزادی کو پرکھنے کے لیے گھروں سے باہر نکلے تھے تاکہ انھیں یقین ہو جائے کہ وہ واقعی کریملن کے اندر آ جا سکتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے خروش چیف کے متعلق زیادہ پوچھ گچھ کی اور مجھے معلوم ہوا کہ خروش چیف کا جنم عام گھرانے میں ہوا۔ جوانی کے دنوں میں انھیں مختلف کام کرنے پڑے کبھی انھیں گڈریا بننا پڑا کبھی کوئلے کی کان میں بحیثیت ایک مزدور کے کام کرنا پڑا۔ کبھی ایک میکینک بننا پڑا اور کبھی ایک لوہار کا پیشہ اختیار کرنا پڑا جو تالوں کی چابیاں بنانے کا ماہر تھا اور اب تالے کی چابی بنانے والے نے کریملن کے تالے توڑ دیئے تھے۔ اس کے دروازے کھول دیے تھے۔

1954 کے بعد، میں تقریباً ہر سال سوویت یونین آتا رہا اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ دن بدن یہ دروازے اور کھلتے جا رہے ہیں۔ لوگ زیادہ سے زیادہ اندر آ رہے تھے اور باہر جا رہے تھے اور ایک ایسے دیش سے جہاں چند سال قبل دونوں اطراف سے آمد و رفت بند تھی۔ اس کا سلسلہ بڑی خاموشی سے سرکاری اور نیم سرکاری ڈیلی گیشن سے شروع ہوا۔ میری آمد بھی اسی طرح ہوئی۔ میں پروڈیوسر اور فلمی ستاروں کے ڈیلی گیشن کا لیڈر منتخب ہو کر آیا تھا۔

دورہ تین ہفتہ کا تھا۔ اس سفر کے بعد مجھے ہندوستانی ادیبوں کے ڈیلی گیشن میں شامل ہونے کی دعوت ملی۔ اس ڈیلی گیشن کو سوویت ادیبوں کی کانگریس میں شامل ہونے کے لیے بلایا گیا۔ اسی اثناء میں ہندوستانی آرٹسٹ، سنگیت کاروں اور ناچنے والوں کا ایک ڈیلی گیشن سوویت یونین کے مختلف حصوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ لینن گراڈ اور دیگر شہروں سے ہوتے ہوئے تاشقند کی طرف جا رہا تھا۔ یہ حصہ روس کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کے بعد سوویت یونین میں کلچر ڈیلی گیشن کا ایک تانتا بندھ گیا، ہر ملک کے آرٹسٹ، ادیب، سائنسداں، طلبا،

مزدور، زراعت کے ماہرین، انجینئر، ٹیکنیشن، وکلاء، جرنلسٹ ڈیلی گیشن بنا کر اس ملک کی طرف رخ کرنے لگے۔

یہ بند دروازے دونوں طرف کھل گئے تھے۔ مختلف لوگوں نے آنا جانا شروع کیا اور شک وشبہ اور جہالت کی تہیں تار تار ہو گئیں اور لوگوں کو سوویت یونین کے متعلق اصل حقیقت کا پتہ ملا اور اسی روسیوں کو باقی دنیا کے متعلق مختلف قسم کے انکشاف ہوئے۔

یہ سرکاری تبادلہ کافی نہیں تھا۔ اگر عام لوگوں کے لیے آنے جانے کے راستے نہ کھلتے اور اس سوویت یونین کی طرف سے آمدورفت کی سہولتیں نہ ملتیں اب ہر سال ٹورسٹوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے لوگ صرف ماسکو اور لینن گراڈ دیکھنے نہیں آتے بلکہ چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں کو دیکھنے آتے ہیں۔ بہت سے ٹورسٹ اپنی کاروں میں بیٹھ کر سارے دیش کا سفر کرتے ہیں۔ پچھلے سال صرف امریکہ سے گیارہ ہزار ٹورسٹ روس دیکھنے آئے۔ یہ بات تقریباً ہر شخص جانتا ہے کہ اسٹالن کے عہد میں روس میں آنا آسان کام نہ تھا۔ مجھے 1983 میں پاسپورٹ نہیں ملا تھا۔ اسی لیے مجھے خروش چیف کی اس پالیسی کی تعریف کرنا پڑتی ہے کہ انھوں نے حالات کو صرف بدلا ہی نہیں بلکہ لوگوں کو روس آنے کی دعوت دی اور ٹورسٹ کو مختلف قسم کی سہولتیں دیں۔

1954 میں ماسکو شہر میں صرف آدھے درجن ہوٹل تھے لیکن 1960 میں ہوٹلوں کی تعداد دو درجن ہو گئی۔ میں نے اپنے دوستوں سے اکثر اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ماسکو میں زیادہ امریکن ٹورسٹ نظر آتے ہیں۔ میں امریکی ٹورسٹ کا خصوصاً اس لیے ذکر کرتا ہوں کہ سرد جنگ کی وجہ سے روس اور امریکیوں کے تعلقات کافی کشیدہ ہیں لیکن دن بدن صورت حال بدل رہی ہے اور امریکی ٹورسٹس کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ ان ٹورسٹ میں سینٹر بھی ہوتے ہیں، جرنلسٹ بھی اور اسی طرح ڈاکٹر، وکیل، عام کسان، تجارت کرنے والے اور مویشی پالنے والے بھی۔ انہی لوگوں سے مل کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ روسی عوام کی مہمان نوازی سے بہت خوش ہیں۔

لیکن اس کے باجود یہ احساس ابھی تک لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہے کہ سوویت یونین ایک پراسرار دیش ہے اور باہر کے آنے والوں کے لیے اس ملک کے دروازے بند ہیں۔ یہ احساس۔ اسٹالن کے عہد کا رینگتا ہوا سایہ ہے اور کچھ ان لوگوں کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے

جو یہ نہیں چاہتے کہ روس اور امریکہ کے درمیان صلح و آشتی کی فضاء قائم ہو۔

جب خروش چیف اور امریکی کانگریس کے لیڈروں کے درمیان گفتگو ہوئی تو دونوں گفتگو میں شیئر ڈیورٹ۔م۔ ڈرکن جوری پبلک پارٹی کے لیڈر ہیں۔ انھوں نے خروش چیف سے پوچھا کہ کیا آپ اس امر کی اجازت دیں گے کہ غیر ملکی ٹورسٹ آزادانہ طور پر سوویت یونین میں گھوم سکیں اور ساتھ ہی یہ کہا کہ روسیوں کے لیے امریکہ دیکھنے اور گھومنے کے لیے کوئی پابندی نہ لگائی جائے گی۔ اس وقت خروش چیف نے جواب دیا۔ آیئے ہم اس بات پر سمجھوتہ کرلیں کہ جتنا علاقہ روسیوں کو امریکہ میں سیاحت کی غرض سے دکھایا جائے گا۔ ہمارے ملک میں اس سے دوگنا علاقہ امریکی ٹورسٹ کو دیکھنے کے لیے ملے گا۔ مگر مجھے تو بتایا گیا ہے کہ روسی سفیر کو واشنگٹن سے لے کر نیویارک تک پہنچنے کے لیے خاص اجازت لینی پڑتی ہے۔ میں آپ کی اندرونی پابندیوں پر تنقید نہیں کرنا چاہتا میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا جہاں جی چاہے سفر کرسکیں۔ سوویت یونین میں جو پابندیاں ٹورسٹوں پر لگائی گئی ہیں انھیں آپ ہٹانا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں معاہدہ کرنا ہوگا کہ بیرونی ممالک میں جتنے آپ کے فوجی اڈے ہیں انھیں ہٹانا ہوگا، بیرونی ملکوں سے اپنی فوجیں واپس بلانی ہوں گی تاکہ وہ اپنی قومی حدوں کے اندر رہ سکیں۔ اس کے بعد آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں آپ کا جی چاہے گا آپ جاسکیں گے۔ اس لیے اس عرصہ تک ہم چند علاقوں پر پابندیاں لگائیں گے تاکہ ہمارے ملک کا 'دفاع' مضبوط رہے۔

یہ بات کہہ کر خروش چیف نے صاف بتایا کہ وہ چند علاقوں پر یا چند جگہوں پر کیوں پابندیاں لگاتے ہیں۔

لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ عام دیانت دار ٹورسٹ کے لیے اس خوب صورت دیش کو دیکھنے کے لیے کوئی پابندی نہیں ہے گو مجھے معلوم ہے کہ کچھ دن پہلے ٹورسٹوں کے لیے کچھ علاقے ممنوع تھے۔ وہ اس لیے نہیں کہ یہاں راکٹوں کے اڈے ہیں بلکہ اس لیے کہ ان علاقوں میں ٹھہرنے کے لیے اچھے ہوٹل نہ تھے۔ جہاں باہر سے آنے والے مہمانوں کی اچھی طرح سے خاطر تواضع ہو سکے۔

اس طرح اس تالے چابی کے ماہر لوہار نے کتنے ہی مختلف دروازے کھول دیے۔ 1954

میں — مَیں تین مہینے سوویت یونین میں رہا۔ اس دوران میں میرے کافی دوست بن گئے لیکن ایک واقف کار نے بھی مجھے اپنے گھر میں نہیں بلایا بلکہ پبلک ریستورانوں میں میری دعوت کرتے رہے۔ ان دنوں کسی پردیسی کو اپنے گھر دعوت دینا خطرہ سے خالی نہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح جب ہم اپنی کار اپنے سفارتخانے کے دروازے کے باہر ٹھہراتے تھے تو ہمارے روسی مترجم وہیں کار میں ہی واپسی تک انتظار کرنا بہتر سمجھتے تھے۔ ہندوستانی سفارتخانے میں قدم نہ رکھتے تھے لیکن 1958 میں حالات بدل گئے۔ اب ہمارے ترجمان نہ صرف ہمارے سفارتخانہ میں آنا پسند کرتے ہیں بلکہ اس بات پر مصر ہو جاتے ہیں کہ میں ان کے پریوار کے ساتھ بیٹھوں اور بات چیت کروں اور اب تو کسی روسی دوست کے گھر جانا اتنا ہی آسان ہو گیا ہے جتنا کہ ہم کسی ہندوستانی یا امریکی دوست کے گھر بغیر کسی روک ٹوک کے چلے جاتے ہیں۔ اس قسم کی بے راہ روی ہم لندن اور پیرس میں نہیں برت سکتے۔ جہاں روایتی ملاقاتوں کو زیادہ رواج ہے۔ آنے جانے والوں پر پابندی ہٹ رہی ہے اور شخصی تعلقات میں زیادہ آزادی حاصل ہے لیکن جو آزادی آج سوویت کے باشندوں اور غیر ملکی ٹورسٹ کو حاصل ہے وہ اسٹالن کے عہد میں کسی کو میسر نہ تھی۔

کئی سو ہندوستانی انجینئروں، ٹیکنیشیوں کو یوکرین کے لوہے کے کارخانے میں ٹریننگ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ وہاں پر کئی ایک نے روسی لڑکیوں سے شادیاں کر لیں۔ انھیں روسی حکومت نے اجازت دیدی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو ہندوستان لے جاسکیں۔ میرے اپنے دو اسسٹنٹوں نے ماسکو میں شادی کر لی۔ ایک وہیں رہتا ہے اور کام کرتا ہے، دوسرا اپنی بیوی سمیت ہندوستان آ گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خروشچیف نے اس قسم کی شادیوں کے لیے بھی قانونی طور پر ہر شخص کے لیے دروازے کھول دیے ہیں کہ وہ اپنی رفیقۂ حیات چن سکیں لیکن ظاہر ہے کہ روسی لوگوں میں کچھ اچھا نہیں سمجھتے کہ ان کی لڑکیاں غیر ملکی مردوں سے شادیاں کریں۔ خاص کر اس قسم کی شادیاں جہاں لڑکیوں کو اپنا وطن چھوڑنا پڑتا ہے اور دوسرے دیس کو اپنانا پڑتا ہے۔ جیسا کہ بھلائی کے فولاد کے کارخانے میں ہوا ہے لیکن مجھے یہ بات سن کر خاص حیرت نہیں ہوئی کیونکہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ روسی عوام بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہی ہیں۔

اہمیت اس بات کی ہے کہ خروشچیف نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ باہر کے لوگ

روس میں آئیں اور اس دیش کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اسی طرح روس کے رہنے والے باہر جائیں اور دوسرے ملکوں کو خود دیکھیں۔ شروع شروع میں سوویت ٹورسٹوں کا قافلہ چھوٹا سا تھا جو کمیونسٹ ملکوں کے علاوہ صرف فن لینڈ، فرانس، برطانیہ اور سویڈن جاتے تھے لیکن اب تو سوویت ٹورسٹ '52' ملکوں کا سفر کر سکتے ہیں۔ ان روسی ٹورسٹوں کے علاوہ۔ ہوٹل منیجر، لباس پہنانے والے، لباس بنانے والے، مکان تعمیر کرنے والے اور اسی طرح مختلف شعبوں سے مختلف افراد مغربی ممالک میں بھیجے جاتے ہیں۔۔۔ اسی طرح سے ہزاروں روسی انجینئر اور ٹیکنیشین، ہندوستان، مصر اور افغانستان میں کام کر رہے ہیں اور مختلف ملکوں کے مختلف سیاسی اور سماجی اداروں سے ان کی واقفیت ہوتی ہے۔ دور دراز کے ملکوں کے سفر کا شوق اتنا بڑھ گیا ہے کہ جب کبھی میں ایک یا دو سال کے بعد روسی دوست سے ملتا ہوں تو اس سے ضرور پوچھتا ہوں کہ تم باہر گئے تھے تو وہ اکثر جواب دیتا ہے کہ وہ اس عرصہ میں فرانس، انگلینڈ، سویڈن، جاپان امریکہ کی سیر کر کے آیا ہے۔ اس قسم کی آمدورفت سے روسیوں کے ذہنوں میں ایک نئی تبدیلی آئی ہے وہ مختلف ممالک کے لوگوں سے ملتے ہیں۔ ان کے سیاسی اور سماجی حالات سے آگاہ ہوتے ہیں۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ باقی ملکوں کے لوگ کس طرح کام کرتے ہیں کیا سوچتے ہیں اور ان تمام باتوں کا اثر ان کے ذہن پر پڑتا ہے اور ان میں ایک خوداعتمادی کی اسپرٹ کا اضافہ ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست نے امریکہ سے واپس آکر بتایا۔ جب تک میں نے امریکہ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا میرے ذہن میں اس ملک کے متعلق عجیب باتیں تھیں۔ اب امریکہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور یہ ملک اتنا بُرا بھی نہیں اور اتنا اچھا بھی نہیں۔ ان کے پاس روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بے شمار ہیں۔ کوئی بات نہیں ہم بھی بہت جلد یہ سب تیار کر لیں گے۔ جہاں تک کلچر کا تعلق ہے، ہمارے عوام کو اس قسم کی مراعات زیادہ میسر ہیں اور ہمیں امریکہ سے حسد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس وقت ماسکو یونی ورسٹی اور دیگر تعلیمی درسگاہوں میں '52' ملکوں سے کئی ہزار طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مختلف ملکوں سے طلبا کے تبادلہ کے لیے معاہدے ہوتے ہیں اور ان معاہدوں کے تحت روسی طلبا، امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔۔۔ آج روسی عوام کے

لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ امریکی فلمیں دیکھ سکیں۔

اب روسی عوام بی بی سی سے نشر کیے ہوئے پروگراموں کو سن سکتے ہیں۔ یہاں تک 'امریکہ کی آواز' کے نشر کیے پروگرام سنتے ہیں اور اپنے ٹیپ ریکارڈر سے اپنی من پسند کا سنگیت ریکارڈ کرتے ہیں اور اپنی محفلوں میں انھیں گاتے ہیں اور ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اسی طرح پر اودا میں امریکن سیاستدانوں کی تقاریر پوری تفصیل سے چھپتی ہیں اور اگر مغربی ملک کا کوئی بڑا آدمی آتا ہے تو ٹیلی ویژن پر اس کا انٹرویو ہوتا ہے۔ چاہے اس کی تقریر سرمایہ داری کے حق میں ہو یا نہ ہو اور لوگ بڑی دلچسپی سے ان پروگراموں کو دیکھتے ہیں۔

جو دروازے اور کھڑکیاں خروش چیف نے کھولی ہیں۔ ان کا عوام کو پتہ ہے۔ دوسرے لوگ بھی ان سے آگاہ ہیں اور روسی عوام بھی ان نئے دروازوں کو اپنے ذہن میں بھی کھلتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔

1957 میں دنیا کے نوجوانوں کا میلہ ماسکو میں ہوا۔ یہ خروش چیف کی نئی پالیسی کی سب سے بڑی روشن مثال ہے۔

اسٹالن جس نے مجھے بھی روس آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ضرور اپنے شیشے کے کفن میں ایک بار چونکا ہوگا۔ جب اس نے ایک سو ملکوں کے آئے ہوئے 35000 طلبا کو ماسکو کے گلی کوچوں میں گھومتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ جن ملکوں سے ان طلبا کی بھاری تعداد آئی تھی ان میں سرمایہ دار ممالک کی تعداد کافی تھی۔ میں ان دنوں ماسکو میں تھا اور اپنی فلم بنانے میں مشغول تھا۔ آنے والے طلباء میں سے کافی اسٹوڈنٹ ایسے تھے جو کیمونسٹ نظریے میں یقین نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی انھیں کیمونسٹوں سے ہمدردی تھی۔ کچھ طلبا ایسے تھے جنھیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ محض ملک کو دیکھنے، کھانے، پینے اور تفریح کرنے کے لیے آئے تھے۔ ہاں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے اور ان کی تعداد بہت کم تھی جو سوویت یونین کے مخالف نظر آتے تھے۔

میں نے چند امریکنوں کو ریڈ اسکوائر میں U.N.O کا ریزولیشن ماسکو نواسیوں کو انگلش میں پڑھ کر سناتے دیکھا۔ پھر انھوں نے اس کا روسی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ریزولیشن ہنگری کے متعلق تھا۔ ان لوگوں نے اپنا حق ادا کر کے اپنے ہوٹلوں کی طرف رخ کیا۔ ریڈ اسکوائر میں کھڑے

ہوئے مجمع نے ان لوگوں سے کسی قسم کی بے رخی نہیں برتی۔ ہوسکتا ہے ان آئے ہوئے طلبا میں کچھ مغربی ملکوں کے جاسوس بھی ہوں کچھ لوگوں کو تنبیہ بھی کی گئی تھی لیکن خروش چیف کا خاص حکم تھا کہ جس شخص نے فیسٹول کا بیج لگایا ہے۔ اسے پولیس گرفتار نہیں کرسکتی۔ پولیس نے چند نوواردوں کو مختلف جگہوں کے فوٹو لیتے ہوئے پکڑا اور جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کیوں ان جگہوں کا فوٹو لے رہے ہیں یا ان جگہوں کا بغور مطالعہ کررہے ہیں تو ان لوگوں نے بتایا کہ وہ راستہ بھول گئے ہیں۔ بہرحال اس قسم کے تمام لوگوں کو واپس ہوٹلوں میں پہنچایا گیا اور ان کی آزادی پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی لیکن ان لوگوں کو فوراً اس بات کا احساس ہوگیا کہ یوں چھپ کر گھومنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ جو کچھ وہ کررہے تھے یا کریں گے ان پر کڑی نگاہ رکھی جائے گی۔

اس فیسٹول کے لیے کریملن کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ روشنی سے منور کیے ہوئے زار کے محلوں میں بیس ہزار لڑکے اور لڑکیاں سارے راستے گاتے ناچتے رہے اور یہی وہ جگہ تھی جہاں خروش چیف نے بڑی شاندار گارڈن پارٹی دی۔ یہ پارٹی دنیا کی تاریخ میں ایک شاندار واقعہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس پارٹی میں خروش چیف نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، انگلینڈ، امریکہ اور فرانس کے علاوہ دیگر ملکوں کے طلبا آئے ہوئے تھے۔ کچھ مخالف ملکوں کے ڈیلی گیٹ بھی کھڑے تھے۔ اس وقت خروش چیف نے کہا:

''آج آپ کریملن میں کھڑے ہیں اور آپ بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں کوئی پراسرار چیز نہیں۔'' خروش چیف یہ بھی کہہ سکتے تھے۔ کریملن کے دروازے اب کھل گئے ہیں اور سبھی کے لیے کھلے رہیں گے۔ اگر آپ امن اور شانتی سے ادھر آئیں گے خروش چیف نے ماسکو اور کریملن کے دروازے کیوں کھولے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسٹالن نے بند دروازے کی پالیسی شاید اس لیے اختیار کی تھی کہ وہ سرمایہ داروں کی نفرت سے آگاہ تھا اور اسے ڈر تھا کہ سوویت یونین جو دوسری جنگ میں حصہ لے کر کافی کمزور ہوگیا تھا، شاید اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کی تاب نہ لا سکے اور لامحالہ اسے اس قسم کی ''بند دروازے کی پالیسی بنانی پڑی لیکن آج حالات مختلف ہیں۔ خروش چیف اپنے ملک کی طاقت کو بخوبی جانتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے ایک موقع پر اس بات کا اعلان کیا تھا کہ دریافتوں کی وجہ سے اس کرۂ ارض پر جنگ کا ہونا ممکن نظر نہیں

آتا‘‘ اور ساتھ ہی ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ دنیا میں اس وقت سرمایہ داروں میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ ہمارے ملک میں سرمایہ داری نظام واپس لاسکیں۔ سرمایہ داری اب اس ملک میں نہیں لاگو کی جاسکتی۔ سوشلزم فتحیاب ہو چکا ہے۔ صرف وقتی طور پر ہی نہیں بلکہ مستقبل بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔‘‘

○

کامریڈ، دوکان میں جوتا ہے

''جس خدا نے ہمیں مچھلی دی ہے وہ ہمیں روٹی بھی دے گا'' (روسی کہاوت)

یہ 1954 کی بات ہے کہ مجھے اپنے ترجمان کے ساتھ پورا دن ماسکو کے بازاروں میں صرف کرنا پڑا۔

یہ صاحب ایک جوتے کی تلاش میں تھے کیونکہ وہ اپنی ماں کی سالگرہ پر ایک جوتا بطور تحفہ پیش کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی والدہ دو سال سے ایک ہی جوتا پہنے ہوئے تھیں اور اس لیے انھیں اپنی ماں کو یہ تحفہ دینا ہی چاہیے۔

وانیا VANYA میرے ترجمان کا نام تھا اور اس کی یہ خواہش بڑی نیک اور ایک معمولی سی تھی۔ وانیا کو ایک ہزار روبل ماہوار تنخواہ ملتی تھی اس لیے وانیا کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ وہ اپنی ماں کے لیے ایک جوتا نہ خرید سکے۔ میں بھی اس کے ساتھ ہو گیا کیونکہ امید تھی کہ ہم ایک گھنٹہ کے اندر جوتا خرید کر واپس ہوٹل آ جائیں گے لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ ماسکو میں اس وقت ایک جوتے کا خریدنا اتنی آسان بات نہ تھی۔ یہ بات اسٹالن کی موت کے ایک سال کے بعد کی ہے۔

جتنی دوکانوں پر ہم گئے جوتے کہیں دکھائی نہیں دیے۔ وانیا یہی سوال کرتا 'کامریڈ کیا تمھارے پاس جوتے ہیں؟' مال بیچنے والا خالی الماریوں کی طرف اشارہ کرتا۔ جہاں جوتوں کو

ہونا چاہیے وہاں بدقسمتی سے جوتے نہ تھے کچھ دوکانوں پر ایک جوتا ملا لیکن اس کی قیمت چھ سو روبل تھی اور وانیا کے بٹوے میں صرف چار سو روبل تھے۔ بڑی مشکل سے ایک دوکاندار سے سیکنڈ ہینڈ جوتا ملا۔ جس کی قیمت سو روبل تھی۔ اس دوکان پر زیادہ تر پرانی چیزیں ملتی تھیں۔

اس سال جب میں ماسکو کے بازاروں میں دوبارہ گزرا تو دوکانیں جوتوں سے بھری پڑی تھیں۔ بہت سی دکانوں میں بڑے خوب صورت اور حسین جوتے رکھے ہوئے تھے۔ اونچی ایڑی والے جوتے۔ نرم چمڑے کے جوتے جن کی نوکیں چھوٹی اور باریک تھیں اور خروش چیف کے عہد کے نوجوانوں کو زیادہ پسند تھیں۔ گو یہ جوتے کافی مہنگے تھے۔ لندن میں اس قسم کے جوتے سستے ملتے ہیں اور بمبئی میں لندن سے بھی سستے لیکن 1954 کے مقابلہ میں ان جوتوں کی قیمت پہلے سے آدھی تھی۔ اگر آج وانیا کو اپنی ماں کے لیے ایک نفیس جوتا خریدنا پڑتا تو اسے کم سے کم 200 روبل خرچ کرنا پڑتے۔

یہ درست ہے کہ انسان صرف جوتے پہن کر زندہ نہیں رہتا لیکن یہ ایک امید افزا بات ہے کہ سوویت دیش کے رہنے والے 1917 کے انقلاب کے بعد اب اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور اچھے جوتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ میں اس بار خصوصاً روسیوں کے جوتے دیکھتا رہا کیونکہ ایک سال قبل میں نے امریکن میگزین میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ جس میں ایک امریکن جرنلسٹ نے لکھا تھا کہ کسی بھی ہوائی اڈے پر آپ کسی مسافر کے جوتے دیکھ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ کس ملک سے آیا ہے۔ اگر اس مسافر کے جوتے بے ڈول، پھٹے ہوئے اور بغیر پالش کے ہوں تو سمجھ لیجیے کہ 'جناب ماسکو سے تشریف لائے ہیں'

صرف خروش چیف نے ہی اس کا اندازہ نہ کیا تھا۔ بلکہ اسٹالن کے مرنے کے بعد جو حکومت برسر اقتدار آئی ان سب نے اس بات کا احساس کر لیا تھا کہ لوگوں کی ان جائز مانگوں کو پورا کیا جائے۔ اسٹالن کے مرنے کے بعد جب مال نکوف پرائم منسٹر بنا تو اس نے سب سے پہلے ان چیزوں کی طرف دھیان دیا اور عام استعمال کی چیزوں میں خاطر خواہ اضافہ چاہا۔ ایک بار تو یوں بھی سوچا گیا کہ لوہے کی پیداوار کم کی جائے اور جوتے زیادہ تیار کیے جائیں لیکن اس قسم کی پالیسی سے اچھے نتائج برآمد نہ ہوسکتے تھے۔ خروش چیف نے لوگوں کی

روزمرہ کی مانگوں اور ضرورتوں کا زیادہ احساس کیا کیونکہ خروش چیف اکثر عوام سے ملتے رہتے تھے۔

انھوں نے اس مسئلہ کا حل یوں نکالا کہ صنعتی اور زراعتی ترقی کی رفتار کو تیز تر کر دیا جائے اور اس کے ساتھ تجارت صرف سوشلسٹ ملکوں کے ساتھ ہی نہ ہو بلکہ بین الاقوامی سطح پر ہر ملک سے تجارت کی جائے۔ اجتماعی لیڈر شپ کے قول کو اپناتے ہوئے خروش چیف نے چار اہم نکات پر پروگرام تیار کیا۔

1. بین الاقوامی کشیدگی کو کم کیا جائے اور ہر ملک سے تجارتی تعلقات قائم کیے جائیں۔
2. زراعتی پیداوار کو بڑھایا جائے۔ پارٹی کے دیانتدار اور محنتی لوگوں کے سپرد یہ کام کیا جائے اور نوجوانوں کو اس کام پر معمور کیا جائے اور دور دراز قصبوں میں جا کر 'کنوارے کھیتوں' کو آباد کریں۔
3. بڑی انڈسٹری کی پیداوار کو کم نہ کرتے ہوئے لوگوں کے پہننے اور استعمال کرنے کی چیزوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔
4. سارے ملک میں عام استعمال کی چیزوں کی مساوی اور قابل ستائش تقسیم ہونا چاہیے تا کہ ہر شخص تک یہ چیزیں بہ آسانی پہنچ سکیں۔

خروش چیف کو لوہے کی پیداوار اور جوتوں کی تیاری میں کوئی تضاد نظر نہ آیا۔ ایک تجربہ کار انسان کی حیثیت سے خروش چیف کو معلوم ہے کہ لوہے کی ضرورت اس لیے ہے کہ زیادہ مشینیں تیار ہوں تا کہ زیادہ تعداد میں جوتے تیار کیے جائیں۔ خروش چیف بیرونی ملکوں کی تجارت کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اس طریقہ کار سے بین الاقوامی کشیدگی کم ہو جائے۔ تا کہ مختلف ملکوں کے درمیان ایک پرامن فضا قائم ہو سکے۔ انھوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے آمریت کا سہارا نہیں لیا بلکہ وہ عام انسانوں سے خود ملے۔ ان سے گفتگو کی انھیں سمجھایا اور انھیں زیادہ کام کرنے کی تلقین کی تا کہ عوام کی زندگی زیادہ آسودہ اور خوشحال ہو سکے۔

ایک بار جب میں 1957 میں ماسکو گیا اور میں اپنے ہندوستانی اور روسی دوستوں سے ملنے کے لیے ان کے گھر پہنچا تو میں نے ان کے دروازوں کے باہر ایک بھری ہوئی بالٹی کو دیکھا، جس میں گھر کا بچا کھچا کھانا، پھلوں کے چھلکے اور سڑی ہوئی ترکاریاں پڑی تھیں۔

یہ کیا ہے؟ میں نے اپنے دوستوں سے پوچھا۔ آپ نے ان گندی چیزوں کو اس بالٹی میں کیوں جمع کر رکھا ہے۔ نیچے کیوں نہیں پھینک دیتے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ خروش چیف کی چلائی ہوئی مہم ہے جس کی رو سے سُوروں کو زیادہ توانا اور موٹا کیا جائے گا۔ باہر سے آنے والے دوستوں کو اس مہم کے متعلق بہت کم علم تھا اور اندرونی صورت حالات کیسے ہیں۔ جانوروں کی تعداد کتنی ہے، گوشت کتنا چاہیے اس کے متعلق ہم لوگوں کو بہت کم واقفیت تھی۔ اس لیے بہت سے لوگ اس مہم کا مذاق اڑاتے رہے۔

لیکن مجھے 1954 کا زمانہ یاد تھا۔ جب قصائیوں کی دوکانوں کے سامنے گوشت خریدنے کے لیے لمبی قطاروں میں کھڑا ہونا پڑتا تھا اور ریستورانوں میں گوشت کی پلیٹوں کی قیمت کیا تھی، میں جانتا تھا کہ ان دنوں ہمارے روسی دوستوں کو بہت کم تازہ گوشت ملتا تھا اور زیادہ تر ترکاریاں استعمال کرنا پڑتی تھیں۔ مجھے یہ بھی یاد کہ مکئی کی پیداوار بڑھانے کے لیے جب خروش چیف نے مہم چلائی تو لوگ اکثر ہنستے تھے اور اس مہم کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان دنوں خروش چیف کو 'بھٹے والا' کہتے تھے۔ اس بات کو بہت کم لوگ سمجھتے تھے کہ مکئی کی پیداوار بڑھانے سے ہی اس قسم کے حیوانوں کی تعداد بڑھے گی کیونکہ پہلی جنگ میں تو جانوروں کا صفایا ہو گیا تھا۔

جب خروش چیف نے مکھن، دودھ اور گوشت کی پیداوار کے سلسلے میں پلان بنایا تاکہ وہ امریکہ سے بازی لے جائے تو لوگوں نے اس پلان کو ایک سیاسی قلابازی سمجھا۔ حالانکہ یہ کوئی سستا نعرہ نہ تھا بلکہ عوام کی بنیادی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر خروش چیف نے یہ پلان بنایا تھا تاکہ لوگ زیادہ محنت کر سکیں، اس طریقہ سے پیداوار میں اضافہ کر کے لوگ زیادہ خوشحال اور آسودہ ہو جائیں لیکن لوگ مذاق اڑانے سے باز نہ آئے اور اکثر یہ کہتے کہ 'بھئی سُوروں کو موٹا کرنے کے لیے کیا کر رہے ہو؟ اور کمیونزم کو تعمیر کرنے کے لیے سُوروں کی پیداوار بڑھاؤ۔'' فقرے کسنے والوں کی گردنیں اس وقت نیچی ہو گئیں جب خروش چیف نے سپریم کورٹ کے جلسہ میں اعلان کیا کہ 1959 کی پیداوار نے ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے مکھن اور دودھ کی پیدوار امریکہ سے زیادہ ہے حیوانوں کی تعداد بھی پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ سُوروں کی تعداد پہلے سے لاکھ زیادہ ہے۔ بھیڑوں کی تعداد میں 30 لاکھ کا اضافہ ہوا ہے ان چار سال میں گوشت کی پیداوار میں بھی

کافی اضافہ ہوا ہے۔ روسی فیڈ ریشن نے اس سال 4200000 ٹن گوشت تیار کیا۔ پچھلے سال سے ایک لاکھ ٹن زائد۔

لیکن امریکہ کے مقابلہ میں اب بھی کافی کم ہے۔ مگر پہلے سے قیمتیں بہت گر گئی ہیں۔ 1954 سے آج کے کھانے پینے کی چیزوں کی قیمتیں آدھی رہ گئی ہیں۔ قصائیوں کی دوکانوں پر اب کیو 'Q' نہیں لگتے اور ان دوکانوں پر ہر قسم کا گوشت ملتا ہے۔ خروش چیف مکئی کی پیداوار اس لیے بڑھانا چاہتے تھے تاکہ سوروں اور دوسرے مویشیوں کی پیداوار بڑھے اور لوگ کم قیمت پر جانوروں کا گوشت خرید سکیں اور اسی طرح جوتے بھی تیار ہو سکیں گے۔ اگر کھانے کے لیے زیادہ گوشت ملے گا تو اسی طرح زیادہ جوتے بنانے کے لیے زیادہ چمڑہ ملے گا۔ یہ بات بڑی معقول مگر سیدھی سادھی ہے۔

عام استعمال کی چیزوں کی بہتات روس میں اب روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ دوکانیں اشیاء خوردنی سے بھری پڑی ہیں۔ کپڑے، جوتے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، حجامت کرنے کی الیکٹرک مشین۔ نائی لان کی جرابیں، ریفریجیٹر اور اس قسم کے بجلی کے سامان سستے داموں میں فروخت ہوتے ہیں اور عام انسان ان تمام چیزوں کا استعمال کر سکتے ہیں۔

پچھلے پانچ سالوں میں بجلی کی پیداوار میں 17 فیصد اضافہ ہوا اور صرف ماسکو میں ہی نہیں بلکہ اب تو چھوٹے چھوٹے شہر بھی بجلی کی روشنیوں سے جگمگا رہے ہیں۔

کچھ سال قبل روسی شہر کافی اداس اور اندھیرے میں ملبوس نظر آتے تھے لیکن اب گلیوں اور بازاروں میں بجلی کے قمقمے روشن ہیں۔ دوکانوں پر ہفت رنگ کے نیون سائن NEON SIGNS لٹکتے ہیں اور ایک ایسی رنگینی اور روشنی چاروں طرف نظر آتی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عوام کی زندگی پہلے سے بہتر، آسودہ اور خوشحال ہو گئی ہے۔

اب تو لوگوں نے بہتر کپڑے پہننے شروع کر دیے ہیں جب امریکہ اور برطانیہ کی مدد سے نئے ٹیکسٹائل لگا دیے جائیں گے۔ اور وہ تیار کردہ کپڑا جب مارکیٹ میں آئے گا تو کپڑے کی کمی کا احساس بھی جاتا رہے گا پھر کپڑوں کی قیمتیں اور بھی گر جائیں گی۔

خروش چیف صرف کپڑے کی پیدوار میں اضافہ ہی نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ یہ بھی چاہتے

ہیں کہ لوگوں کو کپڑے پہننے کا سلیقہ بھی آئے۔ اس لیے انھوں نے مختلف ملکوں میں اپنے روسی درزیوں اور کٹرز 'CUTTERS' کو بھیجا ہے تا کہ وہ مطلوبہ ٹریننگ حاصل کر سکیں اور نئے فیشنوں کو سیکھ کر سوویت دیس میں بھی ان کو رائج کریں۔

پیرس کے فیشن گھروں سے عورتوں اور مردوں کو روس بلایا جا رہا ہے تا کہ یہ لوگ نئے فیشنوں کی نمائش کر سکیں۔

ایک زمانہ تھا۔ جب بے سلیقہ کپڑے پہننا پرولتاری کلچر کا ایک اظہار سمجھا جاتا تھا اور لوگ چست اور نفیس کپڑے پہننے کو بورژوا انحطاط کی نشانی سمجھتے تھے لیکن خروش چیف کا یہ مقولہ ہے کہ اسپوتنک اور مونک بنانے والے صرف موٹے تازے ہی نہ ہوں بلکہ کپڑے پہننے کے سلسلہ میں بھی وہ باقی دنیا کے لوگوں سے کسی طرح کم حسین نظر نہ آئیں اور جب کبھی سوشلزم اور کمیونزم کا مقابلہ ہو تو سوشلسٹ ملکوں کا کلچرل معیار باقی ملکوں سے کسی طرح کم نہ ہو یعنی ان کا ذوق جمال سرمایہ داروں سے بہتر ہو۔

اس بار جب میں اس بڑے انٹرویو کے بارے میں ملا تو میں نے دیکھا کہ ان کے اپنے کپڑے بھی بہتر ڈھنگ سے سِلے ہوئے تھے۔ سِلک کی قمیض استری کی ہوئی تھی اور تقریباً ہر لحاظ سے خروش چیف کا لباس 1955 کے مقابلہ میں بہت بہتر اور نفیس تھا۔ ماسکو ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں جہاں گاہکوں کے لیے 'شکایتی کتاب' رکھی ہوئی ہے وہاں اکثر اس قسم کے جملے لکھے جاتے تھے۔

"اب تک نفیس سوٹ نہیں ملتے۔ یہ دیکھ کر سخت دکھ ہوتا ہے اور نفرت سے جی بھر جاتا ہے۔"

"نہایت ہی غیر متمدن کپڑے اور بیہودہ، بے سلیقہ، نمونہ، کاری گری بچکانہ — کیا بہتر کپڑے بنائے نہیں جا سکتے؟"

لیکن اب؟— لیجیے ایک کہانی سنیے۔ جو روس کے اس نئے ماحول کی وضاحت کرتی ہے۔ ماسکو کے چار نوجوان جو نفیس کپڑوں میں ملبوس ایک دوسرے کی تعریف میں منہمک تھے اور یہ بتا رہے تھے کہ انھیں یہ سوٹ کہاں سے ملے؟"

"یہ سوٹ میرے ڈیڈی نیویارک سے لائے جب کہ وہ ایک ڈیلی گیشن کے ہمراہ امریکہ گئے تھے۔

''اور میں اس سوٹ کو پراگ سے لایا جب میں وہاں سیر کرنے گیا تھا۔''

''اور یہ سوٹ ہنگری کا سلا ہوا ہے لیکن میں نے اسے سنٹرل اسٹور سے خریدا جب کہ بوڈاپسٹ سے نیا مال آیا تھا۔'' تیسرے نے کہا۔

پھر سب کی نگاہیں چوتھے پر گئیں۔ جس کا سوٹ سب سے نفیس تھا۔

''آپ ہی بتائیے کہ یہ سوٹ میں کہاں سے لایا۔'' چوتھا بولا۔

لندن۔۔۔ایک بولا۔

نہیں۔۔۔

پیرس۔۔۔

نہیں۔۔۔

پولینڈ۔۔۔

چین سے آیا ہوگا کبھی کبھار وہاں بھی نفیس کپڑے تیار کرتے ہیں۔

''ارے نہیں۔۔۔ تم سب غلط کہتے ہو جناب یہ ماسکو سے خریدا ہے اور ہمارے ہی ملک کے درزی نے اسے سیا ہے۔''

لینن گراڈ سے ایک عورت نے خروش چیف کو بڑا ہی دلچسپ اور سادگی سے لبریز خط لکھا۔

پیارے نکیتا خروش چیف!

کسی نے مجھے خط لکھنے پر نہیں اکسایا میں اپنی مرضی سے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ لینن گراڈ کے رہنے والوں کی طرح مجھے جنگ کی تباہ کاریوں کا احساس ہے اور میرے جسم پر ابھی تک اس جنگ کے نشان باقی ہیں۔ اس لیے میں اور میرے لینن گراڈ کے باسی اس بات کے متمنی ہیں کہ اس دھرتی پر امن رہے۔

میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ان چند سالوں میں کس طرح لوگوں کے رہن سہن میں ترقی ہوئی ہے حالات بدلے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں آپ لینن گراڈ کی سڑکوں پر گھوم کر دیکھیے۔ اگر جنگ سے پہلے کسی خاص تقریب پر کریپ کا فراک پہننا ایک نعمت سمجھا جاتا تھا تو آج کل عورتیں ہر روز اس قسم کے فراک پہن کر باہر نکلتی ہیں بلکہ اب تو کریپ اور جارجٹ سے

ہمارا دل بھر گیا ہے۔ سوتی کپڑوں کا فیشن پھر چل پڑا ہے۔

نکیتا خروشچیف آپ تو کوئلے کی کان میں کام کر چکے ہیں۔ آپ مزدوروں کی تمناؤں اور خواہشوں سے بخوبی واقف ہیں—اس لیے میں"—"؟

اور اس طرح خروشچیف کو ہر روز ملک کے ہر کونے سے خط آتے ہیں۔ ان کی ذاتی ڈاک کسی ہالی ووڈ کے ایکٹر سے زیادہ ہی ہوگی کم نہیں۔ اس طرح خروشچیف کو اپنے عوام کی ضروریات اور ان کی خواہشات کا پتہ چلتا رہتا ہے اور اکثر وہ ملک کا دورہ کرتے ہیں۔ عام انسانوں سے ملتے ہیں بات چیت کرتے ہیں اور ان کی ضروریاتِ زندگی کے متعلق پوچھ گچھ کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ عام انسانوں کی جائز خواہشوں کا احترام کرسکیں۔

لیجیے ایک اور کہانی پڑھیے جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ روزمرہ کی چیزوں کی مساوی تقسیم کس طرح ہوسکتی ہے۔ یہ واقعہ خروشچیف اور ایک بوڑھی عورت کے درمیان ہوا۔

خروشچیف جب امریکہ سے واپس لوٹے تو صرف چند گھنٹے کے لیے ماسکو ٹھہرے پھر پیکنگ کی طرف روانہ ہوگئے کیونکہ چینی انقلاب کی دسویں سالگرہ منائی جارہی تھی۔ پیکنگ سے واپس آکر وہ ولاڈی واسٹک اترے اور پھر سائبیریا کے اندرونی علاقہ میں گئے۔ راستہ میں بہت سے گاؤں دیکھے، سڑکیں دیکھیں جو پکی تھیں، دکانیں دیکھیں جو سامان سے بھری ہوئی تھیں اور لوگوں کے چہروں پر شادمانی برستی دیکھی، راستہ میں انھوں نے ایک بوڑھی عورت کو دیکھ کر اپنی کار کھڑی کرلی اور بوڑھی عورت کو قریب بلا کر پوچھا۔

"بڑی بی—مزاج کیسے ہیں؟ دن کیسے گذرتے ہیں—؟"

"اب بہت اچھے ہیں نکیتا خروشچیف—میں تمھاری شکرگزار ہوں۔" اس نے لفظ 'اب' پر زور دے کر کہا تھا۔

'مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی ماں—کچھ اور چاہیے۔'

'میں صرف یہی چاہتی ہوں کہ تم ادھر ایک بار نہیں بلکہ کئی بار آؤ پھر ہمیں سب کچھ ملے گا—'

اس جملے میں چھپی ہوئی اندرونی کیفیت جاننے کے لیے خروش چیف بے قرار ہو گئے اور کہا میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔ ذرا کھل کر بات کرو ماں اور اس بوڑھی عورت نے بتایا کہ آپ کے آنے سے پہلے سڑکوں کی حالت نہایت ابتر تھی۔ آپ کے آنے کی وجہ سے ان کی مرمت ہوئی۔ دوکانیں جو آپ کے آنے سے قبل خالی تھیں۔ اس وقت سامان سے بھر دی گئی ہیں تاکہ آپ ایک اچھا اثر لے کر جائیں اور آپ اسی طرح اکثر ادھر آتے رہے تو ہم لوگ جوتے اور دیگر چیزیں خرید سکیں گے۔

اسی شام ایک عام جلسے میں خروش چیف نے مقامی افسروں کو خوب جھاڑا اور اس ضلع کے کیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کو بھی صلوٰاتیں سنائیں اور پرزور الفاظ میں انھوں نے تنبیہ کی کہ عوام کی ضرورت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ......اگر افسروں نے ریاکاری اور بے اعتنائی سے کام لیا تو حکومت انھیں کبھی معاف نہ کر سکے گی۔

اس قسم کے کئی واقعات اور ضرور ہوئے ہوں گے۔ اس لیے سنٹرل کمیٹی کے اجلاس میں جو دسمبر میں ہوا وہاں خروش چیف نے کہا:

'ہم میں بہت سی خامیاں ہیں، کچھ خطوں اور شہروں میں اشیاء خوردنی اور کپڑے وقت پر نہیں پہنچتے۔'

اور پھر خروش چیف نے کہا: ''ہمارے ملک میں ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ اپنے دل کی بات دوسروں کے آگے صاف صاف کہے۔ وہ ہر شخص سے بات کر سکتا ہے جس سے وہ کہنا پسند کرتا ہے اور جن لوگوں سے وہ مخاطب ہوتا ہے انھیں ان سوالوں کا جواب دینا چاہیے۔''

اور یہ الفاظ جب لاکھوں انسانوں نے سنے تو اس وقت اس بوڑھی عورت کا دل خوشی سے ناچ اٹھا ہوگا۔ جس نے بڑی سادگی سے خروش چیف سے اپنے دل کی بات کہی تھی کہ صرف جوتوں کا پہننا ہی کافی نہیں بلکہ ان کی تقسیم ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ خاص کر ان دور دراز شہروں کے لیے جو راجدھانی سے بہت دور پڑتے ہیں۔

○

ایک چور کو دعوت

''دس بدمعاشوں کو معاف کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے ایک بے گناہ کو پھانسی دی جائے۔''

''روسی ملکہ کیتھرین''

یہ کہانی دورِ جدید کی الف لیلیٰ کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ ایک چور اور ایک خلیفہ — جسے وزراء کی کونسل کا چیئرمین کہا جاتا ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ خروش چیف ایک سمندر کے کنارے سوچی میں آرام کر رہے تھے کہ انھیں اپنی ڈاک ملی۔ ان کئی خطوں میں ایک خط ایک ایسے آدمی کا تھا جو چوری کے سلسلہ میں سزا پا چکا تھا۔

''سوویت یونین کی کونسل آف منسٹرز کے چیئرمین''

''کامریڈ خروش چیف''

میں بارہ برس کا تھا کہ میں نے چوری کرنا شروع کیا اور ابھی تک چار بار سزا بھگت چکا ہوں۔ 1954 میں مجھے چھ سال کی قید ملی۔ میں اپنی سزا بھگتنے کے بعد اپنے گھر لوٹا اور بڑھئی کا کام شروع کر دیا۔ میں 500 سے لے کر 600 روبل ماہوار کما لیتا تھا لیکن میں اپنے خاندان کے اخراجات برداشت نہ کر سکا۔ میرے گھر کا کرایہ 200 روبل تھا۔ میں نے آفس سے 600 روبل قرض لیے اور دو مہینے کا کرایہ ادا نہ کر سکا۔ میں نے 25 مارچ کو اپنا گھر چھوڑا' میری ایک لڑکی ہے

جس کی عمر چار سال کی ہے، ایک بوڑھی ماں اور ایک بیوی جو میکے میں ہے اور جس کے حال ہی میں ایک بچہ ہوا ہے۔ میں پہلے کی طرح ایک خوش باش زندگی گذارنے کے لیے گھر سے نکل پڑا، لیکن گھر چھوڑنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں ایک چور کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ مگر اب میں واپس گھر نہیں جا سکتا۔ کیونکہ مجھے لوگوں کو قرضہ ادا کرنا ہے اور اپنی بوڑھی ماں اور بیوی کو کچھ دے کر نہ آیا تھا۔ مجھے گھر سے آئے ہوئے پانچ دن ہو گئے ہیں اور میں نے ابھی تک کوئی جرم نہیں کیا۔ میں ہر قسم کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ بتایئے کہ میں کیا کروں؟

میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔ میں آپ سے ملنا بھی چاہتا ہوں اگر آپ مجھے گرفتار کرانا چاہتے ہیں تو میں تیار ہوں۔

آپ کا: دستخط

خروش چیف نے خط پڑھ کر اس چور کو دعوت دی کہ وہ سیدھا سوچی آ کر ان سے ملے اور ساتھ ہی سوچی آنے کا کرایہ بھی بھجوا دیا۔

یہ چور خروش چیف سے ملا۔ وزیر اعظم نے اس سے مصافحہ کیا اور اس کی خوب آؤ بھگت کی اور خروش چیف نے اسے بتایا کہ تمھارا نام ایک مشہور و معروف جرنیل سے ملتا جلتا ہے۔ چور کی عمر تیس سال کے قریب ہو گی اور خروش چیف کے کہنے کے مطابق یہ چور ایک ذہین اور خوش مذاق آدمی تھا۔

اس چور نے اپنی داستان الم سنائی۔ اپنی زندگی کے اوراق پلٹے اور اپنے والد کی موت کا ذکر کیا اور ساتھ ہی ان حالات اور ماحول کا تذکرہ کیا جس کی وجہ سے اس کے کردار پر ایک برا اثر پڑا۔

چور نے کہا۔ آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کیجیے، میں کام کرنا چاہتا ہوں میں کافی کچھ کر سکتا ہوں مگر مجھے اچھا کام دیا نہیں جاتا کیونکہ مجھے چور سمجھا جاتا ہے۔ میں اچھی تنخواہ کما سکتا ہوں اگر لوگ مجھ پر بھروسہ کریں! ابھی تک میں ایک گروہ میں کام کر رہا تھا۔ میرے گروہ کے فرد مجھ سے زیادہ تنخواہ لیتے ہیں اور چونکہ مجھے چور سمجھا جاتا ہے اس لیے مجھے دوسروں کے مقابلہ میں کم تنخواہ ملتی ہے۔ اب کیا کروں؟ میں اپنے خاندان کو کیسے سنبھالوں۔ میرا اپنا گھر نہیں ہے۔ ایک کمرہ کرایہ پر لیا ہوا ہے، اگر مجھے حکومت کی طرف سے کوئی فلیٹ مل جائے تو مجھے کرایہ کم دینا پڑے گا، آپ میری مدد کیجیے۔

میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں دیانت داری سے باقی ماندہ زندگی گذاروں گا۔ میں یہ ثابت کر کے دکھادوں گا اور۔اور۔

''اس انسان کی روئیداد سننے کے بعد مجھے اس پر بھروسہ ہو گیا۔ مجھے یہ آدمی اچھا لگا۔ ہوسکتا ہے میں نے ضرورت سے زیادہ فراخ دلی سے کام لیا ہو لیکن یہ ملاقات کافی دلچسپ رہی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مجھے دھوکہ نہ دے گا۔

''آخر تم کیا چاہتے ہو میں تمہاری کس طرح مدد کر سکتا ہوں؟ میں نے اس سے پوچھا۔

''میری آپ اس طریقہ سے مدد کیجیے کہ میں اپنے پریوار کو پال سکوں۔ میں اپنے بیوی بچے اور ماں کے ساتھ ایک باعزت زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔ میں مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا'' میں شہر کے پارٹی کمیٹی کے سیکریٹری کو فون کرتا ہوں اور اسے کہتا ہوں کہ تمہیں کام دلائے اور ساتھ ہی تم کوئی کام سیکھ لو تا کہ تم زیادہ روپے کما سکو لیکن دیانت سے کام کرنا اور اس کے بعد میں تمہیں حکومت کی طرف سے قرضہ دلاؤں گا۔

''غور کیجیے ایک چور کو قرضہ دیا جارہا ہے۔ یہ صرف ہماری حکومت کے تحت ہی ممکن ہوسکتا ہے۔''

''تمہیں ایک چھوٹا سا گھر بنانے کے لیے قرضہ ملے گا یا میں تمہیں ایک فلیٹ دلا دوں گا تاکہ تمہیں کم کرایہ دینا پڑے۔''

''اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے دیش میں مکانوں کا کرایہ دنیا کے مقابلہ میں سب سے کم ہے۔ بس رسمی طور پر کچھ دینا پڑتا ہے۔''

یہ سن کر چور نے کہا۔''اگر آپ نے یہ کام کر دیا تو واقعی ایک معجزہ ہو جائے گا میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

جب اس چور نے یہ دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک انسان کی طرح سلوک کیا جارہا ہے تو اس نے کہا۔

''کامریڈ خروش چیف ۔۔۔ میں آپ کے ساتھ فوٹو کھنچوانا چاہتا ہوں تا کہ یہ واقعہ میرے لیے ایک یادگار بن کے رہ جائے۔''

''ضرور ضرور میں نے جواب دیا۔ تم میرے قریب بیٹھو تا کہ فوٹو گرافر کو تصویر کھینچنے میں آسانی ہو۔''

''ہم دونوں اکٹھے بیٹھ گئے اور فوٹو کھنچوالیا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ ایک کاپی ضرور تمہیں بھیجوں گا اور میں نے اسے ایک کاپی بھجوائی۔''

اس گفتگو کے بعد مجھے اس بات کا پتہ چلا کہ اس کی جیب میں ایک دھیلا بھی نہیں ہے— میں نے اس سے کہا، گھبراؤ نہیں گھر پہنچنے کے لیے مناسب کرایہ ملے گا اور اس کے ساتھ کچھ زائد اور بھی دیئے جائیں گے جس سے تم اپنے بیوی بچوں کے لیے تحفے لے جاسکو۔

وہ گھر چلا گیا اور اسے کام بھی ملا۔ میں نے اس کے بعد اس کے کام کے متعلق پوچھ گچھ کی۔ وہ کس طرح کام کر رہا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ بطور ایک اسٹینڈور STENDORS کے کام کر رہا ہے اور اسے اچھی تنخواہ ملتی ہے اور ساتھ ہی اس نے یہ بات مجھ تک پہنچائی کہ وہ میرا شکر گزار ہے کہ میری نصیحت اور مدد کی وجہ سے وہ ایک خوشگوار اور بامقصد زندگی گزار رہا ہے۔''

خروش چیف نے یہ کہانی ادیبوں کی ایک کانفرنس میں سنائی۔

یہ واقعہ صرف خروش چیف کی شخصیت ہی کو اجاگر نہیں کرتا بلکہ کیونزم کے انسان دوستی کے جذبے کو نمایاں کرتا ہے۔ جو کئی سالوں سے مختلف وجوہ کی بنا پر خیالی تصورات، کھوکھلی خارجیت اور سازشی ماحول کے نیچے دبا ہوا تھا۔ جب کہ ایک ایسی فضا چاروں طرف بکھری ہوئی تھی، جہاں ہر شخص اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا تھا۔ جب تک وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہ کردے۔ یہ اس قسم کا ماحول تھا جہاں انسانی زندگی اور اس کی آزادی کی کوئی خاص قدر و قیمت نہ تھی۔ حال میں جب خروش چیف ہندوستان تشریف لائے تو میں نے ان سے اس چور والے واقعہ کا ذکر کیا اور کہا کہ میں ان کی اس انسان دوستی سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔

اور اس کے جواب میں انھوں نے کہا۔ ''چور بھی ایک انسان ہوتا ہے۔ ہمیں اس پر یقین کرنا چاہیے۔ اگر ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور اسے ایک بہتر انسان دیکھنا چاہتے ہیں''۔ اسی سلسلے میں میں نے خروش چیف کو بتایا کہ اتر پردیش کے علاقہ میں اسی طرح کا ایک تجربہ کیا جارہا ہے۔ تقریباً ایک ہزار قیدیوں کو ایک کھلی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ ان مجرموں میں چور، ڈاکو، قاتل

سب شامل ہیں۔ اس جگہ کے ارد گرد کوئی لوہے کی سلاخیں نہیں ہیں۔ کوئی دیواریں نہیں ہیں۔ مسلح پہرے دار بھی نہیں — جو ان کی حفاظت کر سکے۔ انھیں باقاعدہ کام اور تنخواہ دی جارہی ہے۔ ایک سال کام کرنے کے بعد صرف دو مجرموں نے بھاگنے کی کوشش کی اور ان میں سے ایک تو خود ہی واپس آ گیا۔

خروش چیف یہ سن کر بے حد متاثر ہوئے اور انھوں نے اس اسکیم میں دلچسپی کا اظہار کیا اور سوچ کر کہا۔

'ہاں انسان پر بھروسہ کرنا ہی چاہیے۔'

ادیبوں کی کانفرنس میں جو تقریر خروش چیف نے کی۔ وہاں انھوں نے کافی اہم باتیں کہیں، جو صرف ادیبوں کے لیے ہی اہم نہ تھیں بلکہ روس کے موجودہ سوشل اور قانونی نظام کے بارے میں نئی روشنی ڈالتی ہیں۔ ادیبوں کو اپنی تخلیقات میں انسان دوستی کو ابھارنا چاہیے۔ مجرموں اور دیگر لوگوں کے بارے میں جو اس نظام سے اتفاق نہیں رکھتے، ان کے سلسلے میں بھی ایک ایسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے جس سے انسان دوستی کے جذبہ میں گہرا تعلق ہو۔ جب سے خروش چیف برسرِ اقتدار آئے ہیں انھوں نے اس کلیہ کو ہمیشہ برتنے کی کوشش کی ہے۔ اس چور کے واقعہ کے متعلق خروش چیف نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ اس خط کے مصنف کے متعلق مختلف طرزِ عمل بھی برتا جا سکتا تھا کیونکہ یہ خط اس شخص نے لکھا تھا جو چار بار جیل کاٹ چکا تھا اسے نوکری ملی لیکن اس نے نوکری چھوڑ دی اور چوری کرنے کا خیال آیا۔ اس وقت یہ شخص مجھے ملا۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ میں اسے دوبارہ جیل میں بند کرا دیتا لیکن اس طریقہ سے اس آدمی کو کیا ملتا۔ جیل میں پہنچ کر اس کی حالت ٹھیک نہ ہوتی بلکہ بدتر ہو جاتی لیکن ہمیں ایسے آدمی چاہئیں جو ہمارے آدرش کو آگے لے جائیں۔ اس آدمی کو سیدھے راستہ پر لانے کے لیے ہمیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس پر بھروسہ کریں۔ ہم اس کے بہترین وصف کو اجاگر کریں، بھروسہ اور یقین کی تہوں کو ابھاریں— ''ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص کی اصلاح ہو سکتی ہے۔''

اس قسم کا طرزِ فکر اسٹالن کے دور سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہ دور جب کہ غیر قانونی

گرفتاری، خفیہ عدالتی تحقیقات اور سزائے موت روز مرہ کی بات تھی۔ یہ ظالمانہ غیر قانونی طرز عمل اسٹالن کے عہد کی ایک خوفناک دین تھی۔ 1958 میں جب خروش چیف نے ادیبوں کی کانفرنس میں تقریر کی۔ اس وقت 'شخصیت پرستی' کا 'CULT' ان کے ذہن میں تھا کیونکہ اس وقت انھوں نے اپنی تقریر میں ان باتوں کی اہمیت پر زور دیا جو انھوں نے کیمونسٹ پارٹی کی بیسویں کانفرنس میں کہیں تھیں۔

ان تمام ادیبوں کو مخاطب کرتے ہوئے جو معاشرے کی خرابیوں کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں جو خروش چیف نے کہا 'یہ کام پارٹی اور سینٹرل کمیٹی کا ہے کہ معاشرے کی خامیاں اور غلطیاں بے نقاب کرے اور بڑی سختی اور صاف بیانی کے ساتھ لوگوں کے سامنے لائے۔ کیا کسی نے ہمیں مجبور کیا تھا کہ ہم شخصیت پرستی کا پردہ چاک کریں اس کی خامیوں کو بے نقاب کریں۔ کیا کسی نے ہمیں مجبور کیا تھا کہ ہم سینٹرل کمیٹی کے اجلاس کریں اور ان تمام غلطیوں اور خامیوں کو بے نقاب کریں اور سختی سے اس کی ملامت کی اور اس قسم کی تجویزیں پیش کیں جس سے ان غلطیوں اور خامیوں کی خاطر خواہ ازالہ ہو سکے۔'' ہم سے کسی نے نہیں کہا۔ اگر ہم لینن کے سچے سپوت نہ ہوتے۔ اگر ہم دیانتدار بالشویک نہ ہوتے تو ہم بڑی آسانی سے ان تمام خامیوں پر پردہ ڈالتے اور خوشی سے آگے بڑھ جاتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ماضی میں جو غلطیاں ہم نے کیں اس کا علاج یہی تھا کہ ہم ان خامیوں اور غلطیوں کو بے رحمی سے بے نقاب کرتے تا کہ لوگوں کو ان سے نفرت ہو جائے اور ہم دوبارہ ان غلطیوں کے مرتکب نہ ہوں۔ پارٹی اور عوام نے اس غیر منصفانہ رویہ کی پرزور ملامت کی ہے تا کہ ماضی کی تمام برائیاں یکسر ختم کر دی جائیں اور لوگ دوبارہ ان منحوس صورتوں اور کارناموں کو دیکھ نہ سکیں اور نہ ہی اب اس قسم کے واقعات دوبارہ ہمارے عہد میں دہرائے جائیں!''

خروش چیف کی اس نئی پالیسی سے ان کو تو کوئی فائدہ نہ ہوگا جو اسٹالین کے عہد میں مارے گئے، لیکن جو لوگ زندہ ہیں ان کے لیے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس وقت ضروری ہے کہ انسانیت اور قانون کے اصولوں کو پھر پروان چڑھایا جائے۔ خروش چیف نے اسٹالین کے عہد کے ایسے تمام قوانین کو منسوخ کیا، جن کی رو سے مشتبہ، دہشت پسند افراد، توڑ پھوڑ کرنے والوں

کو بغیر مقدمہ چلائے جیل میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اسی طرح بہت سے قیدیوں کو رہا کیا گیا۔ باوقار کیونسٹوں اور ٹریڈ یونینسٹ کے کئی کمیشن بنائے گئے جنھوں نے تمام سیاسی قیدیوں کی فائل دیکھی اور اگر انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ ان لوگوں کو غلط طریقے سے سزا دی گئی ہے تو فوراً رہا کیا گیا۔ دوبارہ بسایا گیا۔ ہر قیدی کو یہ حق دیا گیا کہ دوبارہ اپنا مقدمہ لڑے اور اسی طرح کئی ہزار قیدیوں کو رہا کیا گیا بے انصافی، ظلم واستبداد کی بے شمار کہانیاں سننے میں آئیں لیکن ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے دلوں میں کیمونزم کی جوالا بھڑک رہی تھی۔ ان کے سینوں میں کیمونزم کے لیے اٹل یقین اور بھروسہ تھا اور اسی یقین کے سہارے انھوں نے دکھ اور درد کے دن کاٹے تھے۔ ایک بار بھی ان کا یقین نہیں ڈگمگایا اور جب وہ واپس آئے تو ذہنی اور روحانی طور پر صحیح وسالم تھے۔ میرے ایک عزیز دوست جو ایک دانش ور بھی ہیں انھوں نے بتایا کہ خروش چیف کی سب سے بڑی خوبی بلکہ تحفہ یہ ہے کہ اس نے روس میں انگریزی قانون کی برتری کو لاگو کیا۔

اس نے خفیہ پولیس کی دہشت پسندی اور مطلق العنان پالیسی کا خاتمہ کیا۔ آج کسی شخص کو جیل میں نہیں ڈالا جاسکتا جب تک اس پر مقدمہ نہ چلایا جائے۔ اب لوگوں میں خوف وہراس نہیں رہا اسٹالن کے عہد میں جب بھی رات کے تین بجے دروازے کو کھٹکھٹایا جاتا تھا تو لوگوں کے چہرے فق ہو جاتے تھے۔ اب وہ دور ختم ہو چکا ہے۔

پارٹی کانفرنس میں خروش چیف نے کہا۔ آج سیاسی اختلاف کی بنا پر کسی کو دبایا نہیں جاسکتا اور نہ سیاسی اختلافات کی وجہ سے کسی کو جیل میں رکھا جاسکتا ہے۔ ماسکو کے مشہور جیل خانے میں "ZIUBIANKA" جہاں اسٹالن سیاسی قیدیوں کو رکھتا تھا۔ اسے بیریا کی پھانسی کے بعد بند کر دیا گیا ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ بے انصافیاں کی گئی تھیں وہ خروش چیف کے بارے میں کیا سوچتے ہیں، اپنے متعلق کیا سوچتے ہیں، اس کا ذکر اس خط میں ملے گا جو لیونا ووٹل سکایا LYONA VOTOLOVSKAY نے خروش چیف کو لکھا ہے۔ یہ عورت نوووسبرسک NOVOSIBIRSK کے اسکول میں استانی ہے اور اس نے سات سال ایک CONCENTRATION CAMP میں کاٹے اور پھر اسے رہا کیا گیا۔

'نکیتا سرگے وچ......

آپ نے جو بیانات امریکہ میں دیئے ہیں۔ ان کی میرے دل میں کتنی قدر ہے اس سے

شاید آپ کو کوئی دلچسپی نہ ہو لیکن میں آپ کی کتنی شکر گذار ہوں اس کا احساس مجھے ہی ہے۔

قسمت نے مجھے کچھ ایسے آڑے ہاتھوں لیا کہ میری مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا۔ میرے خاوند کی گرفتاری کے بعد میرا موڈ بگڑتا گیا اور جب مجھے گرفتار کر کے مجھے اپنے بچوں سے الگ کیا گیا اور جیل میں ڈال دیا گیا، مکمل سات سال کے لیے۔ ان دنوں میری طبیعت بہت ہی مکدر ہو گئی۔ جب میری رہائی کے بعد پارٹی نے مجھے ممبر بنانے سے انکار کر دیا تو میں نے اس درد اور غم کو بھلانے کے لیے کام اور شاعری میں پناہ لی اور انہی دو چیزوں نے مجھے بے پناہ قوت عطا کی!

جیل میں بھی اندرونی طور پر میں اپنے آپ کو کمیونسٹ سمجھتی تھی۔ اپنے آپ کو ایک دیانت دار انسان سمجھتی تھی۔ اس دوران میں مجھے ایک ایسے انسان سے جدا ہونا پڑا جو میری زندگی کا متاع عظیم تھا۔ اس کی جدائی میرے لیے ناقابل برداشت تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سب کچھ لٹ گیا۔

ایسا کیوں ہوا۔ میں زندگی سے اتنی مایوس کیوں تھی۔ یہ کس قسم کا جذبہ تھا۔ زندگی سے اتنی بیزاری کا احساس کیسے آ گیا۔ مجھے اپنے بچوں کا خیال بھی نہ رہا۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے کرتی تھی۔۔ راکٹ کی کامیابی پر میں نے اظہار مسرت کیا لیکن میرے ذہن کے دوسرے حصہ نے — میں لوگوں سے ملتی رہی۔ ان سے باتیں کرتی رہی، ان سے ہنستی رہی لیکن حقیقت میں میرا دل دردو الم سے بھرا رہا اور زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے آپ ہی سے نفرت ہو گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری روحانی زندگی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ میں اپنے آپ سے اجنبی ہوتی گئی اور میرے ذہن میں اپنے خلاف ایک زہر بھر گیا۔ اس موقع پر مجھے آپ کی تقریریں پڑھنے کے لیے ملیں۔ کس صاف بیانی سے آپ امریکنوں سے بات چیت کرتے ہیں۔ ہم نے اپنے دلوں میں اپنے آپ کو پہلی بار قابل فخر سمجھا اور ہمارے دلوں سے نفرت اور یاسیت جاتی رہی اور اس کی جگہ مسرت اور رجائیت نے لے لی اور دل سے یہ آواز نکل رہی تھی، ہمارے عوام کی طرف دیکھو۔ میں داخلی طور پر ان سب چیزوں کو سمجھتی ہوں اور صرف انکساری سے یہ بات میں نہیں کر رہی ہوں بلکہ بڑی صاف بیانی مجھ سے یہ الفاظ لکھوا رہی ہے۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب میں 'CONCENTRATION CAMP' میں دو سو آدمیوں کے ساتھ بیٹھ کر چلا رہی تھی۔ میں چلا رہی تھی اور ثابت کر رہی تھی کہ ہم کمیونزم کی تعمیر کریں گے کہ جلد ہی

سینٹرل کمیٹی فیصلہ کرے گی، جس کی رو سے ملک میں جو بے انصافیاں ہو رہی ہیں وہ ختم ہو جائیں گی اور اس کے جواب میں لوگوں نے کہا اگر تم ابھی تک انصاف میں یقین رکھتی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کسی اور دنیا میں رہتی ہو اور دس سالہ عرصہ بھی تمھیں اعتدال پسندی نہ سکھا سکا اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو جانتے ہیں کہ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ مگر تم اور تمھارے ایسے نوجوانوں کیمونسٹوں کو ٹھیک سزا ملی ہے۔ جس چیز کے لیے تم لڑتے تھے اسی چیز نے تمہیں کہیں کا نہ رکھا۔

اس کیمپ میں مختلف لوگ تھے اور ان سب کے اپنے اپنے نظریے تھے۔ جتنے لوگ یہاں لائے گئے تھے ان میں اکثر بے گناہ تھے۔ مگر طبقاتی جنگ یہاں بھی جاری تھی۔ اس لڑائی میں ان تمام لوگوں کو جیتنے کی کوشش کی جا رہی تھی جو اپنے نظریات میں ڈانواں ڈول ہو رہے تھے۔ ان میں یوکرین کی بہت سی جوان لڑکیاں تھیں جن کی عمریں '18' برس ہوں گی اور بے چاری کبھی ہم سے اتفاق کرتیں، کبھی دشمنوں سے — اور جب کبھی کوئی نئی گرفتاری وجود میں آتی تو وہ ہم سے بھاگ کر بورڑوا کیمپ میں چلی جاتیں۔ سینٹرل کمیٹی کے اختلاف اور بیریا کی ناپاک حرکتوں کا پردہ فاش ہونے کے بعد ہمیں فتح نصیب ہوئی۔ یعنی ان لوگوں کو جنھیں سچائی میں یقین تھا اور جنھیں کسی قسم کا تشدد کچل نہ سکا۔ وہی لوگ جو مجھے ہراس کیا کرتے تھے انہی لوگوں نے مجھے ان سب قیدیوں کا نمائندہ چنا لیکن کچھ لوگ ضرور ایسے رہے جنھیں کسی پر یقین نہ تھا۔ اس قسم کے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔

اس وقت ہر چیز یاد آ رہی ہے۔ عوام کی بہتری اور ہماری مسرت کے لیے آپ کی جدوجہد ساری دنیا کے سامنے ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میرا خط خوشگوار اثر نہ ڈالے۔ آپ کی رضا کارانہ لڑائی، آپ کی رجائیت، آپ کا اپنے آدرش پر اٹل رہنا، آپ کا خوشگوار مزاج ہمیں ایک نئی طاقت بخشتا ہے۔ اور ہمارے اندر خوشی کا احساس بڑھتا ہے اور اسی وجہ سے آپ کی بے حد شکرگزار ہوں اور اسی لیے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں اپنی تازہ ترین نظم بھیج رہی ہوں جو میں نے کچھ دن پہلے لکھی تھی۔ اب میں اسے رسالہ 'NOVOMIR' میں چھپنے کے لیے بھیج چکی ہوں۔ مجھے کچھ علم نہیں، آپ اس نظم سے کیا اثر لیں گے۔ میں شاعرہ نہیں بلکہ ایک استانی ہوں۔ میں چاہتی ہوں

کہ آپ اس نظم کو پڑھیں۔ شاید آپ اتنا وقت نہ دے سکیں۔ مجھے معلوم ہے آپ اس نظم کو پڑھنے کے لیے ضرور وقت نکالیں گے۔ معاف کیجیے گا۔ نظم بھیج رہی ہوں۔''

خروش چیف نے اس عورت کی بھیجی ہوئی نظم کا ایک پیراگراف ضرور پڑھا۔ یہ نظم اس عورت نے لکھی تھی جس کی روح صحیح وسالم تھی۔ باوجود اتنی ظلم اور بے انصافی کے۔

''اور کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ دنیا چھوٹی ہو جاتی ہے۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی سمٹ کر ایک نقطہ میں آجاتی ہے۔ اس وقت ایک دوست کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جو ہمیں اس گہرے اندھیرے سے نکالے۔

اور اس کے بعد یہی عورت لکھتی ہے۔

اور تم ہی میرے وہ دوست ہو جس نے مجھے اس یاسیت کے سمندر سے باہر نکالا۔

انسانیت اور قانون کی بحالی کی کوشش اس سے پہلے بھی سوویت یونین میں کئی بار ہو چکی ہے۔

نئے صورت حالات سے متاثر ہو کر قانون سازی میں ایک بہت بڑی تبدیلی کی گئی ہے۔

جب تک کسی شخص پر کھلی کچہری میں مقدمہ نہ چلایا جائے اسے سزا نہیں دی جاسکتی۔

بیریا دالی اندرونی امور کی وزارت MINISTRY OF INTERIORN کے خاتمہ کا اعلان قابل تحسین ہے لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ خفیہ پولیس کا بالکل خاتمہ کر دیا گیا ہے بلکہ اس کی بہت سی طاقتوں کو کم کر دیا گیا ہے جو دہشت خفیہ پولیس نے پھیلائی تھی وہ اب عہد ماضی کا ایک حصہ بن چکی ہے۔

اسٹالن کے عہد میں شخصیت پرستی اور عام لوگوں پر جبر وتشدد کی لہر، سوویت ریاست کے ڈھانچہ کا خاص حصہ تھی لیکن اب خروش چیف نے چند اقدام ایسے اٹھائے ہیں جس سے ریاست کی مرکزی حیثیت کو کم کیا گیا ہے۔ بڑی بڑی صنعتیں جو ماسکو کی وزارتیں چلاتی تھیں آج ان کا کام علاقائی بنیادوں پر ہو رہا ہے۔

بڑی بڑی مشینیں اور ٹریکٹر جو جماعتی فارمیں حکومت سے کرائے پر لیتی تھیں آج اس سسٹم کو ختم کر دیا گیا ہے اور آج ہر فارم کی اپنی مشینری ہے اور اس کی وجہ سے ان کی خود مختارانہ حیثیت میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ بد دیانتی اور ریاستی ایڈمنسٹریشن پر کھلی تنقید کر سکے۔

ینگ کمیونسٹ لیگ کا روزانہ اخبار کومسومولسکا یا پراودا'' نے کھلے طور پر لوگوں کو دعوت دی ہے کہ وہ لوکل منسٹروں اور دیگر اداروں کے متعلق شکایتیں بھیجیں اور اس قسم کے خطوط ان پرچوں میں بے دھڑک چھپتے ہیں اور یہی پرچے اپنے نمائندوں کو بھیج کر تحقیقات کراتے ہیں اور اس کے بعد بھی اگر یہ بددیانتی اور ناانصافی کی وارداتیں ہوتی ہیں تو یہی پرچے آزادانہ طور پر انھیں چھاپتے ہیں اور بیباکانہ تنقید کرتے ہیں اور اسی طرح مختلف موضوعات پر چاہے وہ سیاسی، کلچرل یا سوشل ہوں ان پر ٹھوس بحث کی جاتی ہے'' کمیونسٹ سماج میں کلچر کی کیا حیثیت ہوگی—؟

اس بحث کے متعلق تقریباً دس ہزار خطوط لکھے گئے اور اس سلسلے میں ان لوگوں کے خطوط چھاپے گئے جن کا نظریہ دوسرے نظریے سے مختلف تھا۔

مزاحیہ ہفت روزہ پرچہ کروکوڈایل KROKODILE مزاحیہ اور طنزیہ مضامین چھاپتا ہے، جس میں سوویت سماج کی خامیوں اور غلط نظریوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ کروکوڈایل نے اپنے نئے سال کے نمبر میں ایک کارٹون چھاپا جس کا عنوان یہ تھا۔ میں نشانہ لگا تار ہتا ہوں۔ (I KEEP FIRING) اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسٹر کروکوڈایل اپنے تیروں سے مختلف عوام دشمن افراد کی طرف نشانہ لگائے کھڑے ہیں۔ ان کا نشانہ رشوت خوروں، بلیک میلروں، چیزیں ضائع کرنے والوں، سازش کرنے والوں اور افسر شاہی کی طرف تھا۔ جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ سوویت سماج میں بھی اس قسم کے لوگ ابھی تک ہیں۔ کیونکہ پہلے تو یہی سنا جاتا تھا کہ روس کے تمام لوگ مجسم اخلاق ہوتے ہیں۔ اگر کچھ بدمعاش ہیں تو وہی لوگ جو در پردہ استعماریت کے ایجنٹ، ٹراٹسکی کے پٹھو اور ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اصولاً آنے درست ہوا۔

اب تو آپ بہت سے اخباروں میں اس قسم کے مضامین پڑھیں گے جن میں وزیروں پر اچھی خاصی تنقید ہوتی ہے۔

اووچکن OVECHKIN جو ایک ناولسٹ ہیں انھوں نے ایک ادبی پرچہ میں جو روس کے ادیبوں کا آرگن ہے۔ اس میں انھوں نے چند وزیروں پر سخت تنقید کی۔ اور اسی طرح مجھے بتایا گیا کہ پارٹی پلان اور سپریم سوویت کے جلسوں میں ان وزراء پر اس سے بھی زیادہ کڑی تنقید کی جاتی ہے اور ایک وزیر تو اس قسم کی کڑی تنقید سن کر بے ہوش ہوگیا۔

خروش چیف نے اس سے زیادہ کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو! لیکن اس نے روسی عوام کو بہت سی ذہنی قیود سے رہائی دلائی ہے ــ غیر ملکی ایجنٹوں کا ڈر، خفیہ پولیس کا ڈر، کوئی سن نہ لے اس کا ڈر، کوئی کہی ہوئی بات کی رپورٹ نہ کر دے، اس کا ڈر، اور اس بات کا ڈر کہ جو کچھ کوئی کہتا ہے کوئی اس کا غلط مطلب نہ لے۔

اب عام روسی ایک دوسرے سے بڑی آزادی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں، لیکن غیر ملکی لوگوں کے سامنے اب بھی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ تاکہ غیر ملکی یہ نہ سمجھ لیں کہ انھیں اپنے ملک کی حکومت کے خلاف کوئی شکایت ہے۔

1954 میں مجھے ایک ٹریفک کانسٹیبل نے گرفتار کر لیا۔ لوگوں نے اس سے کہا تھا کہ میں مشتبہ غیر ملکی آدمی ہوں اور میں ایک روٹی کی دوکان کے سامنے ایک لمبے Q کا فوٹو لے رہا تھا (دراصل میں اپنے ہوٹل کا فوٹو لے رہا تھا اور روٹی کی دوکان ہوٹل کے ساتھ تھی)۔ مجھے پولیس چوکی میں لے جایا گیا۔ مگر جب میں نے پولیس آفیسر کو یہ بتایا کہ میں آپ کا مہمان ہوں۔ آپ کے دیس میں بطور ایک ڈیلی گیٹ کے آیا ہوں تو اس نے اظہار افسوس کیا اور مجھے ہوٹل تک پہنچانے آیا۔

لیکن 1960 میں ہزاروں ٹورسٹ کیمرہ لیے ہوئے ماسکو کے چاروں طرف گھوم رہے تھے۔ فوٹو لے رہے تھے اور کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ اور آج روٹی کی دوکان کے سامنے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے لوگوں کا Q نہیں دکھائی دیتا۔ اب لوگ بڑی آزادی سے آپس میں بات چیت کرتے ہیں اور اب ادھر ادھر نہیں دیکھتے۔ مبادا ان کی باتیں کوئی سن نہ لے۔ وہ زمین دوز ریلوے میں، پارکوں میں، ریستوران میں، اسکیٹنگ رنگ میں تقریباً ہر جگہ ایک دوسرے سے محو گفتگو نظر آئیں گے۔

میری پوزیشن دوسروں سے بہتر تھی۔ میں روسی زبان بول نہیں سکتا شاید اسی لیے لوگ میرے سامنے بڑی آزادی سے بات چیت کرتے تھے اور انھوں نے کبھی اس بات کا شبہ نہیں کیا کہ میں ان کی گفتگو کا لب لباب سمجھ سکتا ہوں اور لوگ کہہ رہے تھے۔ ارے یہ بڑے لوگ ہماری کیا پرواہ کریں گے ان کی بڑی بڑی کاریں ہیں اور انھیں 6000 روبل ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ (خروش چیف نے اپنی تنخواہ اور دوسرے وزیروں کی تنخواہ میں کافی کٹوتی کی ہے اور بہت بڑے بڑے

افسروں کو کاروں سے محروم کر دیا ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ، وہ بس یا ریل میں سفر کریں)۔

لوگ کہہ رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔ ''راکٹ چاند تک پہنچ رہا ہے بڑی اچھی بات ہے بھائی لیکن لوگوں کو رہنے کے لیے گھر کب ملیں گے۔'' خروش چیف نے کئی ہزار اونچے اونچے رہائشی مکان تعمیر کرائے ہیں اور کئی ہزار اور تعمیر کیے جا رہے ہیں۔ مگر مکانوں کی پھر بھی کمی ہے۔

ایک کہہ رہا تھا۔ ''امریکی مزدور کی زندگی اتنی بری نہیں ہو سکتی۔ اگر اسے اچھی تنخواہ ملتی ہے اور وہ اتنے خوب صورت اور نفیس کپڑے پہن سکتا ہے۔'' مگر دوسرا کہہ رہا تھا۔ ''اگر یہ درست بھی ہو تب بھی کوئی بات نہیں۔ ان کے کلچر کا معیار بڑا گھٹیا ہے اور ہمارے پاس تو الانووا LANOVA ہے (اس بیلے کی رقاصہ کا نام اس زمرے میں کس طرح آیا۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہوسکتا ہے میں نے غلط مطلب نکالا ہو) یوکرائینا ہوٹل کے سامنے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ''اس عالیشان عمارت کا کیا کہنا لیکن ہمارے فلیٹ کدھر ہیں۔''؟

(روس میں گھروں کی اب تک کمی بہت ہے— اس کے متعلق اکثر شکایتیں سنی جاتی ہیں۔ حالانکہ کافی نئے فلیٹ تعمیر کیے جا رہے ہیں۔)

یہ صورت حال 1957 میں تھی۔

1960 میں— عوام خروش چیف کے امریکی دورے کے متعلق بڑی بیباکی سے باتیں کرتے تھے۔

''اپنا خروش چیف امریکی سرمایہ داروں کو خوب کھری کھری باتیں سناتا ہے۔''

''بڑا کھرا آدمی ہے۔''

''بڑا آدمی ہے جس کے کندھوں پر ایک بڑا دماغ ہے— ہاں۔''

''وہ ہمیں اور ہماری ضرورتوں کو بڑی اچھی طرح جانتا ہے۔''

جس آدمی نے آخری فقرہ کہا تھا— وہ درمیانی عمر کا تھا اور کافی ہٹا کٹا اور توانا تھا اور میں ایک لحہ سوچتا ہی رہ گیا کیا یہ وہی چور تو نہیں جو خروش چیف سے ملا تھا اور جس کا نام خروش چیف نے بتانے سے انکار کر دیا تھا۔

○

ان تھک مسافر

''جب تک تم کسی اجنبی کی چھت کے تلے نہیں جاتے تمھیں یہ معلوم نہیں
ہوسکتا کہ تمہاری چھت کہاں سے ٹپکتی ہے۔'' (روسی کہاوت)

ایک قدیم پریوں کی کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ ایک بار زار روس نے اعلان کیا۔''میں اپنی لڑکی کی شادی اس آدمی سے کروں گا جو ایک اڑتے ہوئے جہاز میں آئے گا۔''

یہ اعلان سن کر ایک کسان جس کا نام ڈورک تھا اور اسے لوگ بیوقوف بھی کہتے تھے۔ وہ ایک سپید پروں والے جہاز پر پرواز کرتے ہوئے آیا اور شہزادی کا ہاتھ طلب کیا۔ زار یہ دیکھ کر صاف مکر گیا۔ اس نے ڈورک کو ایسے کام بتا دیے جو بیچارہ کر نہ سکتا تھا۔ زار نے کہا! اگر تم شہزادی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو اس قسم کا پانی لاؤ جو زندہ ہو اور گا سکے۔

ڈورک نے ایک بوڑھے آدمی کی مدد سے جو اس کے ساتھ آیا تھا پہاڑی چشمے کے پانی کا لوٹا پیش کیا۔ جو زندگی بخش تھا اور گا تا تھا اور اسی طرح زار نے بہت سے ایسے اور کام بتائے جو کافی مشکل تھے۔ اس کے بعد زار نے کہا۔'' تم شہزادی سے شادی کر سکتے ہو۔ اگر تم کسی فوج کے سربراہ بن کر آؤ۔ اس مشکل کو ایک اور بوڑھے نے حل کر دیا۔ زمین پر کچھ لکڑی کے ٹکڑی

پھینکے اور منتر پڑھا اور آن واحد میں ایک فوج تیار ہو گئی۔ یہ دیکھتے ہی زار ڈر گیا اور اس فوج کو دیکھ کر اس نے اس غریب اور سیدھے سادھے ڈورک کو اپنا داماد بنا لیا۔

خروش چیف کو اس قسم کی کہاوتوں اور پریوں کی کہانیوں سے بے حد شغف ہے اس نے یہ افسانہ ضرور یاد کیا ہوگا جب اس نے TU-114 میں بیٹھ کر ماسکو سے واشنگٹن بغیر کسی جگہ ٹھہرے ہوئے سفر کیا۔ خروش چیف جو ایک کسان کا بیٹا ہے اور جس کا نام ڈورک نہیں گو لوگ اسے بیوقوف کہا کرتے تھے۔ اسی کسان کے بیٹے کا دنیا کی سب سے بڑی طاقت نے بڑی شان سے سواگت کیا اور اسی موقعہ پر پہلا روسی راکٹ چاند کی طرف چھوڑا گیا۔

یہ کہانی بھی پریوں کی کہانی سے کم نہیں۔

خروش چیف امریکہ کیوں گئے — عالمی کشیدگی کو کم کرنے کے لیے یا سرد جنگ کو ختم کرنے کے لیے؟

پراودا میں پہلی بار کسی سوویت لیڈر کا کارٹون چھپا۔ اس کارٹون میں دکھایا گیا کہ خروش چیف جو کسی کان میں کام کرتا رہا ہے۔ بجلی سے چلنے والے ایک ڈرل کو ہاتھ میں لیے ہوئے برف سے بنے ہوئے سرد جنگ کے دیوہیکل بت کو توڑ رہے ہیں — کیا امریکہ جانے کا یہ مقصد تھا کہ مختلف ریاستوں کے سربراہوں کو اکٹھا کیا جائے اور اس بات پر بحث کی جائے کہ اسلحہ کی تخفیف کیسے اور کتنی ہو سکتی ہے؟ — ایٹمی ٹیسٹ کو بند کیا جائے؟ — جرمنی کے ساتھ کن شرطوں پر صلح ہو سکتی ہے۔؟ امریکہ اور روس کے درمیان جو خطرناک ڈیڈلاک ہے۔ اسے کیسے استوار کیا جائے۔ دونوں کے تعلقات میں ایک انسانی رشتہ قائم کیا جائے۔؟

اسی قسم کی باتیں دونوں کے ذہن میں تھیں۔ آئزن ہاور نے خروش چیف کو دعوت دیتے ہوئے ضرور سوچا ہوگا اور خروش چیف نے امریکہ کا سفر کرنے سے پہلے ان امور پر ضرور غور کیا ہوگا۔ لیکن ان باتوں کے علاوہ خروش چیف کے ذہن میں ایک اور انسانی غرض مخفی تھی کہ وہ خود جا کر امریکہ دیکھے تاکہ اسے کیونزم کے سب سے بڑے حریف کے متعلق صحیح حالات معلوم ہوں۔ ایک ایسے ملک کے حالات جس کی اقتصادی برتری کے متعلق وہ اعلان کر چکا ہے کہ چند سالوں کے بعد روس امریکہ سے بازی لے جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ امریکنوں کے

سامنے خود جائے گا تا کہ انھیں معلوم ہو جائے کہ سوویت یونین سے آنے والا انسان کوئی جن بھوت نہیں۔ جس کی قد و قامت سے وہ گھبرا جائیں۔ وہ بیچارا بھی ان کی طرح ایک انسان ہے۔

خروشچیف اس طرح ایک عام امریکی کے واہمات کو دور کرنا چاہتے تھے۔ جس کی وجہ سے آج تک امریکہ اور روس کے تعلقات خوشگوار نہ ہو سکے۔ ایک تقریر میں خروشچیف نے کہا۔ "میرے دیش کے کتنے حصے ایسے ہیں جہاں لوگوں نے اونٹ کو نہیں دیکھا اور کبھی کبھار کوئی اونٹ آئے تو وہاں جھمگھٹا لگ جاتا ہے۔ ہر شخص اسے دیکھنا چاہتا ہے اور اگر ہو سکے تو اس کی دم بھی پکڑنا چاہتا ہے بلکہ اس میں لٹکنا چاہتا ہے۔" تب خروشچیف نے مارشل میک ڈفی MARSHAL MACDUFFIE کی ملاقات کا ذکر کیا جو چار سال قبل ماسکو میں ہوئی تھی۔ "انھوں نے مجھے امریکہ آنے کی دعوت دی تھی اور کہا تھا کہ آپ کی آمد بہت سودمند ثابت ہوگی۔ میں نے پوچھا کیوں؟

میک ڈفی نے جواب دیا۔ بہت سے امریکن یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے سر پر سینگ ہیں لیکن جب ہمارے لوگ یہ دیکھ لیں گے کہ آپ کے سر پر سینگ نہیں ہیں تو یہ بہت بڑی بات ہوگی— اور میرے خیال میں اب آپ کو یقین ہو گیا ہوگا، خروشچیف نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ میرے سر پر سینگ نہیں ہیں۔ اب اگر آپ دوسروں کو بھی بتا دیں تو اس کے بعد لوگوں کو یقین ہو جائے گا کہ کمیونسٹ دوسروں کی طرح ہی انسان ہوتے ہیں۔

اس قسم کی واہیات باتوں کا پھیلانا، سرمایہ داری پریس، ریڈیو، سنیما اور دیگر اداروں کا کام تھا۔ ہالی ووڈ میں ایک ایسی فلم بنائی گئی تھی جس کا نام 'NINOTCHIKA' تھا'۔

اس فلم میں گریٹا گاربو نے کام کیا تھا۔ اس فلم میں گریٹا گاربو نے ایک روسی کومیسار کا پارٹ ادا کیا تھا۔ جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ روسی کومیسار بڑے روکھے پھیکے، جذبات سے عاری، طرز و مزاح سے الگ تھلگ رہنے والے پتلے ہوتے ہیں۔ نئی وزیر تمدن مسز فرتسیوا FURTSEVA، اور مسز خروشچیف کو دیکھ کر آپ کو اپنی رائے تبدیل کرنا ہوگی۔

پچھلے چھ سات برس سے خروشچیف دنیا میں گھوم گھوم کر دوستی اور امن کا پرچار کر رہے ہیں۔
"ساتھیو۔ پچھلی باتیں بھول جایئے— خروشچیف نے یوگوسلاویہ میں جا کے کہا— اب

سے چھ برس پہلے—"ہمارے دلوں میں آپ کے خلاف کچھ نہیں ہے۔" اس اعلان نے دنیا میں ایک سنسنی سی پھیلا دی کیونکہ اسٹالن کی پالیسی کے خلاف خروش چیف نے یوگوسلاویہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔

بلگریڈ سے ہو کر خروش چیف صوفیا اور بخارسٹ گیا تا کہ وہاں کی کمیونسٹ پارٹیوں کو سمجھا سکے کہ اس نے یوگوسلاویہ کے ساتھ مفاہمت کا راستہ کیوں اختیار کیا۔ اس کے بعد خروش چیف ماسکو واپس لوٹا تا کہ ہندوستان سے آنے والے پرائم منسٹر شری جواہر لعل نہرو کا شاندار سواگت کر سکے۔ جواہر لعل نہرو کا روسی دورہ تاریخ میں اپنی جگہ آپ رکھتا ہے۔ اس دورے نے روس اور ہندوستان کے لیے راستے کھول دیے تا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر سکیں۔

میرے ایک دوست نے کہا: "جب میں نے نہرو کو ڈائی نامو DYNAMO اسٹیڈیم میں کئی ہزار روسیوں کو مخاطب کرتے ہوئے دیکھا تو میں نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ کمیونسٹوں کے علاوہ اس دنیا میں ہمارے دوسرے دوست بھی ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد جنیوا میں بجٹ کی پہلی کانفرنس ہوئی۔ جس میں خروش چیف اور بلگانن نے اکٹھے شرکت کی۔ یہ اجتماعی لیڈر شپ کا زمانہ تھا۔ پرائم منسٹر اور پارٹی سیکریٹری دونوں کے ہاتھ میں سوویت یونین کی باگ ڈور تھی۔

اسی زمانے میں ان دونوں نے ہندوستان، برما اور افغانستان کا دورہ کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہندوستانی عوام نے ان کا کتنا شاندار خیر مقدم کیا اور اس دورے کا ہندوستانی عوام پر کتنا اچھا اثر پڑا۔ ہندوستانی عوام کے لیے یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ کمیونسٹ ملکوں کے دوسربراہوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ بلگانن اور خروش چیف۔ یہ ایک عجیب و غریب جوڑا تھا۔ بلگانن کے انداز گفتگو کا لہجہ نرم اور شستہ تھا۔ خروش چیف کا بیباک۔ تیز وطرار ہندوستانی عوام نے خروش چیف کی تقریروں کو بے حد پسند کیا۔ صاف کھلی کھردری تقریریں۔ جس میں خروش چیف کو ہندوستان کی مشکلات کا خاص دھیان بھی تھا۔ اس نے کشمیر اور گوا کے متعلق بلند آواز میں کہا: "اگر آپ کو ہماری ضرورت ہو تو بس ہمیں ایک بار پکاریے۔"

ہندوستان نے خروش چیف کی سیاست کو ایک رنگ و روپ عطا کیا لینن کے بعد کسی سوویت

لیڈر کو پہلی بار یہ موقع ملا تھا کہ وہ اتنے بڑے مجمع کو مخاطب کر سکے۔ اس واقعہ کے بعد خروش چیف نے روس جا کر اپنے عوام کی بڑی بڑی میٹنگوں میں حصہ لیا لیکن سب سے بڑا مجمع دلّی کا ہی تھا۔ جس میں خروش چیف نے تقریر کی تھی۔ اس قسم کا عوامی اجتماع اسے اپنے دیش میں بھی نہ مل سکا۔

ہندوستان نے خروش چیف کے وقار کو بڑھانے میں مدد کی۔ ایک پڑھی لکھی عورت نے مجھے ماسکو میں بتایا"۔ کیا تم جانتے ہو کہ جب خروش چیف پہلی بار ہندوستان گیا تو ہم نے پہلی بار یہ محسوس کیا کہ یہ ایک مختلف قسم کا لیڈر ہے۔ جو عوام سے بالکل نہیں ڈرتا اور اس لیے ہمارے دلوں پر بڑا اچھا اثر پڑا۔"

آپ کو شاید معلوم ہوگا۔ اسٹالن اپنی عمر کے آخری دس سالوں میں کبھی عوام کے سامنے نہیں آیا۔ صرف کبھی کبھار وہ 7 نومبر یا پہلی مئی کو عوام سے کافی دور ریڈ اسکوائر میں کھڑا نظر آجاتا تھا۔ اپنی ساری عمر میں اسٹالن کبھی روس سے باہر نہیں گیا۔

اسٹالن کے مرنے کے بعد اس کے جانشینوں میں ہم ایک نئی تبدیلی دیکھتے ہیں۔ ہندوستان کے دورے کے بعد خروش چیف نے برطانیہ، یوگوسلاویہ، ہنگری، فن لینڈ، چیکوسلاویکیہ، پولینڈ، بلغاریہ، پیکنگ اور برلن کا دورہ کیا۔

یہ تمام سفر اس تاریخی سفر کی تیاری میں تھے۔ جو خروش چیف عمل میں لانا چاہتا تھا۔ اس کا دورہ امریکہ کی جانب، یہ ایک ایسا تاریخی سفر تھا۔ جس کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا۔ لیکن اس کی پوری اہمیت ابھی تک پورے طریقہ سے اجاگر نہیں ہوئی۔ جیسا کہ ہندوستان کے ایک مشہور ہفتہ وار رسالے نے لکھا ہے۔"دنیا کی تاریخ میں یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے دنیا کو نیست و نابود ہونے سے بچالیا۔"

15 ستمبر 1959 کے دن خروش چیف اپنے اڑن کھٹولے سے واشنگٹن کے قریب انڈریو کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ اس کے چہرے پر خود اعتمادی کی جھلک تھی۔ اب وہ پرائم منسٹر بھی تھا اور پارٹی سیکریٹری بھی اور اس وقت اسے تمام اختیارات حاصل تھے کہ وہ روسی عوام کے بل بوتے پر امریکہ سے بات چیت کر سکے۔ روسی عوام نے تاروں اور خطوں کے ذریعہ اپنی محبت کا اظہار کیا

تھا۔اور ساتھ ہی اس کے مشن کی کامیابی کی دعا کی تھی۔

جب خروش چیف نے امریکہ کی طرف رخ کیا تو خروش چیف کو روس کی ٹیکنیکل برتری کا احساس تھا۔خروش چیف کا امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھنا اور روسی راکٹ کا چاند کی زمین کو چھونا۔یہ دونوں واقعے اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔آپ کو پریوں کی کہانی یاد ہوگی۔جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے کہ کس طرح ایک سیدھے سادھے روسی کسان کو زار روس کی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے ایک فوج تیار کرنی پڑی تھی۔

کیونکہ اس وقت کے زار صرف طاقت کی زبان کو سمجھتے تھے۔اس طرح خروش چیف اپنی فوج تو روس چھوڑ کر ادھر آیا تھا لیکن اس کے ساتھ تین چار بوڑھے دانشور تھے۔

رمیش سنگھوی جو بلٹز (BLITZ) کا خارجی ایڈیٹر ہے۔وہ اس وقت خروش چیف کے ساتھ امریکہ میں تھا۔اس نے بتایا کہ خروش چیف کے اس دورے نے امریکی عوام پر بڑا اچھا اثر ڈالا۔ محض خروش چیف کے آنے سے سرد جنگ کی فضا میں ایک نرمی سی آگئی یہاں تک کہ روس کے مخالفین نے اس بات کی تائید کی کہ'امریکی سرمایہ داروں نے خروش چیف آئزن ہاور کی ملاقات کو لبیک کہا اور واشنگٹن پوسٹ نے لکھا!

''ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہمیں آپ کے ملک میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں اور ہم نے غلطیاں کیں۔کچھ لوگ اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ امریکہ نے چین کے ساتھ اس قسم کی غلطیاں کیں۔سرد جنگ نے اس قسم کے حالات پیدا کر دیئے جن کی وجہ سے ہمیں ایسے قدم اٹھانے پڑے۔جو نارمل حالات میں کبھی نہ اٹھائے جاتے۔'' قارئین ان تمام واقعات کو پڑھ چکے ہیں جو خروش چیف کو اس امریکی دورے کے درمیان پیش آئے — کہ کس طرح خروش چیف کی اکثر جگہوں پر بے عزتی کی گئی کس طرح خروش چیف کا ایک نیویارک کے چھوٹے ریلوے اسٹیشن پر ایک معمولی افسر نے سواگت کیا۔خروش چیف کی کاروں کے آگے ایسی موٹریں دوڑائی گئیں جن پر روس کے سربراہوں کے خلاف پوسٹر چسپاں تھے۔ان سیدھے سادھے امریکی لوگوں کو جبریہ خاموش کرنے کی کوشش کی گئی جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کا مہمان ایک بڑا آدمی ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسا انسان ہے جو امن اور صلح کا پیامبر ہے۔بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا

کہ خروش چیف نے کس طرح ان تمام چھوٹی چھوٹی بے عزتیوں کو بڑے سلیقہ اور ہمت سے برداشت کیا۔ گالیوں اور فقرے بازی کا جواب گالیوں سے نہیں دیا بلکہ ہنس کر قہقہے لگا کر اور کبھی کبھار طنز کا استعمال کر کے لوگوں کو چپ کیا لیکن ان تمام امور کے ساتھ خروش چیف کو اپنے مقصد کا مکمل خیال تھا کہ کس طرح اس دنیا میں امن قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اس آدرش کو وہ کبھی نہیں بھولا۔

اس دورے میں وہ اکیلا تھا اور امریکی منسٹرز، سرمایہ دار، جرنلسٹ اور سائنسداں اور سیاست داں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور سوالوں کی بوچھار کرتے تھے۔ ایسے سوال جن کا وہ جواب دے چکا تھا۔ چبھتے ہوئے سوال ہیجان انگیز، شرپسند سوال۔ جن کا بار بار جواب دینا آسان نہ تھا لیکن خروش چیف ان سب کو خوش آمدید کہتا گیا اور مسکراتے ہوئے جواب دیتا رہا۔

اسی طرح ہنری کو بٹ لاج جو آئزن ہاور کی اس دورے میں نمائندگی کرتا تھا۔ وہ تقریباً ہر میٹنگ میں خروش چیف کی تقریر سے پہلے کیمونسٹوں کے خلاف ایک تقریر کرتا تھا اور اس کے بعد خروش چیف کو اس تقریر کا جواب دینا پڑتا اور اپنی پوزیشن کو بچانا پڑتا۔

لوگ یہ جانتے تھے کہ خروش چیف ایک باعمل اور تجربہ کار آدمی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا ہے لیکن اس امریکی دورے میں اس کی ذہانت اور ذکاوت منظر عام پر آئی۔ جس کی مثال ذرا مشکل ہی سے ملتی ہے ۔۔اس کے مخالفین نے اس بات کو مانا۔۔ کہ ہمارا مدّ مقابل ہم پر بھاری ہے۔ امریکی کانگریس کے لیڈروں کی ایک میٹنگ کے بعد سینٹر رچرڈ رسل SENATOR RICHARD RUSSEL نے جو مسلح فوج کمیٹی کے چیئر مین ہیں۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ ہمارا مہمان دنیا کے کسی حصہ میں، جمہوریت کے پلیٹ فارم پر ایک بہت بڑا حریف ثابت ہو سکتا ہے۔''

خروش چیف نے اس کے جواب میں کہا۔ ''حریف نہیں بلکہ حامی کہیے حامی!''

اس دورے میں صرف ایک بار خروش چیف۔۔ آپے سے باہر ہو گئے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اگر موقعہ ملے تو وہ ناراض بھی ہو سکتے ہیں۔ لاس اینجلز LOS ANGELES کے میئر نے اپنی تقریر میں نہایت ہی ناگوار اور اشتعال انگیز باتیں کہیں جس میں بار بار اس بات کا ذکر کیا کہ آپ تو ہم سرمایہ داروں کو قبر میں اتارنے پر تلے ہوئے ہیں۔!''

خروش چیف اس بات کا جواب کئی بار دے چکے تھے اور وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ جو کچھ میں نے سرمایہ داری کے بارے میں کہا تھا وہ تاریخی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر کہا تھا جس طرح سرمایہ داری نے ساختی نظام کو ختم کر کے اپنا سکہ جما لیا تھا اسی طرح سوشلزم سرمایہ داری کی جگہ لے گا۔

جس طرح خروش چیف نے بیباکانہ انداز میں اس کا جواب دیا، اسے آپ بھی پڑھ لیجیے۔

''میں اپنے میزبان کے سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم آپ کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ میں صرف آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ ان سوالوں کو بار بار کیوں دہراتے ہیں، جن کا جواب میں کتنی بار دے چکا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ اخبار ضرور پڑھتے ہوں گے۔ (قہقہہ) خواتین اور حاضرینِ جلسہ! ایسا معلوم پڑتا ہے، کچھ لوگوں کو سرد جنگ اور اسلحہ بندی کا مسئلہ بے حد مرغوب ہے۔ وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے اگر انھوں نے اسے ڈھانپ کر کہیں الگ رکھ دیا تو پھر وہ بیچارے کیا کریں گے؟ میں بڑی نیک نیتی اور دیانتداری سے ادھر آیا ہوں لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسے محض مذاق سمجھتے ہیں۔ میں یہ پھر کہتا ہوں کہ اس مسئلے کی بڑی اہمیت ہے— امن اور جنگ کا مسئلہ —یہ عوام کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ہم دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اگر آپ کو ہماری دوستی کھلتی ہے تو صاف صاف کہیے'—

ایک آواز'— ہم آپ کی دوستی چاہتے ہیں'—

'کبھی کبھی میں' سوچتا ہوں کہ کیا آپ نے مجھے اس لیے بلایا تھا کہ آپ اپنی طاقت کا مظاہرہ کر سکیں تاکہ میں آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں گا۔ اگر آپ اس طرح سوچتے ہوں تو غلط فہمی میں مبتلا ہیں— ہمیں واپس گھر پہونچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ یہاں پہونچنے کے لیے صرف بارہ گھنٹے لگے تھے اور مجھے یقین ہے کہ ہم دس گھنٹے میں واپس روس پہنچ جائیں گے۔''

لاس اینجلز کے گیارہ ہزار شہریوں کے سامنے جو سوویت وزیر اعظم کے اعزاز میں ڈنر کھانے آئے تھے، یہ واقعہ ہوا۔ ٹیلی ویژن، ریڈیو پر کئی لاکھ انسان اس منظر کو دیکھ رہے تھے اور سن رہے تھے۔

جنگ اور امن کے درمیان بڑی نازک ڈور بندھی ہوئی تھی۔ اگر اس وقت ایک پلیٹ ٹوٹ جاتی تو ایسا دھماکہ ہوتا، جس سے یہ معلوم ہوتا کہ ایٹمی جنگ کا آغاز ہو گیا ہے لیکن خطرہ گزر گیا

اورخروش چیف نے مزاحیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ایسی زبان استعمال کرنی چاہیے جو دونوں آسانی سے سمجھ سکیں اور ہم سب کو امن کی بنا پر کوشش کرنی چاہیے۔"

یہ ہے خروش چیف کی فراخ دلی کہ اس لفظی جنگ کے بعد ہی فوراً اس نے لاس انجلز کے میئر کو ماسکو آنے کی دعوت دی۔

اس واقعہ کے بعد آئزن ہاور نے مداخلت کی اور خود اس قسم کے رویہ کی روک تھام کے آرڈر پاس کیے اور ساتھ ہی سوویت یونین کے پرائم منسٹر کو اس قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ جس کی وجہ سے وہ عام امریکنوں سے آزادانہ طور پر ملاقات کر سکے۔

اس کے بعد عام امریکی خروش چیف کے زیادہ قریب آ گئے اور جہاں کہیں خروش چیف کی گاڑی جاتی لوگ جوق در جوق اس کا سواگت کرتے۔ انسانیت کی خو، جاگ اٹھی۔ سان فرانسسکو میں خروش چیف نے ایک ماہی گیر سے اپنی ہیٹ دے کر اس کی ٹوپی لی۔ پیٹس برگ کی فیکٹری کے ایک مزدور نے خروش چیف کو سگار پیش کیا۔ اور خروش چیف نے اسے اپنی گھڑی بطور تحفہ دی۔ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں سے گزرتے ہوئے وہ لوگوں سے ہم کلام ہوا۔ اس نے ایک بوڑھی عورت سے پوچھا۔

"تمھیں کیا چاہیے ۔۔؟"

اس بڑھیا نے جواب دیا کہ مجھے امن چاہیے تا کہ اس دنیا میں دوبارہ جنگ نہ ہو سکے۔ یہ کام جو خروش چیف نے کیا تھا۔ اس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ ایک عظیم کارنامہ تھا جس کی وجہ سے دو ملکوں کے قومی تعلقات خوشگوار ہوئے۔ اس دورے کے درمیان خروش چیف ایک لمحہ بھی اپنی آمد کے اصلی مقصد کو نہیں بھولا۔ وہ امریکی لوگوں کو بتانا چاہتے تھے کہ سوویت یونین واقعی امن چاہتا ہے۔ وہ بتانا چاہتے تھے کہ اسلحہ بندی کے کیا خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں اور خاص کر یہ بتانے کے لیے اگر دونوں ملکوں میں پرامن باہمی وجودیت کی بنا پر مقابلہ ہوا اور کوئی ملک ایک دوسرے کے اندرونی حالات میں مداخلت نہ کرے تو دنیا کتنی ترقی کر سکتی ہے۔

ان مسائل پر خروش چیف نے دن میں چار چار تقاریر کیں۔ مختلف دلائل سے جرنلسٹوں، طلبا، مزدوروں، کسانوں، ٹریڈ یونینیسٹ، گورنر، میئر، سینیٹر اور کانگریس کے ممبروں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اس نے ہر نقطہ کی وضاحت کی، بحث کی، متبرک مذہبی کتابوں کا حوالہ دیا، شاعری کا سہارا

لیا اور یہ بتایا کہ اگر ایٹمی جنگ ہوگئی تو اس کا انجام نوع انسانی اور انسانی تمدن کی ہلاکت ہے۔

جو امریکن روس دیکھ کر آئے ہیں۔ ان کی رائے الگ الگ ہو سکتی ہے لیکن ایک بات پر ہر شخص متفق ہے کہ روسی عوام کے ہونٹوں پر دوستی اور امن کے لفظ بار بار آتے ہیں اور یہ دو لفظ آپ کو ہر جگہ نظر آئیں گے۔ ریل کی پٹریوں پر، باغوں میں، پھولوں سے سجائے ہوئے پارکوں میں، اسکوائر میں اور گھروں کی دیواروں پر چسپاں ہوں گے اور یہ الفاظ روسیوں کے دلوں میں کھدے ہوئے ہیں۔

''کیا خروش چیف کو اپنے مشن میں کامیابی نصیب ہوئی — ؟''

معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے مشن میں کامیابی ہوئی اور اس کے اندازے سے زیادہ کیونکہ جب وہ امریکہ آیا تھا تو اسے بخوبی علم تھا کہ کچھ لوگ اس کی امن پسند پالیسی کے خلاف ہیں اور اس کا امریکہ جانا پسند نہیں کرتے۔

خروش چیف کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا کہ امن کے استحکام کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔ لاکھوں امریکی عوام نے اس کی امن کی سرگرمیوں کو سراہا اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور جب وہ ہوائی جہاز کے ذریعہ واپس اپنے دیش پہنچے تو اس کے ہاتھ میں خطوں اور تاروں کا ایک بنڈل تھا۔ یہ خط امریکی لوگوں کے تھے۔ یہ تار ان سیدھے سادھے انسانوں کے تھے، جنھوں نے خروش چیف کی 'امن کی تلاش' کو خوش آمدید کہا تھا۔ یہ تار ملاحظہ فرمائیے جو کیلی فورنیا کی ایک عورت نے اسے بھیجا۔

''آنریبل مسٹر خروش چیف!

آپ اپنے آپ کو زیادہ مت تھکائیے۔ آپ کے اس مختصر دورے میں ہم آپ کے اور آپ کی بیوی کے پرستار ہو گئے۔ جس تیز رفتاری سے آپ نے ہمارے دیش کا دورہ کیا، اس سے ہماری ایک کہاوت کے مطابق ایک گھوڑا بھی جاں بحق ہو سکتا تھا۔ آپ ضرور آرام کیجیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس بار جب آپ ہمارے صدر مسٹر آئزن ہاور سے ملیں تو آپ کی صحت اسی طرح ہو، جس طرح آپ کی صحت سان فرانسسکو میں تھی، جہاں ہماری ملاقات آپ سے ہوئی تھی۔'' لیڈیا ڈاگ لو''

LADIADAGLOW

O

'آوارہ ہوں'

تم بھی سچ کہتے ہو اور میں بھی۔ ہر شخص کہتا ہے — لیکن سچائی کہیں نظر نہیں آتی!'' (روسی کہاوت)

1954— خزاں کے موسم میں سارے سوویت دیس میں ایک چھوٹا سا انقلاب آ گیا۔ اس انقلاب کو لانے والا ایک نوجوان ہندوستانی تھا۔ جو پھٹیچر ولایتی کپڑوں میں ملبوس، شکل وصورت سے آوارہ اور جس کا کام جیب کاٹنا تھا۔ جس نے ایک ڈھیلی ڈھالی پھٹی ہوئی پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ جس کی نگاہوں سے رومانیت جھلکتی تھی اور غنڈوں کی طرح چلتا پھرتا تھا۔ 'آوارہ ہوں' کا گیت اس کے ہونٹوں پر تھا۔ یہ عجیب وغریب کردار ایک رات میں سارے روس میں ہر دلعزیز ہو گیا۔ اسے دیکھنے کے لیے لوگ گھنٹوں 'کیو' میں کھڑے رہتے۔ بارش برستی یا برف پڑتی لوگ اسے دیکھنے کے لیے بے قرار نظر آتے۔ اس کے گیت سننے کے لیے گھنٹوں انتظار کرتے مگر یہ آوارہ گرد محض ایک سایہ تھا۔ ایک فلم کا کردار تھا۔

ماسکو سے لے کر ولاڈی واسٹک تک اسی کا چرچا تھا اور شمالی روس کے ایک دور دراز کے علاقہ میں جہاں کچھ سائنسداں کام کر رہے تھے، نومبر کو یہ فلم بطور ایک تحفہ کے بھیجی گئی۔ بخارا میں

ہر نوجوان کے ہونٹوں پر اسی گیت کے بول تھے اور اس فلم نے سارے سوویت دیس میں ایک آگ سی لگا دی۔ کچھ مہینوں کے اندر اس فلم کے گیت ہر ریستوران، ہوٹل میں بجنے لگے۔ بینڈ والوں نے اس فلم کے گیت کو بجانا شروع کیا، یوکرینی اور جارجیائی لڑکے لڑکیاں، ہندوستانی میں اس گیت کو گاتے اور سبھی لہک لہک کر کہتے کہ ہم نے اس فلم کو بیس، تیس بار دیکھا ہے۔ سوویت سینما کی تاریخ میں کسی فلم نے اتنی مقبولیت حاصل نہ کی تھی — جتنی اس نے۔

ماسکو میں ہندوستانی فلم فیسٹول کے موقع پر فلم 'آوارہ' دکھائی گئی تھی۔ ستمبر کا مہینہ تھا اور اس وقت کسی کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ فلم اتنی مقبول ہو جائے گی۔ راج کپور اس فلم کا ڈائریکٹر اور ہیرو تھا اور میں نے اس فلم کے ڈائیلاگ اور سینریو لکھے تھے لیکن ہم دونوں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہماری فلم 'آوارہ' اتنی مقبول ہو جائے گی۔

ہم نے سوچا تھا کہ ہم نے ہندوستانی تجارتی حدوں میں رہ کر ایک ایسی فلم بنائی تھی جس میں ناچ، رومانس، گانے بھرے پڑے تھے اور اس کے ساتھ ایک ترقی پسند سماجی پیغام بھی تھا — 'کہ بدمعاش پیدا نہیں ہوتے بلکہ سماجی ناانصافیاں انھیں جنم دیتی ہیں —'

یہ پیغام رومان، ہنسی مذاق اور بھڑکیلے سنگیت کی شکر میں لپیٹ کر دیا گیا تھا۔ یہ فلم ہندوستان میں بے حد مقبول ہوئی تھی اور یہ بات ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی کہ روس میں یہ فلم اتنی مقبولیت حاصل کر لے گی جہاں کے لوگ سوشلسٹ حقیقت نگاری کی روایتوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ جنھوں نے آئین اسٹائن EISENSTEIN اور پوڈوکن PUDOVKIN کی شہرہ آفاق اور حقیقت پسندانہ فلمیں دیکھی ہیں۔ وہ لوگ اس فلم میں کیا دلچسپی لیں گے لیکن یہاں سب کچھ الٹ ہوا۔ اس فلم نے سارے روس میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ آرٹ اور جمالیاتی قدروں پر بحث شروع ہوگئی۔ ثقافتی دنیا میں ایک ہل چل مچ گئی۔

میں نے ایک طالب علم سے پوچھا۔ "تمھیں 'آوارہ فلم میں کون سی ایسی حیرت انگیز بات نظر آئی جس کی وجہ سے تم لوگ بالکل پاگل ہوئے جاتے ہو؟"

جواب دینے کی بجائے اس نے فوراً سوال کیا۔ "کیا آپ نے ان فلموں کو دیکھا جو ہم بیس برس سے روس میں دیکھ رہے ہیں۔"؟

میں نے سب فلمیں تو نہیں دیکھیں لیکن جو دیکھی تھی ان میں کچھ مجھے یاد تھیں۔ میں نے 'فال آف برلن' دیکھی تھی۔ جس میں اسٹالن کی ضرورت سے زیادہ خوشامد کی گئی تھی۔

میں نے آئین اسٹائن کی بنائی فلم'' آون دی ٹیریبل IVAN- THE TERRIBLE دیکھی تھی۔ یہ فلم واقعی ایک شاہکار تھی۔ اس فلم کا ہیرو ایک مطلق العنان انسان تھا جس نے روس میں ایک نئی زندگی پھونک دی تھی۔ 'کنٹری ٹیچر' ایک ایسی فلم تھی جس میں ایک ایسی عورت کا کردار پیش کیا گیا تھا کہ جس نے اپنی ساری زندگی بچوں کی تعلیم کے لیے وقف کر دی ہے اور اس طرح کی اور فلمیں بھی دیکھیں تھیں جس میں نو جوانوں کو پیداوار بڑھاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

ہندوستان میں اس قسم کی فلمیں کم بنتیں ہیں۔ ہمارے ہاں زیادہ تر فلمیں محض تفریح کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ اس لیے مجھے سوویت فلموں کی مقصدیت اور ان کی سنجیدگی مقابلتاً پسند آئی۔ میں نے طالب علم سے کہا۔

'' مجھے روسی فلمیں پسند آئیں اور خصوصاً آپ کی ایسی فلمیں جن کا موضوع جنگ تھا۔''

'' ہم تو جنگ سے تنگ آ چکے ہیں۔ ہم نے جنگ کے ہر پہلو کو دیکھا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اس کی یاد کو تازہ کریں؟ اب ہم جنگ کے بجائے محبت کو فلم کے پردے پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم بے فکری کی خوشی سے ہم آغوش ہونا چاہتے ہیں۔ بھئی ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں کوئی ہنسائے اور اس لیے ہم یہ فلم' آوارہ' دیکھنے کے لیے پاگل ہو جاتے ہیں—''

روس کے ثقافتی میدان میں ہر جگہ یہی حالت تھی۔ عصر جدید کے ڈرامے بہت کم لوگ دیکھتے تھے۔ کلاسیکل ڈرامے مقبول عام تھے۔ ماسکو میں شیکسپیئر کے ڈرامے کھیلے جاتے—ایک ہی وقت میں تین تین شیکسپیئر کے ڈرامے دکھائے جاتے۔ کسی تھیٹر میں ہملیٹ دکھایا جا رہا تھا۔ کسی میں اوتھیلو اور کسی تھیٹر میں 'مڈسمر نائٹ ڈریم' اور ایک تھیٹر میں رومیو جولیٹ کا بیلے دکھایا جا رہا تھا۔ اس سے صاف دکھائی پڑتا تھا کہ پرانے کلاسیکل ڈرامے زیادہ ہر دلعزیز تھے اور عہد حاضر کے ڈرامے کو بہت کم لوگ دیکھنے جاتے تھے۔

روس کے عوام پڑھنے کے شیدائی ہیں لیکن 1954 میں ینگ گارڈ YOUNG GAURD اور اسٹوری آف اے ریل مین STORY OF A REAL MAN کو چھوڑ کر— قارئین غیر ملکی کلاسک۔

کانن ڈائیل کی جاسوسی یا جولیز ورنی کی سائنسی کہانیاں پڑھتے تھے۔ اسٹالن کی پالیسی نے اس قسم کے ادب کو فروغ دیا تھا جو خشک پروپیگنڈے سے لبریز اور شدید تعصب کا رنگ لیے ہوئے تھا۔ لازماً لوگوں کے دلوں میں اس قسم کے ادب کے خلاف ایک نفرت سی پیدا ہوگئی۔ اب فلم 'آوارہ' دیکھ کر ان کی دبی ہوئی خواہشات جاگ اٹھیں اور اس وجہ سے فلم آوارہ روس میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس قسم کی انوکھی اور نرالی مقبولیت اس بات کی شاہد تھی کہ لوگ روسی فلموں کی بے اثر مقصدیت اور غیر دلچسپ مناظر کو دیکھ دیکھ کر تنگ آ گئے تھے اور گویا ہر شخص فلم آوارہ کو دیکھ کر اپنے احتجاج کا اظہار کر رہا تھا۔

اسٹالن کی موت کے بعد ــ حالات اور ماحول نے پلٹا کھایا۔ ماحول میں جو جبر اور گھٹن تھی اس میں بالترتیب کمی ہوئی اور اسی وجہ سے سوویت ادب اور آرٹ میں ایک نئی تخلیقی قوت کا اضافہ ہوا۔

ایرن برگ نے اپنا ناول 'THAW' (برف پگھلتا ہے) لکھا۔ یہ دور اسی ناول کے نام سے پکارا جانے لگا اور خروش چیف نے بیسویں کانگریس میں جو رپورٹ پیش کی تھی وہ اسی ناول کے موضوع کی تفصیل معلوم ہوتی تھی۔ سوویت یونین کے ادیبوں نے ایرن برگ کو بہت برا بھلا کہا لیکن 1954 کی ادیبوں کی کانفرنس میں ادیبوں اور قارئین نے ایرن برگ کا شاندار سواگت کیا۔

خروش چیف کی رپورٹ کے بعد کارنی چوک KORNEI CHOVK کا ڈرامہ اسٹیج کیا گیا۔ جس میں یہ دکھایا گیا کہ اسٹالن کے عہد میں کس طرح بے گناہوں پر ظلم و استبداد ہوتا تھا۔ اسی طرح وودن استوف DUDIN STOV نے 'ناٹ بائی بریڈ الون' NOT BY BREAD ALONE لکھا۔

اگر ایرن برگ کے ناول نے روسی ثقافتی قدروں کے خلاف جہاد کیا تو وودن استوف نے اپنے ناول میں روحانی اور جذباتی قدروں کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ وہ قدریں جو دور اسٹالن میں نظر انداز کی گئی تھیں۔

مجھے یہ ناول پسند آیا کیونکہ اس میں عہد حاضر کے ایک روسی کردار کی داخلی زندگی سامنے آتی ہے۔ اس کردار پر جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے لیکن یہ کردار ہمت اور جوانمردی سے کام لیتا ہے۔ اپنی سیاسی بصیرت کو کام میں لاتے ہوئے ان تمام مشکلات کا سامنا کرتا ہے لیکن سوویت یونین کے بعض نقادوں نے اس ناول کو پسند نہیں کیا بلکہ اس کے خلاف احتجاج کیا۔

دو سال کے بعد پاسترنک کے ناول ڈاکٹر ژیواگو DOCTOR ZHIYAGO پر حملے کیے

گئے کیونکہ مغربی نقادوں نے اس ناول کو روس کے سوشلسٹ نظام کے خلاف آلۂ کار بنالیا۔ ''دودن استوف'' کے خلاف غصے کی ایک لہر دوڑ گئی اور اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ اپنی ادبی تخلیقات سے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔لیکن اس تنقید کے باوجود اسے روس کے ادیبوں کی یونین سے نہیں نکالا گیا اس وقت یہ کہا جاتا تھا کہ خروش چیف نے خود یہ ناول پڑھا اور دودن استوف کو زیادہ ذلیل وخوار ہونے سے بچالیا۔

تین سال کے بعد خروش چیف نے بذات خود اس ناول کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے اور کہا کہ ناول مجھے پسند نہیں آیا یہ ایک متعفن گلدستہ ہے اور اس کڑی تنقید کے باوجود اس ناول کو چھاپنے کے خلاف اس نے کوئی آواز بلند نہیں کی کیوں۔؟— خروش چیف نے کہا۔اس ناول میں کچھ اچھی باتیں ہیں اور میں اس ناول کو بغیر اکتائے ہوئے پڑھ گیا۔کامریڈ مکویان MIKOYAN نے بھی یہ پڑھا تھا اور انھوں نے مجھ سے کہا۔'اسے ضرور پڑھیے۔'اس میں کچھ ایسی باتوں کا ذکر ہے جن سے لگتا ہے جیسے آپ ہی نے کہی ہیں۔ دودن استوف نے کچھ منفی انوکھے قسم کے واقعات کو بڑھا چڑھا کر ضرور پیش کیا ہے لیکن میں نے اس سے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ دودن استوف ہمارے سوویت سماج کا دشمن نہیں ہے۔''

خروش چیف نے اپنی تقریر میں پاسترناک اور'ڈاکٹر ژیاگو' کا ذکر نہیں کیا۔گو بہت سے لوگ یہ چاہتے تھے کہ خروش چیف اس ناول کی ملامت کریں لیکن خروش چیف خاموش رہے۔اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ خروش چیف نے خود دوسرے لوگوں کو تنبیہ کی کہ پاسترنک پر اس قسم کے ذلیل حملے نہ کریں؟

اگر یہ تمام ناول خروش چیف کے دور سے پہلے چھپے ہوتے تو یہ سارے ادیب ایرن برگ، دودن استوف اور پاسترنک کسی جیل میں ہوتے اور انھیں غدار اور عوام دشمن کہہ کر ہمیشہ کے لیے ختم کردیا جاتا۔خروش چیف کو یہ تینوں کتابیں ناپسند ہیں لیکن صرف خروش چیف کی وجہ سے وہ چھپ سکیں۔خروش چیف کے آنے سے پہلے اس قسم کی کتابیں وجود میں نہ آسکتی تھیں۔اسٹالن ہمیشہ اپنے آپ کو آرٹ، ادب، علم، تعمیر اور لسانیات کا ماہر سمجھتا تھا اور ان علوم کے متعلق اپنا فیصلہ بے جھجک کرتا تھا۔خروش چیف اس سلسلے میں بڑی انکساری سے کام لیتے ہیں۔اس بار جب میں نے انٹرویو کے دوران اُن سے یہ سوال پوچھا: کہ کیمونسٹ سماج میں کلچر کا مستقبل کیا ہوگا'

تو انھوں نے ہم تینوں ادیبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ آپ لوگوں کا میدان ہے۔ آپ بتائیے۔''

'میں کوئی ادبی نقاد نہیں۔' انھوں نے ایک بار ادیبوں سے کہا۔ ''اس لیے میں آپ کی ادبی کاوشوں کا تجزیہ نہیں کرسکتا۔ اس لیے بہتر بات یہ ہوگی کہ آپ ہی خود تنقید کریں۔''

خروشچیف نے ادبی احتساب کرنے والوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ پھر آپ کہیں گے کہ ہم پر تنقید کیجیے ہم پر احتساب کیجیے اور اگر ہماری تخلیق میں کوئی غلطی ہو تو اسے مت چھپایئے۔ شاید آپ یہ جانتے ہوں گے کہ کسی کتاب کو پڑھ کر فوری اس بات کا فیصلہ کر لینا آسان نہیں کہ اسے چھاپنا چاہیے یا نہیں۔ بظاہر سب سے آسان کام تو یہ ہے کہ کچھ نہ چھاپا جائے پھر تو کوئی انسان غلطی نہیں کرے گا اور جس انسان نے ان چیزوں کو چھاپنے سے منع کیا تھا وہ تو عقلمند ثابت ہوگا مگر یہ بات احمقانہ ہوگی'۔ خروشچیف ادیبوں کو خود مختارانہ آزادی دینے کے حامی ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ پارٹی اور دیگر افسر ادیبوں کے کام میں دخل دیں۔ انھوں نے کہا ساتھیو، حکومت پر یہ غیر ضروری بوجھ نہ ڈالو کہ وہ ان مسئلوں کو بھی حل کرے۔ تم اپنے درمیان ان مسئلوں کو خود حل کرنے کی کوشش کرو۔''

یہ تھی آزادی جو ادیبوں کو کچھ سالوں میں میسر ہوئی۔ اس کی وجہ سے سوویت ادب اور آرٹ نے ترقی کی طرف قدم اٹھایا۔ ایسا محسوس ہوا کہ تخلیقی قوتوں پر جو بند لگائے گئے تھے وہ یکا یک ٹوٹ گئے۔ آج سے سات سال پہلے کیا کوئی شخص سوچ سکتا تھا کہ سوویت فلموں میں عاشقانہ کہانیاں پیش کی جاسکیں گی۔ دوستووسکی DOSTO VESKY کافی عرصہ سرکاری احتساب کے شکار رہے لیکن اب ان کی کتابیں نہ صرف شائع ہو رہی ہیں بلکہ ان کے فلم بھی بنائے جا رہے ہیں۔ اسٹالن کے عہد میں ہر اس قیدی کو غدار سمجھا جاتا تھا جو جرمنوں کی قید سے رہا ہو کر آیا تھا کیا اس وقت یہ ممکن تھا کہ شولوخاف انسان کی قسمت جیسا شاہکار لکھے اور بندر چوک BANDER CHOUK اس کا فلم پروڈیوس کرے؟ کیا اس وقت کوئی ادیب 'ڈھول والی' DRUM BEARER ایسا ڈرامہ لکھ سکتا تھا۔ جس میں ایک ایسی معصوم لڑکی کی داستان ہے جو جنگ کے زمانے میں ایک طوائف بن گئی تھی تاکہ وہ اپنے ملک کے لیے جاسوسی کر سکے یا کوئی ادیب 'ارکوتسک کی کہانی' IRKUTSK STORY

لکھ سکتا تھا۔ جس میں ایک ایسے موضوع کا ذکر ہے جو اپنی جگہ پر ابدی ہے۔ وہ محبت جو کبھی نہیں مرتی اور کسی قسم کے نظریاتی مسئلے کی طرف ذہن کو نہیں الجھاتی۔

اب سوویت یونین کے عوام، اٹلی، ہندوستان، برطانیہ اور امریکہ کی تیار کردہ فلموں کو دیکھ سکتے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ کے نئے تجرباتی ڈرامہ دیکھ سکتے ہیں۔ ایک ایسے دیش میں جس کی جمالیاتی روائتیں بڑی پرانی اور ترقی یافتہ ہیں۔ ان کے لیے اس قسم کا تبادلہ حیرت انگیز نہیں ہونا چاہیے لیکن اسٹالن کے عہد کے احتساب نے لوگوں کے ذہنوں پر قفل لگا دیے تھے۔ روس میں جب کبھی لڑکے اور لڑکیاں راک اینڈ رول بھی کرتی ہیں تو لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک نئی آزادی حاصل کی ہے۔ جب آرتھر کوئسلر ARTHUR KOESTLER نے 'یوگی اور کومیسار' YOGI AND COMMISAR نامی ایک کتاب لکھی۔ اس وقت اس نے یوگا اور رکمیونزم کو ایک دوسرے کے مخالف لا کھڑا کیا۔ جیسے دونوں میں کبھی مصالحت نہ ہوسکے گی لیکن 1960 میں یہ بات کوئسلر کے لیے کافی دلچسپ ہوگی کہ سوویت دیس کے ہزاروں روسی یوگا کے موضوع پر بڑے شوق سے کتابیں پڑھتے ہیں اور سوویت لائبریریوں میں جتنی کتابیں یوگا پر مل سکتی تھیں انھیں ٹائپ کروا کے لوگ پڑھ رہے ہیں انھیں تقسیم کر رہے ہیں۔ اور اسی قسم کی کاپیوں سے کاروبار بھی ہو رہا ہے۔ مجھے ایک دوست نے بتایا کہ اس نے یوگا پر ایک کتاب کی اس قسم کی کاپی کے 200 روبل دیے۔ روسیوں کی یوگا میں دلچسپی محض ایک فیشن ہی نہیں بلکہ سوویت یونین کے سائنسداں اس پرانی سائنس میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں اور یوگا پر ایک سیر حاصل کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے شوق سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سوویت یونین کے عوام صرف مارکسزم کے شیدائی ہی نہیں بلکہ وہ دنیا کے دوسرے علوم سے پوری واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس دوران میں سوویت یونین نے نہرو کی آمد پر ان کی کتاب تلاش ہند DISCOV-ERY OF INDIA چھاپی۔ اگلے سال نہرو کی سوانح عمری بازار میں آئی۔ یہ کتاب بھی عوام میں کافی مقبول ہوئی۔

گاندھی جی کی کتاب 'تلاش حق' روسی عوام نے کافی پسند کی۔ ان کتابوں کے علاوہ ہندوستان کے پرانے کلچر کے متعلق بہت سی کتابوں کو چھاپا جا رہا ہے تا کہ ہندوستان کے کلچر کے بارے میں بھی انھیں معلومات حاصل ہوں۔

اس طرح دنیا کے مشہور ادیبوں کی کتابیں روس میں چھاپی جارہی ہیں۔ مثلاً شیکسپیئر، ڈکسن، بالزک، زولا، گالزوردی، دریسر، بائرن، شیلے، ویٹ مان اور ٹیگور— پرانے کلاسیکل ادیبوں کے علاوہ سوویت یونین میں دنیا کے اُن ادیبوں کی کتابیں بھی چھاپی جارہی ہیں جن کا نقطۂ نظر ان سے نہیں ملتا، جیسے سارترے، فاک نر، ہیمنگ وے، سمرسٹ مام، سردیان، گراہم گرین اور ایل برتو ماروبار۔ اسی طرح دوستوؤسکی کی کتابوں کو چھاپا جارہا ہے۔ آج سے چھ سال پہلے دوستوؤسکی روسیوں کا منظورِ نظر نہ تھا۔

انقلاب روس کے بعد سارے روس میں ایک تلاطم برپا ہوگیا تھا۔ اسی طرح آج کل نئے جمالیاتی مسئلے زیرِ بحث ہیں، اس بحث میں یونیورسٹی کے طلباء، دانشور، ادیب اور آرٹسٹ شامل ہیں۔

"کیا آج کے سائنسی دور میں شاعری کی جگہ ہے؟"

اس موضوع پر بڑے زور شور سے بحث ہورہی ہے۔ اخباروں، رسالوں اور پبلک پلیٹ فارم پر اس موضوع پر بحث ہوتی ہے۔ ایرن برگ نے اس موضوع پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ سائنس اور جمالیات میں کوئی تضاد نہیں۔ حالانکہ سائنس کی خطرناک طاقتوں کو رام کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس بحث کے دوران میں یا خاتمہ پر کریملن سے کوئی حکم الٰہی صادر نہیں ہوا۔ اور لوگوں کو بحث کرنے کی پوری آزادی ملی۔

خروش چیف کے دورِ حکومت میں لوگوں کو آزادانہ طور پر پڑھنے، لکھنے، سوچنے بحث کرنے اور تخلیقی حیثیت سے اپنے خیالوں کے اظہار کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ وہ مختلف لوگوں سے ملتے ہیں، وہ مختلف تہذیبوں اور خیالوں سے ہم کنار ہوتے ہیں۔

جس طرح گوشت اور مکھن کھانے کی تعلیم —اور گھروں میں رہنے کی آزادی انھیں میسر ہے۔ اسی طرح یہ ذہنی آزادی ان کے لیے ایک بنیادی ضرورت بن گئی ہے۔ خروش چیف نے اس نئی ضرورت کی خاصی اہمیت جتائی ہے انھوں نے صرف عوام کی ساری زندگی کی ضروریات کے لیے خوشگوار حالات ہی پیدا نہیں کیے بلکہ کسان کی روحانی ترقی کے لیے ایک سازگار ماحول پیدا کیا ہے۔

○

تیسرا حصہ

خروش چیف کی زبانی

یہ انٹرویو مشہور ہندوستانی شاعر علی سردار جعفری، سوویت یونین کے ادیبوں کے بورڈ کے سیکریٹری مرزا ترسون زادے اور روسی وزارت کے شعبۂ صحافت کے افسر اعلیٰ ایم۔ اے خارمولود کی موجودگی میں ہوا۔

خواجہ احمد عباس: میں سوویت یونین میں پہلی بار نہیں آیا لیکن مجھے آپ سے ملنے اور بات چیت کرنے کا پہلی بار شرف حاصل ہوا ہے۔ اتنی مصروفیت کے باوجود بھی آپ نے مجھے ملنے کا موقعہ دیا۔ میں اس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ علی سردار جعفری بھی اس ملاقات کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

این ایس خروش چیف: مجھے بھی آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری باہمی گفتگو ایک دوسرے کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

عباس: میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھ رہا ہوں۔ میں اس کتاب میں روسی عوام کے موجودہ

حالات، آپ کے حالات زندگی اور خیالات اور امن کے بارے میں آپ کی جدوجہد کی پوری تصویر کشی کرنا چاہتا ہوں۔
صرف ہمارے ملک کے عوام ہی نہیں، بلکہ دوسرے ملکوں کے عوام بھی اس جدوجہد کو پڑھ کر خوش ہوں گے۔ کیونکہ یہ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بین الاقوامی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے آپ کی کوششیں سب سے نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

خروش چیف: ان حالات کو خوشگوار بنانے کا حوصلہ صرف مجھے ہی نہیں ملنا چاہیے بلکہ ان تمام لوگوں کو بھی ملنا چاہیے، جنھوں نے بین الاقوامی کشیدگی کو کم کرانے اور مختلف ملکوں میں پرامن تعلقات قائم کرنے میں مدد کی ہے۔ اکیلا آدمی بے بس ہوتا ہے۔ خصوصاً بین الاقوامی حالات میں۔

عباس: اس سے تو آپ بھی انکار نہیں کریں گے کہ امن کی اس عظیم جدوجہد میں آپ کی حیثیت ایک جنرل کی سی ہے۔

خروش چیف: مگر ایک جنرل اپنی عوام کی مدد کے بغیر ''جنرل'' نہیں رہ سکتا۔ وہ اسی وقت جنرل کہلانے کا حقدار ہے جبکہ اسے اپنی عوام کی ضروریات کا احساس ہو اور وہ ان کی خواہشات کو منزل مقصود تک لے جانے کی مکمل کوشش کرے۔

عباس: نہیں معلوم آپ مجھے کتنا وقت دے سکیں گے یہ آپ پر منحصر ہے اس لیے کہ آپ بے حد مصروف ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے، تین گھنٹہ کے اندر ہم اہم نکات پر بات چیت ختم کرلیں گے۔

خروش چیف: بات تو شروع کیجیے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ مثل مشہور ہے 'کام کا آغاز ہی نصف کام کی تکمیل کے برابر ہوتا ہے۔'

عباس: سب سے پہلے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ امن کے استحکام اور نئی جنگ کی روک تھام کے بارے میں، آپ دنیا کے عوام کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟

خروش چیف: آپ نے ایک اہم ترین اور انتہائی غور طلب مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے ویسے

میں اس مسئلہ پر کئی بار بول چکا ہوں۔ ماضی میں بھی اور کچھ عرصہ پہلے بھی۔
اس وقت دنیا میں سوشلزم کی طاقتیں بڑھ رہی ہیں۔ ہمارے مخالفین بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس وقت دنیا جو دو حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک اہم تاریخی موڑ پر کھڑی ہے۔ سوشلسٹ طاقتوں نے خود کو مستحکم کر کے اپنے آپ کو ناقابل تسخیر بنالیا ہے۔ ان صورتِ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اپنے بلند نصب العین یعنی 'امن' کے استحکام، انسانیت کی بقاء اور دنیا کو نئی جنگ کے تباہ کن اثرات سے بچانے کے لیے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ہم اپنی خارجی پالیسی کے ذریعہ ہمیشہ یہ کوشش کریں گے کہ پرامن طریقوں سے جو امیدیں سوشلزم سے وابستہ ہیں وہ پوری ہوں تا کہ دنیا میں امن قائم رہ سکے۔
کیا ہم نئی جنگ کی تباہ کاریوں سے انسانیت کو بچا سکتے ہیں؟ یہ بہت کچھ حالات پر منحصر ہے لیکن اس کے بارے میں عوام کو ایک فیصلہ کن رول ادا کرنا ہوگا — دنیا کے ایماندار لوگوں کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا چاہیے بلکہ مزید سرگرمی کے ساتھ لڑائی جھگڑوں کے پرامن تصفیہ کا مطالبہ کرنا چاہیے اور ساتھ ہی اس بات پر زور دینا چاہیے کہ اس کرۂ ارض سے ہتھیار بندی کا مکمل خاتمہ ہو اور کہیں بھی کسی نئی جنگ کا آغاز نہ ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے تمام ملکوں کے سیاست دانوں کو کام کرنا چاہیے تا کہ وہ اپنے ملک کے عوام اور ساری انسانیت کے مفاد کی خاطر خدمتِ خلق کر سکیں۔
سوویت حکومت اور ہمارے عوام ہمیشہ امن کے استحکام کی خاطر اور بین الاقوامی تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لیے جدوجہد کرتے رہیں گے تا کہ اس دھرتی سے جنگ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔

عباس: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ چند ملکوں میں موجودہ سرمایہ داری نظام نے سوشلزم کے چند پہلوؤں کو اپنے اندر سمو کر اپنے روایتی ڈھانچہ کو بدل لیا ہے؟ مثال کے طور پر چند ملکوں میں پبلک سیکٹر کا وجود میں آنا اور ویلفیئر ریاست کا تصور اس بات کا ضامن

نہیں کہ سرمایہ داری کے روایتی خدوخال میں تبدیلی آ چکی ہے؟

خروش چیف: اس کا اندازہ کارل مارکس نے بھی کر لیا تھا۔ جب سوشلزم کے مخالفین اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ مارکسزم میں وقت کی آہٹ سنائی نہیں دیتی یا مارکسزم مر چکا ہے تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ یہ لوگ مارکسزم سے ڈرتے ہیں اور مارکس کی تعلیم کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔ آج ہم ایک ایسے عمل کو دیکھ رہے ہیں جہاں سرمایہ ایک مرکز پر اکٹھا ہو رہا ہے۔ مارکس نے بتایا کہ جب سرمایہ داری اپنی ترقی کے لیے سب سے اونچے زینہ پر پہنچ جاتی ہے تو ایسے حالات پیدا کرتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام سوشلسٹ نظام کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ لوگ سرمایہ دارانہ نظام کو ایک میٹھی گولی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نظام نے سوشلزم کے چند پہلوؤں کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ اس کے برعکس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے طرف دار سرمایہ داری کے گھناؤنے اور ڈراؤنے چہرہ کو قابل قبول بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں تا کہ وہ عوام کو دھوکہ دے سکیں۔ سرمایہ دار ہمیشہ لالچی رہے گا۔ اس کی یہ خاصیت کبھی نہیں بدل سکتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پیداوار کے ذرائع چند اشخاص کی ملکیت ہوتے ہیں اور محنت کش عوام کی بکاؤ محنت کو لوٹ کھسوٹ کا شکار بنایا جاتا ہے۔ مارکس نے سرمایہ داری کے اندرونی تضاد کا جو ذکر کیا ہے وہ آج بھی صحیح ہے۔

عباس: اگر میں اپنے سوال کی وضاحت کر دوں تو بہتر ہوگا — بہت سے ملکوں میں انڈسٹری کی مختلف شاخیں کسی کی شخصی جائیداد نہیں ہوتیں بلکہ ریاست ہی ان اداروں کی مالک ہوتی ہے۔ کیا یہ صورت سرمایہ داری پر پردہ ڈالنے کے لیے بنائی گئی ہے یا ہم اسے کوئی اور شکل یا نام دیں گے۔؟

خروش چیف: ہمیں یوں سوچنا چاہیے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں طاقت کس کے ہاتھ میں ہے۔ لوٹ کھسوٹ کرنے والے طبقہ کے نمائندوں کے ہاتھ میں — ؟ یا اجارہ داروں کے پاس؟ یا ان کے حقوق کی وکالت کرنے والوں کے ہاتھ میں ہے۔؟

امریکہ کی مثال لیجیے — جہاں یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔ امریکی وزیروں پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا آیا یہ لوگ ڈیوپونٹ راک فیلر اور ہیری مین خاندانوں کے نمائندے ہیں۔ ہیری مین کو لیجیے وہ بذات خود ایک بڑا سرمایہ دار ہونے کے علاوہ امریکی شعبۂ تجارت کا سیکریٹری بھی تھا۔ امریکی وزارت دفاع کے سابق سیکریٹری میک ایل رائے MAC ELROY کا بیان ملاحظہ فرمائیں۔ وہ دو سال تک سیکریٹری رہا اور پھر اس نے استعفیٰ دیا۔ استعفیٰ دینے کی وجہ کیا تھی۔ میک ایل رائے نے کہا:

''جب میں سوپ فیکٹری کا ڈائریکٹر تھا تو مجھے 250000 ڈالر سالانہ ملتے تھے اور جب سے میں وزیر بنا ہوں مجھے صرف 25000 ڈالر ملتے ہیں۔ اگر میں سوپ فیکٹری سے رشتہ توڑتا ہوں تو مجھے نقصان ہوتا ہے'' — انہی لوگوں نے اسے اپنا نمائندہ بنا کر حکومت میں جگہ دلوائی اور جب اس کی میعاد ختم ہو گئی تو وہ سوپ فیکٹری میں واپس آ گیا اور اس کی جگہ دوسرا نمائندہ بھیجا گیا اور اسی طرح نمائندے تو بدلتے ہی رہتے ہیں لیکن ان نمائندوں کی پشت پر کوئی سوپ فیکٹری ہوتی ہے یا چمڑے کی فیکٹری یا کوئی اور سرمایہ داری۔ بنیادی طور پر صورت حال پر کوئی فرق نہیں پڑتا —

یا ڈلز کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا سیکریٹری آف اسٹیٹ بننے سے پہلے وہ راک فیلر کے ہاں ملازم تھا اور وکالت کرتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ڈلز کو وزیر خارجہ بنا دیا گیا۔ ڈلز نے ایک راک فیلر کو ہی اپنا مشیر خاص بنایا۔ اب آپ ہی بتایئے کون کس کا حکم بجا لاتا رہا۔ مالک کون تھا اور نوکر کون؟ کیا راک فیلر ڈلز کا ملازم تھا یا ڈلز راک فیلر کا؟ صاف ظاہر ہے کہ ڈلز ہی راک فیلر کے احکام کی تعمیل کرتا رہا۔ وزیر خارجہ بننے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی ڈلز نے ہر طریقہ سے راک فیلر کے مفاد کی نگہداشت کی۔ وزیر خارجہ بن کر اس نے صرف راک فیلر کے مفاد کا تحفظ نہیں کیا بلکہ تمام سرمایہ داری کے مفاد کی نگہبانی کرتا رہا۔

عباس: امریکہ سرمایہ داروں کے بارے میں آپ کا تجربہ بالکل درست ہے کیونکہ اس وقت امریکی سرمایہ دارانہ نظام سرمایہ داری کے عروج کی پوری پوری نمائندگی کرتا ہے۔ بجنسہٖ سوویت یونین میں سوشلزم اپنے پورے شباب پر ہے۔ مگر کیا آپ تسلیم نہیں کرتے کہ بعض ملکوں میں سرمایہ داری نے ان دو نظاموں کی درمیانی صورت کو اختیار کیا ہے۔؟

خروشچیف: ہندوستان کی مثال لے کر دیکھتے ہیں۔ آپ کے ہاں ایک بہت بڑا سرمایہ دار 'ٹاٹا' ہے۔ میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ ایک ہندوستانی وزیر ٹاٹا کی فرم میں ملازم تھا۔

عباس: جی ہاں۔ ایک ایسا وزیر تھا۔ اب نہیں ہے۔

خروشچیف: ہندوستان نے حال ہی میں قومی آزادی حاصل کی ہے اور بیرونی حاکموں سے چھٹکارا پایا ہے۔ گو ہندوستان میں اس قسم کے سماجی رشتے نہیں ہیں جیسا کہ ہم امریکہ میں دیکھتے ہیں لیکن بنیادی طور پر دونوں میں کوئی فرق نہیں، سرمایہ دار چھوٹا ہو یا بڑا۔ اس کی 'بھوک' میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اگر وہ چھوٹا سرمایہ دار ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بڑا سرمایہ دار نہیں بننا چاہتا۔ وہ اس لیے بڑا سرمایہ دار نہ بن سکا کیونکہ دولت مند بننے کے لیے اسے ابھی اتنا وقت نہ ملا۔

اگر آپ امریکہ کے وزیروں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے سب سے بڑے مالک 'سرمایئے' کی خدمت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک ہتھیار بنانے والی کمپنی اپنا نمائندہ پارلیمنٹ میں بھیجتی ہے۔ وہ نمائندہ کس کی نمائندگی کرے گا؟— وہ ہمیشہ اپنی کمپنی کے مفاد کی حفاظت کرے گا۔ وہ عارضی طور پر حکومت کی مشینری کا ایک حصہ ہے اور اسے کمپنی کے مقابلہ میں بہت کم تنخواہ ملتی ہے۔ بورژوا حکومت کی یہ ایک خاص علامت ہے۔ دراصل یہ سرمایہ داری کا ایک بورڈ ہے جو تمام سرمایہ داروں کے مفادات کی پاسبانی کرتا ہے۔ حکومت میں اجارہ داری کے یہ نمائندے ہمیشہ عوام کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم تمھارے حقوق کی حفاظت کرتے

ہیں لیکن اس قسم کی باتیں عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے سوا اور کچھ مطلب نہیں رکھتیں۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ دار ملکوں میں کچھ وزیر اس قسم کے ہوتے ہیں جو مزدوروں کی صفوں میں سے آتے ہیں۔ لیکن کون کہاں سے آتا ہے، اسے خاص اہمیت حاصل نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کوئی نمائندہ یا لیڈر کس کے احکام بجالاتا ہے۔ کس گروہ کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے اور کس طبقہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ امریکہ کے بہت سے سرمایہ دار عوام کی صفوں سے آئے ہیں اور سرمایہ دار بننے سے پہلے کتنے معمولی لوگ تھے۔ اس حقیقت کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان لوگوں کی کامیابی دوسرے لوگوں کی محنت پر انحصار رکھتی ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ لوگ عوام کی صفوں میں سے آئے ہیں لیکن ان کی صورت تو ملاحظہ فرمایئے اس شخص نے کیسے دولت کمائی اور ابھی تک کیسے کمارہا ہے اور اپنے سرمایہ سے مسلسل کمیشن حاصل کر رہا ہے۔ گورکی نے بڑی چابک دستی سے اپنے دوناولوں میں ''FOMAGORDEYEV'' اور ''THE ARTAMONOVS BUSINESS'' میں اس کش مکش کی تصویر کھینچی ہے۔ ان دوناولوں کے بعض سرمایہ دار عوام کی صفوں میں سے آئے لیکن ان کی حیثیت کسی طرح نہیں۔

عباس: بہت سے ممتاز ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں میں طبقاتی جدوجہد کی رفتار کافی سست پڑ گئی ہے۔ کیونکہ برسراقتدار حکومتوں نے مزدوروں کو بہت سی مراعات دی ہیں۔ جیسے کہ تنخواہ کا بڑھانا، معیار زندگی کو بہتر کرنا اور بے روزگاری کا معاوضہ دینا وغیرہ۔ ان ملکوں میں سرمایہ داری سے سوشلزم کی طرف بتدریج تبدیلی کس طرح ہوگی۔؟ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

خروشچیف: یہ آپ نے درست کہا کہ سرمایہ دار ملکوں کی حکومتیں اکثر مزدوروں کو چند لقمے دے کر خرید لیتی ہیں۔ مگر حال ہی میں امریکہ کے لوہے کے کارخانوں کے مزدوروں نے ''118'' دن کی شاندار ہڑتال کی۔ کیا یہ طبقاتی جدوجہد کا اظہار نہیں کرتی؟۔

گو یہ جد و جہد خالص امریکی ٹیکنیک سے چلائی گئی ہے۔ زار روس کے وقت بھی مزدوروں کی لمبی لمبی ہڑتالیں ہوتی تھیں۔ اس وقت ہڑتالیوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ امریکہ میں مزدوروں کے پاس کافی سرمایہ ہوتا ہے اور وہ ہڑتالیوں کی اچھی خاصی مدد کر سکتے ہیں۔ طبقاتی جد و جہد کی کتنی اور مثالیں امریکہ اور دوسرے ملکوں سے دی جا سکتی ہیں۔ لیکن دنیا کے مزدوروں کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اپنی جد و جہد سے اس قسم کے ماحول اور حالات پیدا کریں جہاں محنت کش طبقہ سب سے زیادہ منظم اور باشعور ہو جائے اور اسے اس بات کا احساس ہو کہ وہ ضروریات زندگی کا واحد خالق ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ ریاست میں بااثر حیثیت حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے لیکن یہ با اثر حیثیت مختلف ملکوں میں، خاص حالات کے پیش نظر مختلف طریقوں سے حاصل ہوگی۔

اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بعض ملکوں میں محنت کش طبقہ پارلیمنٹ کے ذریعہ بھی طاقت حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن یہ بات محنت کش طبقہ اور عوام کے لیے بہت ضروری ہے کہ طرفین کو طبقاتی کش مکش کی جان کاری کا بھرپور احساس ہونا چاہیے اور انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جب وہ ووٹ کے ذریعہ برسر اقتدار آئیں گے تو شکست خوردہ اقلیت طاقت کے ذریعہ اپنی پوزیشن کو حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش کریں گے۔ اس لیے ہمیں یہ بات ذہن نشیں کر لینی چاہیے کہ ووٹ کی لڑائی طبقاتی جد و جہد کا اظہار ہے۔ جوں جوں پرولتاری طبقہ کا شعور بڑھتا جائے گا۔ اسی طرح بورژوا طبقہ، پرولتاری طبقہ کو رشوت دے کر ورغلانے میں ناکام رہے گا اور ساتھ ہی اپنی کھوکھلی خطابت اور دو پارٹیوں کو وجود میں لا کر عوام کو بہکانے لگے گا۔

اس وقت حالات یہ ہیں کہ امریکی عوام اپنے ووٹوں کے ذریعہ کسی کروڑ پتی کو منتخب کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ راک فیلر یا ہری مین۔ جب میں راک فیلر سے ملا تو میں نے اسے بتایا کہ اس قسم کا الیکشن صرف امریکہ میں ہی ہو سکتا ہے۔" آج

امریکی محنت کش عوام کی یہ حالت ہے اور ہمیں ان حالات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ امریکہ کے یہ خاص حالات اس ملک کے تاریخی ارتقاء کا اظہار کرتے ہیں لیکن تاریخی ارتقا کے عام اصول بدلے نہیں جا سکتے۔

عباس: اسی لیے میں نے آپ سے پوچھا کہ ایسے ملکوں میں سوشلزم کی کس طرح جیت ہو سکتی ہے؟

خروش چیف: مزدور ضرور پیدا ہوں گے۔ آخر میں سرمایہ داری خود ہی انھیں بیدار کرے گی۔ آج کل امریکی سرمایہ دار اپنے منافع کا کچھ حصہ جو انھوں نے دوسرے ملکوں سے حاصل کیا ہے مزدوروں کو دے کر انھیں خرید لیتے ہیں۔ یہ بات دوسرے ملکوں میں اور بھی صاف اور واضح ہے۔ برطانوی محنت کش طبقہ کا معیار زندگی اسی لیے بلند ہے کیونکہ ہندوستانی مزدوروں کا معیار زندگی گرا ہوا ہے۔ گودن بدن برطانیہ کو اس قسم کے مواقع کم مل رہے ہیں کہ وہ ہندوستان اور دیگر نو آبادیوں کے بل بوتے پر اپنے معیار زندگی کو بہتر بنا تا رہا۔ برطانیہ کے سرمایہ دار اس وقت کو محسوس کر رہے ہیں جب عنقریب ہی انھیں ایک ایسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا جب وہ محنت کش طبقہ کی بڑھتی ہوئی مانگوں کو دوسرے ملکوں کی لوٹ کھسوٹ کے ذریعہ پورا نہ کر سکیں گے۔ چین، ہندوستان، افریقہ اور دیگر ملکوں کی صنعتی ترقی، ان کی لوٹ کھسوٹ کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ بن جائے گی۔

امریکہ، برطانیہ اور دیگر ملکوں کے سرمایہ داروں کو بھی کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا کہ وہ ان حالات کے زیر اثر کس طرح محنت کش طبقہ کو خرید سکیں گے۔ جوں جوں محنت کش عوام کا شعور بڑھتا جائے گا اسی طرح سرمایہ داروں کی مشکلات میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔

عباس: آپ نے میرے سوال کے جواب میں کہا تھا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مارکسزم پرانا اور بوسیدہ ہو گیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کی تعلیم کبھی مر نہیں سکتی پھر بھی میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کوئی تھیوری یا سائنس اس دنیا میں حرف آخر

ہوسکتی ہے یا خاص حالات اور خاص وقت کے لیے سودمند ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ نئے سائنسی تصورات اور نئی دریافتیں اور نئے سائنسی آلات، ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مارکسزم۔ سماجی سائنس کی آخری شکل ہے یا اس میں کوئی اور ترمیم، اضافہ یا تبدیلی نہیں کی جاسکتی؟

خروش چیف: اس بات سے ہر شخص آگاہ ہے کہ کارل مارکس ان تمام جزئیات اور تفصیلات کا احاطہ نہیں کر سکے۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سوشلسٹ سماج کے بعد کیمونسٹ سماج کی تعمیر کس طرح کی جاسکتی ہے۔ مگر مارکس نے سماج کی ترقی کی راہ کی طرف پوری طرح ہماری راہنمائی کی ہے۔ مارکس اور لینن نے صرف یہی ثابت نہیں کیا کہ سرمایہ داری کے بعد سوشلسٹ نظام آئے گا بلکہ طبقاتی نظام کے بعد ایک ایسا سماج قائم ہوگا جہاں مختلف طبقے نہیں ہوں گے۔ جہاں عوام آزاد اور مساوی حقوق رکھیں گے اور اس کے بعد یہ بتایا کہ کس طرح اس عظیم منزل تک پہنچنے کے لیے محنت کش طبقہ برسراقتدار آئے گا اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے گا۔

یہ مارکسزم کی سب سے بڑی سچائی ہے جو روز روشن کی طرح عیاں ہے اور تاریخ ہر لمحہ اس کی گواہ ہے۔

مارکسزم کی تعلیم اپنی جگہ پر مسلم ہے اور یہ ایک سائنسی تعلیم ہے۔ مارکسزم زندگی کی طرح متحرک ہے۔ مارکس اور لینن کسانوں کے مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں تمام متعلق امور کو پیش نہیں کر سکے کیونکہ ان کا عہد اس قسم کی تفصیلات بہم پہنچانے کے ناقابل تھا۔

لیکن لینن کے زمانے میں۔ کسانوں کے مسئلہ کے متعلق سائنٹیفک چھان بین ہوچکی تھی اور لینن نے بتایا کہ کسان سوشلزم کی ترقی میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں اگر وہ مشترک کھیتی باڑی کی طرف متوجہ ہوں، لینن نے سب سے ضروری اور اہم بات کو ثابت کیا کہ کسانوں کو سوشلزم کی تعمیر میں حصہ لینا، مختلف ملکوں میں مختلف حالات پر منحصر ہے۔

میں نے صرف ایک مثال دی ہے زندگی کے دوسرے شعبوں سے اور مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مارکسزم ایک زندہ اور متحرک سائنسی تعلیم ہے جو عوام کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے اور سوشلزم کی تعلیم تعمیر اور امن کی بقاء کے لیے راستہ ہموار کرتی ہے۔

عباس: کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ پرامن بقائے باہمی کی پالیسی اس امر کی اجازت دیتی ہے کہ سوشلسٹ اور سرمایہ دار ملکوں میں معاشی تعاون کیا جائے یا آپ اس فلسفے کو ایک منفی صورت کے مترادف سمجھتے ہیں جیسے کہ جنگ کا نہ ہونا یا آپ یوں سوچتے ہیں کہ معاشی تعاون ممکن ہے جیسا کہ ایٹمی طاقت کا استعمال یا پسماندہ ملکوں کی مدد کا پروگرام۔ کیا سوویت یونین اس امر کو مدنظر رکھ کر کوئی مکمل اور جامع پلان پیش کرنا چاہتی ہے—؟

خروش چیف: اگر صحیح طور پر ان باتوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پُرامن بقائے باہمی کی پالیسی کا صرف یہ مطلب نہیں کہ مختلف ملکوں کے درمیان جنگ نہ ہو بلکہ مختلف سماجی نظاموں میں آپریشن بڑھ سکے۔ باہمی امداد کا دائرہ وسیع ہوسکتا ہے۔ ہم تجارت پر کوئی قید لگانا نہیں چاہتے۔ دراصل تجارت کیا ہے؟ اقتصادی کوآپریشن کی ایک شکل ہے۔ ہم سائنسی علوم کے تبادلے کی حمایت کرتے ہیں اور ثقافتی تبادلے کے خواہاں ہیں۔ ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ پُرامن بقائے باہمی اور کوآپریشن کے لیے ہمارے دروازے ہمیشہ کے لیے کھلے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جنگ تمام دنیا کے لیے ایک بہت بڑا المیہ ثابت ہوگی اور ہر قوم کو اس بات کا خود فیصلہ کرنا ہے کہ وہ کس طرح رہے کس نظام زندگی کو اپنائے اور کن خیالات کی ترجمانی کرے اور اس لیے پُرامن بقائے باہمی کے فلسفۂ حیات کو ماننے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم سوشلزم کے اصولوں کو یا اپنے نظریۂ حیات کو تیاگ دیں۔

باہمی وجودیت کے یہ معنی نہیں کہ سوشلسٹ اور سرمایہ دار ملکوں کے درمیان اختلاف ختم ہوگئے۔

ہم اس بات کے قائل ہیں کہ نظریات میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم نظریاتی

سمجھوتہ بازی کے چکر میں پڑیں گے تو ہمیں اپنے نظریاتی اصولوں کو ترک کرنا پڑے گا اور اسی طرح ہم اپنے مخالفین سے مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے نظریاتی اصولوں کو تج دیں۔ ایسا وہ نہیں کریں گے۔ حالانکہ زندگی نے کافی حد تک یہ ثابت کر دیا ہے کہ سرمایہ داری آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے اور عہد پارینہ کی طرف کھسکتی جا رہی ہے اور ہم بھی اپنے آدرش اور اصولوں کو خیر باد نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ سوشلزم اور کمیونزم ہمارے لیے ایک ہی ہیں بلکہ دنیا کے لیے ایک درخشاں مستقبل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ باہمی پُر امن وجودیت کے ہوتے ہوئے بھی مختلف نظریات میں اختلاف کی گنجائش رہے گی۔ نظریاتی جھگڑوں سے عوام کو خود نپٹنا چاہیے لیکن اس کا فیصلہ جنگ کے ذریعہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ ثابت کرے کہ کون سا نظام زندگی بہترین ہے۔ وہی نظام عوام کے لیے بہترین ثابت ہو سکتا ہے جو انھیں حقیقی آزادی دیتا ہے جو انھیں مزید روحانی اور مادّی مسرتوں سے مالا مال کرتا ہے۔

ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ پرامن مقابلے میں ہمارا نظام سرمایہ داری نظام سے بہت آگے نکل گیا ہے یا نکل جائے گا۔

عباس: جب آپ مادی فائدوں کا ذکر کرتے ہیں تو کیا آپ کی نگاہ محدود ہو کر نہیں رہ جاتی؟

خروشچیف: جی نہیں۔ میں نے روحانی اور مادی دونوں کا ذکر کیا ہے۔

عباس: میں نے اس بات کا اس لیے ذکر کیا تھا کہ بعض ممتاز ترقی یافتہ ملکوں میں جیسا کہ امریکہ میں عوام کو مادی سہولتیں میسر ہیں لیکن عوام کی روحانی زندگی بے رنگ و بو ہے۔

خروشچیف: مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ انسان کی روحانی مسرتیں مادی ضروریات سے کسی طرح کم نہیں۔

عباس: بحیثیت ایک کلچرل کارکن کے میں آپ کے ان خیالات کی بیحد قدر کرتا ہوں۔

خروشچیف: مثل مشہور ہے کہ انسان صرف روٹی پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسے روحانی غذا بھی چاہیے۔ یہی تفریق اسے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے جو صرف غذا اور پانی پر زندہ

رہتے ہیں۔ ہم چونکہ انسان ہیں اس لیے ہمارے لیے کوئی انسانی قدر اجنبی نہیں ہوسکتی۔ جوں جوں سوشلزم کے زیر اثر عوام کا معیار زندگی ترقی کرتا جائے گا اسی طرح کی روحانی صورتوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

عباس: میں یہ سوال نہیں کر رہا ہوں بلکہ اپنی رائے کا اظہار کر رہا ہوں۔ میں نے تقریباً دنیا کے ہر ملک کا سفر کیا ہے۔ میں نے امریکہ، برطانیہ، فرانس اور سکنڈے نیویا کے ملکوں کو دیکھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح سوویت یونین کلچر کے دروازے عوام پر کھلے ہیں۔ اس کی مثال کسی دوسرے ملک میں نہیں مل سکتی۔ سوویت یونین کے علاوہ میں نے کسی اور ملک میں ادب اور آرٹ کے لیے اس قدر وابستگی کا اظہار نہیں دیکھا۔ ادب، آرٹ اور تہذیب کے خزانے اس طرح عوام کے لیے کھلے ہوئے ہیں جس کی نظیر روس کے علاوہ بہت کم ملکوں میں ملتی ہے۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ ہے اور میری نجی رائے ہے جس کا میں اظہار کرنا چاہتا تھا۔

خروش چیف: اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں، جوں جوں عوام کا معیار تعلیم ترقی کرے گا اسی طرح ان میں اپنے آپ کو پہچاننے کا درک بڑھے گا اور وہ اکتوبر انقلاب کے فائدوں کی زیادہ قدر و قیمت کر سکیں گے۔ اسی لیے صنعتی ترقی اور عوام کی تعلیم کے مسائل ہمارے لیے اور ہماری پارٹی کے لیے جداگانہ حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اس کرۂ ارض پر انسانی زندگی سب سے قیمتی چیز ہے۔ سرمایہ دار آدمی کو محض ایک مزدور اور ایک زرخرید جنس کی حیثیت سے جانتا ہے اور استعمال کرتا ہے۔ وہ آدمی کو انسان بننے کا حق نہیں دیتا۔ وہ مزدوروں کی تھوڑی بہت دیکھ بھال اس لیے کرتے ہیں کہ اس کی مشین چلتی رہے۔ اس لیے جب کوئی سرمایہ دار مزدوروں کی جگہ ایک خود بخود چلنے والی مشین لگاتا ہے تو مزدوروں کو ہمیشہ کے لیے چھٹی دے دیتا ہے۔ اس وقت وہ صرف اپنے منافع کے سوا اور کچھ نہیں سوچتا۔ اگر وہ تھوڑی بہت تربیت مزدوروں کو دیتے ہیں۔ وہ محض اس لیے کہ ان ترقی یافتہ مزدوروں سے زیادہ کام لے سکیں

تا کہ پیداوار میں اضافہ ہو۔ سوویت حکومت اور سوویت سماج یہ چاہتی ہے کہ عوام مجموعی طور پر ترقی کر سکیں صرف کمانے کے قابل ہی نہ ہوں بلکہ تہذیبی اور تمدنی طور پر ایک بہتر اور باوقار شہری بننے کا ثبوت دیں۔ انسان کی ترقی، اس کی ضرورتوں کا احساس اور اس کی نگہداشت ہمارا اور بھی فرض ہے۔ اس لیے جب ہم آٹو میٹک مشین کا استعمال کرتے ہیں تو ہمارے مزدور بیکار نہیں ہوتے بلکہ ان کی تنخواہوں میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا ہے اگر انھیں پرانی مشینوں پر کام نہیں ملتا تو انھیں کسی اور نئی مشین پر کام دیا جاتا ہے۔ اگر سرمایہ دار ملکوں میں انسان مشین کے لیے ہے تو سوشلسٹ نظام میں مشین انسان کے لیے ہے تا کہ وہ انسان کے بوجھ کو ہلکا کر سکے۔

یہ انسانی طرز فکر جو سوشلسٹ نظام کا محور ہے، اس نظام کی انسانیت کو نمایاں کرتا ہے اسی لیے یہ طرز عمل، سوشلزم اور کمیونزم کو باقی ترقی پسند نظاموں سے ممتاز اور افضل بناتا ہے۔

عباس: اس سلسلے میں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح صنعتی ترقی بڑھے گی اور کمیونزم قریب آئے گا کیا اسی طرح انسانی پریوار یا خاندان انسانی سماج کو متحد کرنے کے لیے بطور ایک طاقت کے زندہ رہے گا یا آہستہ آہستہ اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔

خروش چیف: آپ کی رائے میں آج کے حالات میں خاندان کا کیا رول ہے؟

عباس: میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خاندان انسانی سماج میں ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک ایسی اکائی جو اپنے مفادات، اپنی ہمدردیوں اور ذاتی لگاؤ کے ذریعہ متحد ہے۔ میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ برطانیہ کی مثال لیجیے جہاں صنعتی ترقی نے ملک کے ایک بڑے حصہ کی خانگی زندگی کے شیرازہ کو اتھل پتھل کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا صنعتی ترقی سے خانگی انتشار کا خدشہ بڑھتا ہے۔ یا سرمایہ دارانہ نظام میں یہ خدشہ محض ہے یا کسی اور وجہ سے اس قسم کی علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

خروشچیف: سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلسٹ نظام میں خاندان کی حیثیت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں منافع کا لالچ خانگی اعتماد کو ختم کرتا ہے۔ خاندان کا ہر فرد ایک دوسرے کے مفادات کو نظر انداز کر کے دولت مند بننے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس قسم کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، جہاں بہنوں اور بھائیوں نے جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کا گلا گھونٹ دیا۔ سوشلسٹ سماج اور کمیونسٹ سماج میں پیداوار کے ذرائع شخصی نہیں ہوتے، دیش کا سرمایہ اور محنت کش طبقہ کی تخلیق کردہ قدریں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔

ان حالات میں صرف خاندان ایک سماجی اکائی بن کر ہمارے سامنے نہیں آتا بلکہ تمام پریوار یعنی پورا سماج ایک بہت بڑے خاندان کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے اور سب لوگ ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر ہم پریوار کو محض ایک اقتصادی اکائی تصور کرتے ہیں، جیسا کہ اکثر قرون وسطیٰ میں سمجھا جاتا تھا تو اس طریقے سے اس کی اہمیت واقعی کم ہو رہی ہے۔ یوکرین کی ایک مصنف کوبل کایا KOBYLYAN KAYA نے اپنی کتاب میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح ایک بھائی نے اپنے بھائی کی زمین حاصل کرنے کے لیے قتل کر دیا اور یہ واقعہ حقیقت پر مبنی تھا اور مصنفہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

اب آپ نے سرمایہ دارانہ نظام میں پریوار کی حقیقی صورت کا ملاحظہ کر لیا آپ کو اس قسم کی کئی اور مثالیں دنیا کے ادب میں ملیں گی۔ اب آپ ہی بتایئے۔ ان واقعات کے بعد پریوار کی کیا وقعت ہے، یا رہ جاتی ہے۔ جہاں محض زمین کے بٹوارہ کے لیے بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ یہ بات صرف ہمارے دور ہی میں ممکن ہو سکتی ہے۔ جہاں سوشلزم اور کمیونزم کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں۔ جہاں باہمی امداد کا احساس صرف بہن اور بھائیوں کے درمیان نہیں ابھرتا بلکہ تمام لوگوں میں یہ خیال اجاگر ہوتا ہے۔ چاہے وہ ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں یا نہیں ہوں، ایک ماں باپ کے بیٹے ہوں یا نہ ہوں، جوں جوں کمیونزم قریب تر

آتا جائے گا۔ اس قسم کے انسانی تعلقات میں زیادہ گہرائی اور خلوص بڑھتا جائے گا۔

عباس: آپ نے کمیونزم کے زیرِ اثر جو زندگی کی شکل ہوگی، اس کا ذکر کیا ہے۔ آپ سوویت یونین میں کمیونزم کی تعمیر کر رہے ہیں۔ آپ کی رائے میں انسانی سماج کے ارتقاء کی آخری منزل کیا ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں آپ کے ذہن میں کمیونسٹ سماج کا کیا تصور ہے۔ میں آپ کی رائے جاننے کا متمنی ہوں۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں، میں کہہ سکتا ہوں کہ کمیونسٹ سماج موجودہ نظامِ زندگی سے بالکل مختلف ہوگا اور ترقی کی راہ پر اسے ایک اعلیٰ مقام حاصل ہوگا۔

خروش چیف: اس بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ مارکس نے اس نصب العین کے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتایا ہے اور راستہ بھی دکھایا ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کا یہ مطلب ہوگا کہ تمام لوگوں کی بڑھتی ہوئی مادی ضروریات اور روحانی مانگوں کو پورا کیا جائے تا کہ لوگوں کے لیے کام ایک روحانی ضرورت بن جائے اور کام کر کے انھیں دلی مسرت حاصل ہو اور ان کی روحانی اور جسمانی طاقتیں زوال پذیر نہ ہوں۔ انھیں اپنی قابلیت کے مطابق کام ملے اور ان کی ضرورت کے مطابق معاوضہ ملے۔ کمیونزم کے تحت 'محنت' جسمانی اذیت کا باعث نہ ہوگی۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ جسمانی اور روحانی طور پر صحت مند رہنے کے لیے ہر انسان کے لیے لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ کام کرے اور اس کے بعد آرام کے لمحات بھی میسر ہوں تا کہ وہ ایک نارمل انسان کی طرح زندگی بسر کر سکے۔

کمیونسٹ سماج میں انسان کی تمام ضروریات، چاہے وہ مادّی ہوں یا روحانی پوری کی جائیں گی۔ اس سماج میں لوگ جسمانی اور روحانی طور پر بڑے خوشگوار طریقہ سے ترقی کر سکیں گے۔

کیا دنیا اس منزل تک پہنچ سکے گی؟۔ جہاں تک سوویت سماج کا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ دن دور نہیں۔ اگر ہم اس سات سالہ پلان میں صرف چھ اور سات گھنٹے یومیہ کام کرنے کا وقت مقرر کر سکتے ہیں تو اس کے بعد یہ ممکن ہو جائے گا کہ

آئندہ چند سالوں میں ہم پانچ گھنٹے یا چار گھنٹے فی دن کام کے اوقات مقرر کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اس طرح انسان کو کام کرنے کے بعد اتنا وقت ملے گا کہ وہ سماج کے کاموں سے فارغ ہو کر اپنا باقی وقت اپنے آپ کو بہتر کرنے میں لگا سکے۔ اپنے علم اور منتخبہ پیشہ میں ایک خاطر خواہ مہارت حاصل کر سکے۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ کیمونسٹ سماج میں 'عوام' اپنے فرصت کے وقت کو بہتر کاموں میں صرف کریں گے۔ جو اسے میسر آئے گا! مثلاً وہ آرٹ اور ادب کی طرف زیادہ متوجہ ہو گا۔ عوام کی تمام مادی اور روحانی ضروریات اس سماج میں پوری ہو سکیں گی۔ لہٰذا ایک ایسا سماج ہو گا جہاں جنگ، بے کاری، بھوک اور دیگر تباہیوں کا نام ونشان نہ ہو گا۔ یہ ایک بڑی منظم پرامن، صحت مند مضبوط اور حسین سماج ہو گا۔

عباس: آپ نے ابھی کہا کہ جہاں تک سوویت یونین کا تعلق ہے وہ تبدیلی تھوڑے عرصہ میں آ جائے گی۔ کیا آپ بتا سکیں گے کہ اس تبدیلی میں کتنا عرصہ لگے گا—؟

خروشچیف: ہم اس مسئلے پر کام کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں 80-1975 کے قریب تک منزل مقصود پر پہونچ جائیں گے۔ ہمارے مادی ذرائع اتنے ہو جائیں گے کہ عوام کا معیار زندگی کافی بلند ہو جائے گا۔ بشرطیکہ اس دھرتی پُرامن رہے۔ اگر ہمارا مغربی طاقتوں کے ساتھ تخفیف اسلحہ کے مسئلے پر کوئی خاطر خواہ سمجھوتہ ہو جائے تو حالات یقیناً بڑی جلدی بدل سکتے ہیں کیونکہ اس سمجھوتہ کی وجہ سے ہمارے پاس اتنا سرمایہ بچ جائے گا جس سے عوام کے معیار زندگی کو اور بہتر بنا سکیں گے اور اس طرح ہمارا موشلسٹ سماج، کیمونزم کی خاطر جلد ہی بڑھ جائے گا۔

اگر تخفیفِ اسلحہ پر کوئی خاطر خواہ فیصلہ نہ ہوا اور اسلحہ سازی کی یہی رفتار رہی، جب بھی ہم 80-1975 کے قریب تک اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

عباس: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد ریاست کا وجود نہ رہے گا۔

خروشچیف: اس بارے میں جو کچھ مارکس نے کہا تھا۔ اسے ہم حرف بہ حرف درست سمجھتے ہیں۔ مگر ریاست کا وجود اسی وقت مٹ سکتا ہے جب ساری دنیا ایک بڑی کیمون میں

تبدیل ہو جائے۔ بہت کچھ اس بات پر منحصر ہے کہ کیا سرمایہ دار کا وجود اس وقت تک رہے گا۔ ریاست کے وجود کے خاتمہ سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟ ریاست کے وجود کے خاتمہ کا مطلب یہ ہے کہ ریاست سے جبر وتشدد کے اداروں کا خاتمہ۔ یعنی فوج پولیس اور کچہریوں کا وجود ختم ہو جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سوشلسٹ سماج میں حالات کو قائم رکھنے کے لیے ان اداروں کی ہمیشہ ضرورت نہیں رہے گی لیکن جب تک سرمایہ دار ملکوں کا وجود رہے گا اور یہ حکومتیں سوشلزم کو تباہ کرنے کی فکر میں یا سازش میں مصروف رہیں گی۔ ہمیں اپنے تحفظ کے لیے ریاست کے چند اداروں کو قائم رکھنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اتنے بڑے پیمانہ پر ان اداروں کو نہ رکھیں لیکن سرمایہ دار حکومتوں کے حملوں سے بچنے کے لیے ان اداروں کی ضرورت رہے گی۔ جہاں تک جبر وتشدد کے استعمال کا سوال ہے، یہ تو ہر ریاست کا اپنا اندرونی معاملہ ہے۔ اس وقت ہمارے سماج میں طبقاتی کش مکش نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے ہتھیار بند فوجوں اور مسلح دستوں میں کافی تخفیف کر دی ہے۔ ریاست کے بہت سے اہم کام جو اس سے پہلے حکومت کرتی تھی۔ اب پبلک کے ادارے اسے چلاتے ہیں مثلاً ٹریڈ یونین کو سومال اور اسی طرح کئی اور عوامی ادارے اور اس طرح کے کاموں کی رفتار تیز تر ہوتی جائے گی۔

عباس: کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ دس یا بیس برس گزرنے کے بعد لوگوں کو بہتر کام کرانے کے لیے روپیہ اور دیگر مادی آسائشوں کی ترغیب دینے کی ضرورت محسوس ہوگی۔

خروش چیف: میرے خیال میں روپے کا استعمال جب بھی رہے گا۔ اس لیے معاوضہ بانٹنے میں چند اصولوں کو مدنظر رکھنا پڑے گا۔ مثلاً معاوضہ کا انحصار کام کی مقدار اور اس کی اہمیت پر ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا سسٹم رائج رہے گا لیکن اعلیٰ اور گھٹیا معاوضہ میں زیادہ فرق نہ ہوگا۔ اگر روپے کا استعمال رہے گا تو اس کی قیمت بھی رہے گی لیکن اس کے متعلق کوئی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ دنیا بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور ہمارے سامنے نئے مسائل آ رہے ہیں۔ پندرہ برس کا عرصہ فی

زمانہ ایک بہت لمبا عرصہ ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اس عرصہ میں حیرت انگیز دریافتیں کر سکیں گی اور ایسے مواقع بہم پہنچائیں گی جس کا اندازہ کرنا اس وقت مشکل ہے۔

یہ تبدیلی پندرہ برس میں ہوگی یا نہیں؟ اس بات کی کوئی خاص اہمیت نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا سماج کس سمت بڑھ رہا ہے اور ہم ترقی کی رفتار کو تیز تر کرتے رہیں گے تاکہ سوشلسٹ سماج کی بنیادیں اور مستحکم ہو سکیں۔

مغربی ممالک میں کافی لوگوں کی تعداد ایسی ہے جو کمیونزم سے خوف کھاتے ہیں۔ ہمارے مخالفین کمیونزم کو ایک ہوا بنا کر پیش کرتے ہیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں کمیونزم کے خلاف دہشت رہے۔ مگر کچھ عرصہ گذرنے کے بعد لوگوں کو کمیونزم کے فائدے کا علم ہوگا تو یہ دہشت ختم ہو جائے گی۔ تب کمیونزم کے حق میں فضا سازگار ثابت ہوگی اور یہی لوگ اپنے غلط تصورات اور نظریات کی بنا پر خود بخود اپنے دلوں میں شرمندہ ہوں گے مگر اس تبدیلی کے لیے وقت درکار ہوگا۔

آج بھی آپ اس بات کو دیکھ رہے ہیں کہ لوگوں کے نظریات میں کتنی جلدی تبدیلیاں آرہی ہیں اور جوں جوں وقت گذرتا جائے گا ہر جگہ لوگوں کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ کمیونسٹ نظام ایک انصاف پسند سماج کی داغ بیل ڈالتا ہے اور انسانی زندگی کے پنپنے کے لیے بہترین حالات کو پیدا کرتا ہے۔

عباس: اب ہمارے سامنے مستقبل کے سماج کی ایک صاف اور واضح تصویر ہے۔ میں ذرا آرٹ اور کلچر کے متعلق آپ کی رائے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس ترقی یافتہ سماج میں آرٹ اور کلچر کا کیا مقام ہوگا؟

خروشچیف: اس کا فیصلہ تو میں آپ پر چھوڑتا ہوں کیونکہ یہ آپ ہی کا کام ہے اور اس کے متعلق آپ لوگ بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔

عباس: میں قومی کلچر کے بارے میں ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں آج کل سوویت یونین میں مختلف قوموں کے باشندے مختلف ریاستوں میں کھلے عام آتے

جاتے ہیں اور پھر کسی ریاست میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور کام کاج شروع کر دیتے ہیں۔ سائبیریا، قزاقستان اور نئے ترقی یافتہ علاقوں کے بارے میں خصوصاً یہ بات درست ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اس ردوبدل سے قومیت کلچر پر کیا اثر پڑے گا۔؟

خروشچیف: ہر صوبہ کے عوام کافی عرصہ تک اپنی قومی خصوصیات اور قومی کلچر کو برقرار رکھیں گے لیکن دنیا کے عوام ایک مشترکہ کلچر کی طرف بڑھیں گے اور ترقی کی ایک مشترکہ راہ پر اکٹھے سفر کریں گے۔ اور اس مشترکہ کلچر کی تخلیق میں ہر قوم نئے اضافہ کرے گی اور یہ اضافہ اس وقت ہو سکتا ہے اگر ہر قوم اپنے کلچر کی نگہبانی کرتی رہے۔ اس وقت ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس قسم کے کلچر کو فروغ دینا چاہیے جو ہیئت کے اعتبار سے قومی اور مواد کے لحاظ سے سوشلسٹ ہو۔ یہ ایک صحیح مقولہ ہے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اس مقولہ کو اپنا کر ہماری عوام نے بتدریج ترقی کی ہے، جو قومیں معاشی اور تہذیبی لحاظ سے دوسروں سے پچھڑی ہوئی ہیں۔

سوویت یونین میں ہم لوگ عوام کے کلچر کو ایک سطح پر لے آئے ہیں اس کے متعلق آپ کامریڈ ترسون زادے سے بات چیت کر سکتے ہیں جو ایک تاجک ہیں اور جن کا وطن ایک عرصہ ہوا دوسروں کا غلام اور ایک کالونی کی حیثیت رکھتا تھا۔

عباس: دنیا کے پڑھے لکھے لوگ اس بات کو جاننے کے لیے بے قرار ہیں کہ دنیا کے سربراہوں کی ادب اور آرٹ کے بارے میں کیا رائے ہے۔ اس لیے یہ بتائیے کہ آپ کا سب سے پسندیدہ ادیب کون ہے۔؟

خروشچیف: پرانے ادیبوں سے یا۔

عباس: پرانے ادیبوں سے یا تمام ادیبوں سے آپ کا محبوب فنکار کون ہے؟

خروشچیف: میری نظر میں لیو ٹالسٹائے ایک ایسا ادیب ہے جو ناول پڑھنے والوں پر سب سے زیادہ اثر ڈالتا ہے۔ گورکی بھی اثر انگیز ہیں اور میں چےخوف کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتا ہوں اور جہاں تک سوویت ادیبوں کا تعلق ہے میں کسی کو خفا کرنا نہیں چاہتا۔

ہمارے ہاں بڑے ایسے ادیب ہیں اگر میں کسی ایک کا نام لوں گا تو میں اس کے اور دوسرے ادیبوں کے لیے پریشانی کا باعث ہونگا۔ ہمارے ہاں بڑے اچھے مصنف ہیں جنھیں ہم عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور میں کسی ایک کی نشان دہی کر کے اسے دوسروں سے الگ نہیں کرنا چاہتا گو یہ ایک مسلم بات ہے کہ ادیب خود مائیکل شولوخوف کو ایک ممتاز اور سب سے بڑا ادیب مانتے ہیں۔اسی لیے میں نے گذشتہ سال مائیکل شولوخوف کا نام لیا تھا، جسے میں جدید روسی ادیبوں میں سب سے اونچا مرتبہ دیتا ہوں۔اس حقیقت کو صرف ادیب ہی تسلیم نہیں کرتے بلکہ عوام بھی اس رائے سے متفق ہے۔

عباس: کیا آپ غیر ملکی کلاسیکل ادب میں کسی ادیب کو پسند کرتے ہیں؟

خروشچیف: سچ بات تو یہ ہے کہ سوویت ادیبوں اور غیر ملکی ادیبوں کے ادب کو پڑھنے کے لیے میرے پاس بہت کم وقت ہے۔سارا وقت سیاست کی نذر ہو جاتا ہے۔اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ حالات اور اپنی مصروفیت کو دیکھ کر سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ دراصل یہ ایک مجبوری ہے، اپنی پسند کی بات نہیں۔

عباس: دور جدید کے شاعروں کو چھوڑ کر کلاسیکل شاعروں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

خروشچیف: پشکن روسی شاعری کے بانی تھے۔اس حقیقت سے کوئی روسی انکار نہیں کرسکتا۔ کھانوں کے جذبات اور ان کے خیالات کی ترجمانی نیکراسوف NEKRA SOV کے علاوہ کوئی اور ادیب نہ کرسکا۔ میں کلت سوف KALT SOV اور 'نکی تین' NIKI TIN کی عزت کرتا ہوں۔گو یہ پرانے شاعر ہیں میرے دل میں عمر جدید کے شاعر 'توردوسکی' TVARDO VSKY کی بہت وقعت ہے۔میں ''مایاکافسکی' MAYAKOVASKY کی نظموں کو گا کر سننا چاہتا ہوں لیکن میں خود ترنم سے سنا نہیں سکتا۔

عباس: کیا آپ ان نظموں کو ترنم کے لہجے میں سننا پسند کرتے ہیں؟

خروشچیف: جی ہاں۔ان کی نظمیں بڑی صاف ستھری، سلیس اور تیکھی ہوتی ہیں۔مگر چونکہ ان

کی نظمیں کسی قدر پیچیدہ ہوتی ہیں اس لیے انھیں گانا آسان نہیں۔ دورِ جدید میں اچھے ادیبوں کی تعداد کافی ہے۔ ہمارے ہاں اچھے ادیب، شاعر اور ڈرامہ نگار ہیں۔ ہم سیاسی لیڈر اپنے ادیبوں کے ساتھ کافی حد تک بے انصافی برتتے ہیں۔ وہ ہم سے خفا ہو سکتے ہیں اور ہم ان سے کیونکہ ہمارا بیشتر وقت سفیروں کی رپورٹیں ان کے بیانات اور کمیونسٹ سماج کی تعمیر میں عملی طور پر حصہ لینے والے کارکنوں کی تجاویز کو پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔ اس لیے ادب کے مطالعے کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے۔ میں ''ایمل زولا'' EMILE ZOLA کو پسند کرتا ہوں۔ جب میں نے کان کے مزدوروں کے متعلق اس کا ناول پڑھا تو میری آنکھوں کے سامنے میری گذشتہ زندگی کا سارا نقشہ کھنچ گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی زندگی کے اوراق پلٹ رہا ہوں میں اپنی کان میں ہوں اور روزمرہ کی زندگی دیکھ رہا ہوں۔ ان دنوں فرانسیسی ان کانوں کے مالک تھے اس لیے نظم و نسق اسی طرح چلایا جاتا تھا۔ جیسا کہ فرانسیسی مالک فرانس میں چلاتے تھے۔

ربا کن RUBA KIN نے بھی کان کے مزدوروں کے متعلق ایک کہانی لکھی ہے۔ یہ زولا کے ناول سے چھوٹی ہے لیکن مواد کے اعتبار سے بڑی ٹھوس اور پراثر ہے۔ اس کا نام 'کان کنوں کے درمیان' AMONG THE MINER ہے اور کوئلوں کے مزدوروں کی روزمرہ زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔ میں سوچتا ہوں جب میں زیادہ بوڑھا ہو کر کام کرنے کے ناقابل ہو جاؤں گا اور مجھے ریٹائر کیا جائے گا اس وقت میں ان جمع کی ہوئی کتابوں کو پڑھوں گا۔

عباس: کیا آپ ہمیں ان کتابوں کی فہرست دے سکیں گے۔ جنھیں آپ پڑھنا چاہتے ہیں تا کہ ہم بھی فرصت کے وقت ان کتابوں کو پڑھ سکیں؟۔

آپ نے ابھی کہا کہ آپ ایک کان میں بحیثیت ایک مزدور کے کام کر چکے ہیں۔ کیا آپ ان دنوں کی یاد کو تازہ کر کے کچھ دلچسپ واقعات کی روئیداد بیان کر سکتے ہیں۔ اس وقت آپ کے کس قسم کے خیالات تھے اور اس وقت آپ کیا بننا چاہتے تھے۔؟

خروش چیف: میرے خیالات اور رجحانات اس دور کے ساتھیوں اور ہم عمر ساتھیوں سے ملتے جلتے تھے۔ہم ایک دوسرے کے غموں سے آشنا تھے۔ ہم سب کا غم ایک تھا۔ خوشیاں بھی مشترک تھیں، جن خوابوں کو میں نے دیکھا آج انسان کے ہاتھوں حقیقت میں ڈھل چکے ہیں۔ میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف لڑنا چاہتا تھا اور مجھے لڑنے کا موقعہ ملا۔ ہم ایک کیمونسٹ سماج کی تعمیر کر رہے ہیں اس لیے میں اپنے دیش کے محنت کش عوام اور دوسرے ملکوں کے عوام کی عظیم فتوحات پر بے حد نازاں ہوں۔ میں اس نقطہ کو اور بھی واضح کرنا چاہتا ہوں تا کہ آپ مجھے اچھی طرح سمجھ لیں۔ ان دنوں میں وزیر اعظم بننے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا۔ جوانی کے دنوں میں مجھے اس قسم کی خود غرضی کی بو نہ تھی۔ وزیروں کی کونسل کا چیئر مین کا عہدہ کوئی ایسا خواب نہیں جس پر مجھے ناز ہے بلکہ یہ اہم ذمہ داری ہے جو پارٹی اور عوام نے میرے کندھوں پر ڈال دی ہے۔ یہ حقیقت میرے لیے مسرت کا باعث ہے کہ میں ایک انقلابی ہوں اور ایک سیاستداں بھی اور میں سمجھتا ہوں کہ میرا خواب اس وقت مکمل ہوا یا حقیقت کا جامہ پہنا جب عوام نے جاگیروں اور سرمایہ داروں کی حکومت کا تختہ الٹا اور جب انھوں نے سوشلزم کی تعمیر کر لی اور اب وہ کیمونزم کی تعمیر کی طرف رواں دواں ہیں۔

عباس: کیا آپ بتا سکیں گے کہ آپ نے عمر کے کس حصہ میں سوشلزم کے آدرش کو اپنایا۔؟

خروش چیف: جب میں جوان ہو کر فیکٹری کے مزدوروں کے ساتھ کام کرنے لگا اس وقت سے میں نے اس مشترکہ جدوجہد میں حصہ لیا۔

عباس: کوئلہ کی کان میں کام کرنے سے پہلے کیا آپ نے کسی کارخانے میں کام کیا تھا۔؟

خروش چیف: ہاں میں نے ایک کارخانے میں بھی کام کیا تھا۔

عباس: وہ کون سا پلانٹ تھا اور وہاں کیا تیار کیا جاتا تھا۔

خروش چیف: وہ ایک انجینئرنگ پلانٹ تھا۔ اب وہ کافی بڑا ہو گیا ہے اس وقت وہ ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا جہاں صرف تین سو مزدور کام کرتے تھے اور اس کے مالک جرمن تھے۔

عباس: آپ اپنی جوانی میں صرف بیرونی فیکٹریوں میں کام کرتے رہے؟

خروش چیف: جنوبی روس میں تقریباً سبھی کارخانے غیر ملکی سرمایہ داروں کی ملکیت تھے۔

عباس: کیا یہ سرمایہ دار خود وہاں رہتے تھے یا یہ اپنے ایجنٹوں سے کام لیتے تھے؟

خروش چیف: ان سرمایہ داروں نے اپنے مینیجر رکھے ہوئے تھے۔ بہت سے کوئلے کی کانیں فرانس اور بلجیم کے سرمایہ داروں کی تھیں۔ انجینئرنگ کے بہت سے کارخانے جرمن سرمایہ دار چلاتے تھے۔ ان کے علاوہ روسی سرمایہ دار بھی تھے جو جرمنوں اور انگریزوں کی طرح فائدہ اٹھاتے تھے۔

عباس: وہ کارخانہ کس جگہ ہے جہاں آپ کام کرتے تھے؟

خروش چیف: ''دون باس'' میں — اب اس کارخانہ کا نام ''نوجوان کیمونسٹ لیگ کی پندرھویں سالگرہ'' ہے — یہ ایک بہت بڑا پلانٹ ہے۔ جہاں کئی ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔

عباس: میرے دوست سردار جعفری جو ایک شاعر ہیں وہ آپ سے غنائی شاعری کے بارے میں آپ کی رائے پوچھنا چاہتے ہیں۔ سردار جعفری کیمونسٹ ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک غنائی شاعر بھی ہیں۔

سردار جعفری: میں نے کچھ سیاسی نظمیں بھی لکھی ہیں۔

خروش چیف: میں یوکرین میں کافی عرصہ کام کرتا رہا اور اسی وجہ سے مجھے یوکرین شاعری کے متعلق کافی گیان ہے۔ مجھے یوکرین کے شاعر ''ولادی می وی'' VLADI MIVI کی نظمیں بہت پسند ہیں۔ ''آندرے مالی شک'' ANDER MALYSAK ایک اچھا شاعر ہے۔ اس وقت وہ نوجوان شاعر سمجھے جاتے تھے لیکن اب کافی مشہور و معروف ہو گئے ہیں۔ اب ان کا شمار استادوں میں ہوتا ہے پرانے شاعروں میں سے بھی میں کئی کے نام گنوا سکتا ہوں۔

سردار جعفری: میں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں، ہندوستان سے رخصت ہوتے ہوئے میرے ہندوستانی ادیبوں نے جن میں زیادہ تر ترقی پسند ادیب ہیں۔ مجھ سے کہا تھا کہ سوویت یونین پہنچ کر یہ معلوم کیجیے گا کہ روسی ادب میں غنائی شاعری کا کیا

مقام ہے۔ اس لیے میں نے اپنے دوست مرزا ترسون زادے سے کل بھی کہا تھا کہ آپ مجھے روسی غنائی شاعری کی جتنی نظمیں دے سکتے ہیں دیں۔ میں ہندوستانی ادیبوں کے لیے انھیں بطور تحفہ لے جاؤں گا اور آج مجھے آپ سے ملنے کا شرف حاصل ہوا اور اسی لیے میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ غنائی شاعری میں آپ کسے زیادہ پسند کرتے ہیں؟

خروش چیف: طبقاتی جنگ میں جو ہتھیار تیکھا اور نشانہ پر ٹھیک بیٹھتا ہوا چھار ہے گا۔ شاعری ایک کارآمد ہتھیار ہے۔ گورکی شاعر نہیں تھا لیکن اس کی نظم "THE STORMY PETREL" انقلاب کی پہلی للکار تھی۔ طبقاتی سوجھ بوجھ آنے کے بعد شاید ہی کوئی مزدور ہوگا جس نے اس نظم کو پڑھا یا سنا نہ ہو۔ اس لیے شاعری عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے اور طبقاتی مفاد کی حفاظت کرنے کے لیے ایک اہم رول ادا کر رہی ہے۔

عباس: طبقاتی جدوجہد کے علاوہ انسانی مسرت اور انسانی زندگی کے لیے غنائی شاعری کی کیا حیثیت ہے؟ اس کے متعلق آپ انھیں رائے بتائیے۔

خروش چیف: مسرت کیا ہے؟ پہلے اس کا فیصلہ تو کر لیجیے۔

عباس: مثال کے طور پر لیجیے۔ سوویت یونین میں طبقاتی کش مکش نہیں ہے کیا اس قسم کے سماج میں غنائی شاعری کی جگہ ہے؟

خروش چیف: کیوں نہیں۔ یوکرین میں میں نے ایک گانا سنا تھا جس کے بول مال شک MALSHYK نے لکھے تھے۔ میرے خیال میں اس کا نام 'ماں' تھا بڑا حسین گیت تھا۔ ہر شخص کے دل میں 'ماں' کی محبت ہوتی ہے، جذبات اور احساسات سے اس کا دل معمور ہوتا ہے اور انہی جذبات اور احساسات کی عکاسی بیک وقت ماں اور مادر وطن کے لیے ہو سکتی ہے وہ بڑا پُر اثر گیت تھا۔

ہمارے دیش میں مخالف طبقے نہیں ہیں اور اسی لیے ہمارے ملک میں طبقاتی جنگ نہیں ہے۔ ہمارے مشترکہ ارادے ہیں کہ ہم اپنے ملک میں کیمونسٹ سماج کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ جس کے ذریعہ ہم عوام کی مادی اور روحانی ترقی کی پوری پوری

حفاظت کرنا چاہتے ہیں لیکن ہم خود غرض نہیں ہیں۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی ترقی کریں اس لیے ہم اپنی جدو جہد سے دوسروں کو اس شاہراہ پر چلنے کے لیے نشان دہی کرتے رہیں گے۔ تا کہ دوسرے ملکوں کے عوام اپنے معیار زندگی کو بہتر بنا سکیں۔ اس درخشاں منزل تک پہنچنے کے لیے ہر شخص کو کام کرنا ہوگا۔ اس جدو جہد میں ادب کی ہر صنعت کا استعمال ہو سکتا ہے۔ چاہے وہ ناول ہو یا ڈرامہ یا غنائی شاعری۔

لوک کتھاؤں اور طنزیہ مضامین کا کیا رول ہوگا۔ ہماری جدو جہد کے لیے یہ بھی کار آمد ہتھیار ہیں۔ ی خائل کوف کی کتھائیں ہماری جدو جہد کے لیے کار آمد ہتھیار ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ ہر ہتھیار جو کمیونسٹ سماج کی تعمیر کرنے میں مدد کرتا ہے جو ہماری کمی دور کرتا ہے اور ہماری سوجھ بوجھ کو بڑھاتا ہے اور ہمارے ذہنی افق کو وسیع کرتا ہے ہمارے لیے سودمند اور اچھا ہے۔

عباس: کتنے ہی برس سے آپ امن کی جدو جہد کی راہنمائی کر رہے ہیں؟ اس جدو جہد میں آپ نے مختلف ملکوں کے سربراہوں سے ملاقات کی ہے کیا ان کے متعلق اپنے تاثرات یا رائے بتا سکیں گے۔ امن کی اس جدو جہد میں ان لیڈروں کا کیا رول ہے؟

خروشچیف: میں مختلف ملکوں کے سربراہوں کا جائزہ لینا نہیں چاہتا۔ میں اس قسم کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لینا نہیں چاہتا۔ یہ قابل تعظیم لیڈر ہیں اور میرے دل میں ان کی عزت ہے اور رہے گی۔ جب تک یہ لیڈر عوام کے مفاد اور قیام امن کے لیے اپنی کوشش جاری رکھیں گے میں اس بات کو دہراتا ہوں کہ مجھے اس بات کے لیے مجبور نہ کیا جائے کہ میں کسی لیڈر پر کوئی لیبل چسپاں کروں کیونکہ یہ لوگ زندہ ہیں اور باعمل ہیں۔

عباس: جہاں تک ہم جانتے ہیں کہ آپ اگلے مہینے انڈونیشیا جا رہے ہیں۔ ہمارے دیش میں آپ کی پہلی آمد کی گونج ابھی تک سنائی دیتی ہے اور آپ کی پہلی آمد کی خوشگوار یادیں ابھی تر و تازہ ہیں جبکہ آپ نے ہندوستان کے ترقیاتی منصوبوں کے متعلق

اظہار دوستی کیا تھا۔ کیا اس بار آپ کے پاس اتنا وقت ہوگا کہ آپ ان اداروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں تا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ کہاں تک ترقی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر بھلائی پراجیکٹ کو لیجیے۔ سوویت یونین نے اس پراجیکٹ کے لیے کافی مدد دی ہے۔ یہ امداد بین الاقوامی اشتراک کے میدان میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

خروش چیف: اس ملاقات سے پہلے میں ہندوستان کے سفیر شری میلن سے ملا تھا۔ انھوں نے ہندوستان کے وزیر اعظم مسٹر نہرو کا دعوت نامہ مجھے دیا۔ جس میں مجھ سے کہا گیا کہ میں انڈونیشیا کی طرف جاتے ہوئے دلی میں کچھ دنوں کے لیے قیام کروں۔ میں نے آپ کے سفیر سے کہا کہ وہ شری نہرو سے اس دعوت نامہ کا شکریہ ادا کریں اور میں نے یہ بھی کہا کہ میں اس موقعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا اور اس طرح میں دلی بھی آسکوں گا اور بھلائی کے کارخانے کو دیکھ سکوں گا۔ مجھے ایک اسٹیٹ فارم کے دیکھنے کی دعوت ملی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ فارم کہاں ہے۔ پچھلی بار جب میں ہندوستان میں تھا تو ہم نے کھیتی باڑی کے لیے چند مشینیں بطور تحفہ دی تھیں۔ سنا جاتا ہے کہ اس فارم میں ان مشینوں کو استعمال کیا جارہا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ ایک اچھی فارم ہے۔ میں اس فارم کو ضرور دیکھنا چاہتا ہوں۔

عباس: یہ فارم دلی سے بہت دور نہیں۔ اگر آپ دلی آئیں گے تو بڑی آسانی سے اسے دیکھ سکیں گے۔

خروش چیف: مجھے مسٹر نہرو سے مل کر بے حد خوشی ہوگی اور اس طرح میں ہندوستان کو دوبارہ دیکھ سکوں گا۔ مجھے گذشتہ دورے کی حسین یادیں اب بھی یاد ہیں میرے ذہن میں ہیں۔ اس خزانے میں چند یادوں کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔

عباس: یہ ملاقات کب ہوگی۔؟

خروش چیف: فروری کے وسط میں۔

عباس: تو ہم ہندوستانیوں کو یہ خوشخبری سنا سکتے ہیں۔

خروش چیف: کل کے اخباروں میں شری نہرو کے دعوت نامہ کی خبر اور شری مینن جو ہندوستان کے سفیر ہیں۔ ان کی ملاقات کی خبر چھپ جائے گی۔

عباس: آپ ہندوستان اور چین دونوں کے عوام اور لیڈروں کے دوست ہیں۔ اس وقت ان دو ملکوں کے درمیان ایک ناگوار واقعہ کی وجہ سے آپس میں کشیدگی ہے۔ ایک صلح کل اور باوقار دوست کی حیثیت سے آپ اس موضوع کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہیں۔؟

خروش چیف: اس بارے میں ہماری حکومت نے کئی بیانات دیے ہیں۔ ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ ہندوستان اور چین کی سرحدوں پر جھگڑا ہوا اور دونوں طرف جانی نقصان ہوا۔ میرے خیال میں یہ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ دونوں اطراف سے کوئی بھی کسی کے علاقہ پر قبضہ کرنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ اس وقت یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کی پوری کوشش کی جائے تاکہ دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہو سکیں۔ ہم اس ملاپ کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کریں گے کیونکہ چینی عوام کے ساتھ ہمارے بھائی چارے کے اٹوٹ رشتے ہیں اور ہندوستان کے ساتھ ہمارے دوستانہ تعلقات دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔

عباس: بس ایک آخری سوال رہ گیا ہے۔ سوویت سائنس کی یہ حیرت انگیز کامیابی ہے کہ اس نے خلا میں راکٹ بھیجا اور 'لونک' (LUNIK) نے چاند کے گرد سفر کیا اور اس کے اوجھل حصہ کو بھی فوٹوگراف کیا۔ اس بے مثال کامیابی نے ساری دنیا میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے اور کئی شاعروں نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر نظمیں لکھی ہیں۔ میرے دوست سردار جعفری نے بھی اس موضوع پر شاندار نظمیں کہیں ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس نئے قیمتی تجربہ سے انسانی مسرتوں میں کیا اضافہ ہوا ہے اور اس قسم کے تجربوں سے انسانی سماج کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟

خروش چیف: کچھ عرصہ کے بعد انسان کے لیے ممکن ہو جائے گا کہ وہ راکٹ کے ذریعہ چاند

اور ستاروں تک سفر کر سکے۔قدرتی طاقتوں کا انکشاف انسانیت کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر آپ مذہبی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ کومعلوم ہوگا کہ آسمان خداؤں کی رہائش کے لیے مخصوص تھا۔راکٹ کے ذریعہ خلا میں کیمرہ کا جانا، انسانی علم کے دامن کو وسیع کرتا ہے۔انسانی تصور کی حدوں کو پھیلاتا ہےاور خلائی تسخیر کی طرف ایک اہم قدم ہے۔آج ہم ان نئی دریافتوں کے بارے میں پورے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی وجہ سے انسانیت کو کیا فیض پہنچے گا لیکن ان کے نتائج دور رس ثابت ہوں گے۔ بالعموم ایک بات کہی جاسکتی ہے جو ہر انسان کی مخفی اور پوشیدہ طاقتوں کا ایک بہت بڑا اظہار ہےاور ہمارے عوام کے لیے یہ فخر کا مقام ہے کہ سوویت سائنس داں اور ٹیکنالوجسٹ زمینی کشش اور خلا پر فتح پانے کے سلسلے میں سب سے آگے ہیں۔ بس یہ سمجھئے کہ یہ ہمیں اور ہماری سوشلسٹ حکومت کو میٹرک کا سرٹی فکیٹ مل گیا ہے۔

عباس: میٹرک کا سرٹی فکیٹ کیوں، یہ تو ڈاکٹر کی ڈگری ہے۔

خروش چیف: میں ذرا انکساری برت رہا ہوں چونکہ یہ میرے ملک کی دریافت ہےاور میں اس کی نمائندگی کرتا ہوں۔

عباس: باہر کے خلا کے لیے میٹرک کا سرٹیفکیٹ ہوسکتا ہے لیکن اپنی زمین کے لیے کم سے کم بی اے کی ڈگری کی حیثیت رکھتا ہے۔

خروش چیف: مجھے اس کی اہمیت سے انکار نہیں اور اگر آپ بی۔اے کی ڈگری دینے پر بضد ہیں تو اس ڈگری پر سوشلسٹ دیش کی مہر ثبت ہے۔اور یہ نئے سماج کی ایک نئی کامیابی ہےاور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا سماج بالغ ہوگیا ہے سوویت عوام اور روسی سائنسدان ٹیکنالوجی کے ماہران فتوحات پر بے حد خوش ہیں۔ مجھے یاد ہے اکتوبر انقلاب کے وقت زار روس کے چند دانش ور انقلاب روس کی پوری اہمیت سے ناواقف تھے اور یہ بات بہ بانگ دہل کہتے تھے کہ ہم صدیوں کی بنائی ہوئی کلچر کو تباہ کردیں گے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ انقلاب صرف مادی قدروں کا تحفظ کرتا ہے

اور روحانی اور کلچر قدروں سے اسے کوئی علاقہ نہیں لیکن آج ہمارے دشمن بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں سوشلسٹ سماج پورے شباب پر ہے اور ہمارا زمانہ عظیم آدرشوں کی فتح کا زمانہ بن گیا ہے۔ ہمارا ادب پہلے سے زیادہ شاداب ہو گیا ہے اور اسی طرح فنون لطیفہ اور سائنس نے بے مثال ترقی کی ہے اور ہم نے ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کرنے میں سب سے پہل کی ہے۔ خاص کر چاند کی طرف راکٹ بھیجنے کی مہم ایک یادگار چیز بن کر رہ گئی ہے یہ بڑا ہی حسین آغاز ہے۔

عباس: اور ہمارے انٹرویو کا اختتام بھی برا نہیں۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ بھلائی تشریف لے جائیں گے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ 'پردیسی' جوروس اور ہندوستان کی مشترکہ فلم تھی۔ اس کی تیاری میں میرا بھی ہاتھ تھا۔ آج ہم نے بھلائی کارخانے کے معماروں اور انجینئروں کے بارے میں ایک فلم بنانے کے متعلق غور کیا ہے۔

خروش چیف: بہت خوب۔ میں نے آپ کی 'پردیسی' فلم دیکھی ہے۔ یہ ایک اچھی فلم ہے اور مجھے پسند ہے۔ میں آپ کی کوششوں کی قدر کرتا ہوں اور مبارک باد دیتا ہوں۔ میں آپ کی اگلی فلم کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ اگر پچھلی فلم ماضی کے عہد کو اجاگر کرنے کے لیے بنائی گئی تھی تو نئی فلم عصر جدید کی عکاسی کرے گی یہ بہت اچھی بات ہے۔

عباس: اتنی مصروفیت کے باوجود بھی آپ نے ہمیں اتنا وقت دیا آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور ہم معافی چاہتے ہیں اگر ہم نے موضوع سے ہٹ کر کوئی سوال پوچھا ہو۔

خروش چیف: ایسی کوئی بات نہیں، دوران گفتگو میں ہر قسم کے سوال کیے جا سکتے ہیں۔

O

سفرنامے

سرخ زمین اور پانچ ستارے

(نئے چین کے قومی پرچم کی زمین سرخ ہے۔ان شہیدوں کے خون کی طرح جن کی قربانیوں نے اس جمہوری راج کو جنم دیا ہے۔اس سرخ زمین پر پانچ سنہرے ستارے جگمگا رہے ہیں جس میں سے بڑا ستارہ چینی مزدوروں کا ہے اور باقی چار ستارے کسانوں، درمیانی طبقے ،قومی سرمایہ داروں اور اقلیتوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔یہ پرچم 43 کروڑ چینی عوام کے حیرت انگیز اتحاد اور ان کی قومی آبرو کا جیتا جاگتا نشان ہے)

میں چین نہیں جارہا ہوں

'میں چین جارہا ہوں'

'میں چین نہیں جارہا ہوں'

'میں چین جارہا ہوں'

'میں چین نہیں جارہا ہوں'

پورے پندرہ دن اسی تذبذب میں گزرے۔

12 ستمبر کو کل ہند امن کمیٹی کے صدر ڈاکٹر کچلو کا خط ملا کہ چین کی پانچ نمائندہ انجمنوں نے ایک ہندوستانی وفد کو چین آنے کی دعوت دی ہے اور اس وفد میں میرا نام بھی شامل کیا گیا ہے۔ وفد 21 ستمبر کو ہوائی جہاز سے روانہ ہو جائے گا۔ کیا میں اس وفد کے ساتھ چین جانا منظور کروں گا کیا میں چین جانا پسند کروں گا؟

چین!

'اطلب العلم لو کان بالصین' (علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے چین ہی جانا پڑے)

چین!

چین — جہاں پانچ ہزار برس پہلے تہذیب اور تمدن نے جنم لیا!

چین — جہاں کے لوگ اس وقت ریشم اور کمخواب پہنتے تھے جب یورپ والے کھالیں اوڑھے پھرتے تھے!

چین — جس نے دنیا کو کاغذ بنانا سکھایا!

چین — جس نے دنیا کو بارود کا استعمال سکھایا۔ مگر آتش بازی سے بچّوں کا دل بہلانے کے لیے — بموں اور مشین گنوں سے بچّوں کا خون کرنے کے لیے نہیں۔

چین — جس سے یورپ والوں نے کاغذ کے سکّے جاری کرنا سیکھا۔

چین — جس کے نام پر برتن بنانے کی سب سے نفیس مٹی 'چینی' کہلاتی ہے

چین — جس کے نام پر ہم شکر کو 'چینی' کہتے ہیں۔

چین — ہزاروں میل لمبی فصیل جو ہزار برس سے آج تک اسی طرح مضبوط اور مستحکم کھڑی ہے۔

علاءالدین کا طلسمی چراغ چین کے بازاروں ہی میں ملتا تھا۔

چین!

فلسفیوں اور عاقلوں کا چین!

دستکاروں اور صنّاعوں کا چین!

چین!

چین — غریب کسانوں، قلیوں اور رکشا کھینچنے والوں کا چین!

چین — 'ایشیا کا مریض' جسے مردہ سمجھ کر سامراجی گدھ برسوں منڈلاتے رہے!

چین — جہاں انگریز اور فرانسیسی اور جرمن اور جاپانی عیش کرتے تھے اور خود چینی رکشا کھینچنے والے خون تھوک تھوک کر مر جاتے تھے!

چین — جہاں ہر سال لاکھوں اکال، بیماری اور بھوک کا شکار ہوتے تھے!

چین — جہاں غریبوں اور مظلوموں کی آہ انقلاب کا نعرہ بن گئی تھی!

ڈاکٹر سن یات سین کا چین!

ماؤ سے تنگ کا چین!

چین — ایک سرخ ستارہ جو ایشیا کے افق پر چمک اٹھا!

چین — ایشیا کا سویا ہوا شیر جواب جاگ گیا ہے!

کب سے چین جانے کی آرزو تھی!

1938 میں میں ہانگ کانگ گیا۔ مگر وہاں سے اندرون چین نہ جاسکا کیونکہ ہانگ کانگ کینٹن ریلوے پر جاپانی بم برس رہے تھے۔ وہاں سے شنگھائی گیا مگر شنگھائی بھی جاپانی حملہ آوروں سے گھرا ہوا تھا۔ برطانوی شنگھائی میں بھی جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا، رات کو جاپانی بموں کے دھماکے سنائی دیتے تھے۔ کیمونسٹوں اور دوسرے قوم پرست ترقی پسندوں کے دباؤ سے آخر کار چیانگ کائی شیک جاپانی سامراجیوں کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ سارے ملک کے کونے کونے میں جہاں تک بھی جاپانیوں کا قبضہ ہوا تھا۔ وہاں انقلابی کسانوں کی بے قاعدہ 'گوریلا' فوجیں دشمن پر اچانک اور پے در پے حملے کر رہی تھیں۔ شنگھائی سے پندرہ بیس میل پر بھی 'گوریلا' دستے کام کر رہے تھے۔ میں ان کے کتنا نزدیک تھا اور کتنا دور۔

جنگ کے دوران (میں) پنڈت جواہر لال نہرو کے ایما پر کانگریس نے ایک طبّی وفد چین بھیجا۔ چینی قوم پرستوں سے اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دینے ہندوستانی ڈاکٹر مختلف مورچوں پر کام کرتے ہوئے شمال مغرب کے پہاڑوں میں یے نان پہنچے — یے نان —YANAN وہ تاریخی مقام جہاں کے غاروں میں نئے چین نے جنم لیا — یے نان — جو ماؤ سے تنگ اور جنرل، چو — دے CHUDE اور ان کی کیمونسٹ فوجوں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ دو سال تک ہندوستانی ڈاکٹر یے نان اور آس پاس کے پہاڑی مورچوں پر کام کرتے رہے...... وہاں ہی ڈاکٹر دوارکا ناتھ کوٹنس نے ایک چینی لڑکی سے شادی کی...... وہیں ان کا بچہ...... چین اور ہندوستان کے اتحاد کا جیتا جاگتا نمونہ...... پیدا ہوا۔ وہیں ایک گمنام گاؤں میں ڈاکٹر کوٹنس نے اپنی جان دی اور قسمت نے ہندوستانی طبّی وفد اور ڈاکٹر کوٹنس کی کہانی لکھنے کا کام میرے سپرد کیا COME BACK AND ONE DID NOT لکھتے ہوئے میرا تخیئل بغیر پاسپورٹ لیے کتنی ہی بار چین گیا۔ اس کے لامتناہی میدانوں میں گھوما۔ اس کی دشوار گزار گھاٹیوں میں ہوتا ہوا یے نان کی پہاڑیوں کی چوٹیوں تک پہنچا، کتنی ہی سرد اور برفیلی راتیں میں نے بہادر 'گوریلا' چھاپے ماروں کے ساتھ گزاریں، ماؤ سے تنگ اور چو تھے،

سے ملاقاتیں کیں، جاپانی فوجوں پر شب خون بھی مارے اور ہندوستانی ڈاکٹروں کے ساتھ زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کی......

مگر تخیل آزاد ہے۔ انسان ابھی تک آزاد نہیں ہے۔ جیسے ہی 1949 میں چینی انقلاب کی تکمیل ہوئی اور پیکنگ میں نئی حکومت قائم ہوئی۔ میں نے چین جانے کی کوشش شروع کی۔ نئی جمہوری حکومت کو تسلیم کرنے میں ہندوستان نے سبقت کی تھی۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ ایک ہندوستانی اخبار نویس ہی سب سے پہلے چین جائے اور اس نئے تاریخی انقلاب کے بارے میں ہندوستان اور دنیا کو بتائے۔ مگر چین کا نیا سفارت خانہ قائم ہوتے ہوتے کئی مہینے لگ گئے اور جب نئے چینی سفیر آ گئے تب بھی مجھے 'ویزا' ملنے میں ایک برس لگ گیا۔ اس عرصے میں سویت روس کے مصنفوں کی انجمن کی طرف سے دعوت نامہ ملا۔ میں نے روس جانے کے لیے گورنمنٹ کو درخواست دی، نتیجہ یہ ہوا کہ میرا پاسپورٹ ہی ضبط کر لیا گیا۔

12 ستمبر کو جب مجھے ڈاکٹر کچلو کا خط ملا تو میرے پاس پاسپورٹ نہیں تھا۔ نہ واپس ملنے کی امید تھی کیونکہ بمبئی کی حکومت کی رائے میں میں خطرناک کیونسٹ ہوں۔ (یہ اور بات ہے کہ کئی کیونسٹ دوستوں کی رائے میں میں 'انقلاب دشمن' ہی نہیں 'انسان دشمن' بھی ہوں)۔ پھر اگلے دن گورنمنٹ کو درخواست دی کہ میرا پاسپورٹ واپس کر دیا جائے اور مجھے چین جانے کی اجازت دی جائے۔ جواب ملا کہ غور کیا جائے گا مگر فیصلہ مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ نئی دہلی ایک دو نہیں، درجنوں خط لکھے، تار دیئے، کسی کا جواب نہیں آیا اور تار دیئے ٹرنک کال ٹیلیفون کیے، معلوم ہوا غور ہو رہا ہے۔

سات دن اسی طرح گزر گئے۔ دل اور دماغ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک کہتا تھا 'میں چین جا رہا ہوں' دوسرا کہتا تھا 'میں چین نہیں جا رہا ہوں'

'میں چین جا رہا ہوں'

'میں چین نہیں جا رہا ہوں'

اسی تذبذب کی حالت میں BLITZ کا کام بھی ہوتا رہا۔ میرے فلم کی شوٹنگ بھی ہوتی رہی۔ ناگپور کے LAW کالج سے بلاوا آیا ہوا تھا وہ بھی مشروط طور پر منظور کر لیا مگر یہ طے نہ ہوا کہ میں

چین جارہا ہوں یا نہیں جارہا ہوں۔

19 ستمبر کو ڈاکٹر ملک راج آنند دہلی روانہ ہو گئے۔20 کی صبح کو ان کا تار ملا کہ تمھارا چین جانا بہت ضروری ہے۔ پاسپورٹ کی پوری کوشش کرو۔اب ایک ہی ذریعہ رہ گیا تھا۔سو پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک لمبا تار بھیجا کہ شاید ان کی مداخلت بارآور ثابت ہو۔

20 ستمبر کو وفد کا پہلا دستہ پنڈت سندر لال کی قیادت میں دہلی سے روانہ ہو گیا مگر مجھے پاسپورٹ نہ ملا۔اب بھی امید کی ہلکی سی کرن باقی تھی کیونکہ وفد کے باقی اراکین 21 اور 23 کو جانے والے تھے۔

21 ستمبر کو بمبئی سے بلٹز کے ایڈیٹر کرنجیا اور نہتھی سنگھ بھی روانہ ہو گئے اور اسی دن وفد کا دوسرا دستہ دہلی سے ہانگ کانگ کے لیے روانہ ہو گیا۔

دہلی سے ایک تار آیا کہ عباس کا پاسپورٹ ملنے کی امید نہیں ہے۔اس لیے وفد میں اس کی جگہ پُر کر دی گئی ہے......

مگر 22 کی دوپہر کو مجھے پاسپورٹ مل گیا۔کیوں؟ کیسے پہلے کیوں نہیں ملا؟—یہ حکومت کے بھید ہیں جو کھولے نہیں جاتے۔

پاسپورٹ مل گیا— مگر ایک نئی مشکل کا سامنا ہوا۔23 کے ہوائی جہاز میں سیٹ نہیں ملی اور کیونکہ کینٹن سے پیکنگ تک ریل کا پانچ دن کا سفر طے کرنا تھا۔اس لیے یکم کے جشن جمہوریت میں شامل ہونے کے لیے یہ آخری ہوائی جہاز تھا!اس لیے میں نے پاسپورٹ کو الماری میں بند کر دیا اور اپنے دل اور دماغ سے چین جانے کے خیال کو ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ نکال دیا۔جو گرم کپڑے دوستوں سے مانگے تھے وہ واپس کر دیئے۔فلم کی شوٹنگ پھر شروع کر دی۔تذبذب اب مایوسی سے یقین میں بدل گیا۔

'میں چین نہیں جارہا ہوں'

'میں چین نہیں جارہا ہوں'

اور پھر 26 ستمبر کی دوپہر کو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی 'ٹرنک کال نئی دہلی سے' ٹیلیفون آپریٹر نے کہا۔

'میں چینی سفارت خانہ سے بول رہا ہوں' ایک چینی آواز آٹھ سو میل سے آئی 'ہمیں پیکنگ

سے ہدایات ملی ہیں کہ آپ کو کسی نہ کسی طرح فوراً روانہ کر دیا جائے۔ کل شام کو ایک ہوائی جہاز ہانگ کانگ کے لیے روانہ ہو رہا ہے......'

'مگر کینٹن سے پیکنگ تک ریل میں پانچ دن لگتے ہیں' میں نے کہا' میں یکم اکتوبر تک کیسے پہنچ سکتا ہوں؟'

'اس کی فکر نہ کیجیے۔ کینٹن سے آپ کو ہوائی جہاز کے ذریعہ ایک دن میں پہنچا دیا جائے گا۔ آپ آج رات ہوائی جہاز سے دہلی آ جائیے' اور ٹیلیفون بند کرتے ہی میں ایئر انڈیا کے دفتر کی طرف بھاگا۔ راستہ میں ایک دوست سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

'ارے کہاں بے تحاشا بھاگے جا رہے ہو؟'

'میں — میں چین جا رہا ہوں'

'چین؟ — مگر کل شام ہی تو تم کہہ رہے تھے میں نہیں جا رہا ہوں'۔

میں جواب دیے بغیر ہی ایک ٹیکسی کی طرف لپکا اور میرا دوست وہاں کھڑا میری بوکھلاہٹ پر مسکراتا رہا۔

○

پندرہ گھنٹے امریکہ میں

نقشے پر دیکھیے تو دہلی سے ہانگ کانگ تک ہوائی سفر کرنے کے لیے ہندوستان، برما اور تھائی لینڈ (سیام) پر سے گزرنا ہوتا ہے۔ مگر کبھی کبھی اصلیت جغرافیے کی حدوں کو نظر انداز کر جاتی ہے۔ مجھے چین جانے کے لیے پندرہ گھنٹے امریکہ میں گزارنے پڑے۔

یہ 'امریکہ' کا صرف بارہ فٹ چوڑا اور کوئی ساٹھ فٹ لمبا PAN AMERICAN کمپنی کا ہوائی جہاز ہے جو امریکہ سے چل کر یورپ اور ہندوستان ہوتا ہوا ہانگ کانگ اور جاپان کے راستے واپس امریکہ جا رہا ہے۔ ساری دنیا اس 'امریکہ' کی لپیٹ میں آ چکی ہے۔

رات کو دو بجے دہلی کے پالم ہوائی اڈے پر اس ہوائی جہاز میں جیسے ہی میں نے قدم رکھا اور اس کا بھاری دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ بند ہوا۔ میں ہندوستان سے امریکہ پہنچ گیا۔ اسٹیورڈ نے ایک مائیکروفون پر ٹھیٹھ امریکی لہجے میں ناک میں سے گنگنا کر ہمارا استقبال کیا مگر لاؤڈ اسپیکر کی گونج میں کم سے کم میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔ ایئر ہوسٹس (جو اپنے رنگے ہوئے سنہری بالوں اور پینٹ پاؤڈر لپ اسٹک کے ساتھ ہالی ووڈ کی مکمل پیداوار معلوم ہوتی تھی) اپنے دانت کھول کر اس طرح مسکرائی جیسے بٹن دبا کر بجلی کی روشنی کی جاتی ہے۔ یہ مسکراہٹ اس نے بلا تفریق سب مسافروں پر بکھیری اور پھر بٹن دبا کر غائب کر دی۔ ایک ایک کر کے مسافروں نے اپنی اپنی

کرسیوں کی کمر جھکائی اور روشنی بجھا کر سونے کے لیے تیار ہو گئے۔ 'امریکہ' اندھیرا ہو گیا۔ مگر چار ہزار فٹ نیچے نئی دلی کی روشنیاں دیر تک جھلملاتی رہیں...... یہاں تک کہ 'امریکہ' اور نئی دلی اور میرے دماغ سب پر نیند کا اندھیرا چھا گیا۔

آدھ گھنٹے ٹھہر کر جب کلکتے سے طلوعِ آفتاب کے وقت ہوائی جہاز روانہ ہوا، تب جا کر ٹھیک طرح سے 'امریکہ' کے درشن ہوئے۔ امریکہ کی طرح یہ ہوائی جہاز بھی میکانیکی تمدن کا بڑھیا اور شاندار نمونہ ہے۔ پچاس مسافروں کے بیٹھنے کے لیے آرام دہ کرسیاں مردوں کے لیے داڑھی بنانے کے بجلی کے اُسترے۔ پلاسٹک کی کشتیوں میں بڑی نفاست سے لگا ہوا امریکی قسم کا ناشتہ۔ پڑھنے کے لیے رنگین تصویروں اور اشتہاروں سے بھرے ہوئے امریکن رسالے اور اخبار عورتوں کے سنگھار کے لیے ایک علیحدہ 'پاؤڈر روم'۔ کوٹ اور کپڑے ٹانگنے کے لیے 'ہینگر'۔ دانتوں کی ورزش کے لیے 'چیونگ گم' (CHEWING GUM) پینے کے لیے کوکوکولا اور برف کا پانی۔ اور ایئر ہوسٹس کی وہ 'میڈ ان ہالی ووڈ' مردہ مسکراہٹ جو بٹن دبانے سے پیدا ہوتی ہے اور بٹن دبانے سے غائب ہو جاتی ہے۔

میرے سامنے کی سیٹوں پر ایک بوڑھا پادری اور اس کی بیوی بیٹھے ہیں جو برسوں چین میں عیسائیت کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ صورت شکل سے بہت بھلے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر چین کا انقلاب ان کی سمجھ کے باہر ہے اور اس لیے وہ اب جاپان جا رہے ہیں۔ ان کے آگے ایک موٹا انگریز تاجر ہے جو مدتوں شنگھائی میں کاروبار کرتا رہا ہے۔ وہسکی پی پی کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ہے۔ اس کی گردن پر چربی چڑھی ہوئی ہے اور شاید دماغ پر بھی۔ وہ اپنے برابر والے سے چین کے بارے میں باتیں کر رہا ہے۔ کہتا ہے پرانے دنوں میں شنگھائی کتنا رنگین اور شاندار شہر تھا۔ ایشیا کا پیرس کہلاتا تھا اور اب؟ اب تو وہاں کمیونسٹ لڑکے اور لڑکیاں حکومت کرتی ہیں۔ ہنہ! ڈھنگ کے کپڑے بھی تو نہیں ہیں ان کے پاس!...... مگر اپنے ساتھی کے سوال پر اسے یہ ماننا پڑتا ہے کہ جب کمیونسٹ فوجیں شنگھائی میں داخل ہوئیں تو لوٹ مار بالکل نہیں ہوئی اور غیر ملکیوں کے ساتھ برا سلوک بالکل نہیں ہوا، 'مگر...... مگر...... سوچو تو سہی...... اب کوئی چینی افسر یا پولیس کا سپاہی بغیر اجازت میرے گھر میں تلاشی لینے گھس آتا ہے...... کم سے کم میں تو یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے میں تو ہانگ کانگ چلا آیا ہوں'

ایک نوجوان امریکن فوجی سپاہی ہے جو جاپان جا رہا ہے اور وہاں سے شاید کوریا KOREA جائے گا۔ ایک نوجوان ہندوستانی بیوپاری ہے جو ہانگ کانگ سے ہوائی جہاز بدل کر منیلا جائے گا اور جو اپنی رنگا رنگ ٹائی اور بناوٹی لہجے سے 'امریکن طرز زندگی' کا منہ چڑا رہا ہے۔

ایک چینی نوجوان ہے جو پانچ برس کے بعد آکسفورڈ سے پڑھ کر لوٹ رہا ہے۔ اس کا باپ ہانگ کانگ میں بیوپاری ہے۔ اس کی غیر حاضری میں چین میں انقلاب ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے بات کی تو اس نے کہا: 'میں کیمونسٹ تو نہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا ہے۔'

ایک امریکن گورنمنٹ کے STATE DEPARTMENT کا 'ہرکارہ' ہے جو ہر ہوائی اڈے پر ایک مہر لگا ہوا تھیلا وہاں کے امریکی سفارت خانے کے لیے چھوڑتا جا رہا ہے۔ ان تھیلوں میں واشنگٹن سے آئے ہوئے احکامات ہیں جن کا انتظار امریکن سفیر ہی نہیں ان کے مقامی 'دوست' اور ایجنٹ بھی کر رہے ہوں گے۔

کسی زمانے میں ایشیا کے اس علاقہ میں انگریزوں کی عملداری تھی۔ اب ان کی جگہ امریکن نے لے لی ہے۔ دہلی سے روانہ ہوتے وقت میں نے ہوائی جہاز کمپنی کے دفتر والوں سے کہا کہ ان کا ہوائی جہاز بینگ کاک ٹھہرے گا مگر میرے پاسپورٹ پر تھائی لینڈ کا ویزا نہیں ہے۔ جواب ملا کہ 'کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ اگر انگریزی ہوائی جہاز سے جاتے تو اس ویزا کی بے شک ضرورت پڑتی مگر امریکن ہوائی جہازوں کے مسافروں کو ویزا کی ضرورت نہیں ہے'

اور ایسا ہی ہوا جب ہوائی جہاز بینگ کاک کے ہوائے اڈے پر اترا تو ہم میں سے کسی سے بھی کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوئی حالانکہ اسی وقت ایک انگریزی جہاز اور ایک فرانسیسی ہوائی جہاز کے مسافر بھی اترے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے پاسپورٹ پر ویزا کا معائنہ کرانا پڑا۔ ویسے بھی بینگ کاک کے ہوائی اڈے پر نئے امریکی سامراج کے پھیلتے ہوئے اقتدار کا پورا پتہ چلتا ہے۔ مقامی افسر معمولی سے معمولی امریکن کے سامنے اس طرح بچھے جا رہے تھے جیسے کسی زمانے میں ہندوستانی سرکار پرست 'ٹوڈی' انگریزوں کی خوشامد کرتے تھے۔

بینگ کاک میں کوکا کولا پیتے وقت باتوں باتوں میں بہت سے امریکن مسافروں کو معلوم ہو گیا کہ میں ہانگ کانگ سے اندرون چین بلکہ پیکنگ جا رہا ہوں۔ اس کے بعد تو مجھ پر ہر طرف سے

حیرت اور شبہ کی نگاہیں پڑنے لگیں۔ایک صاحب نے تو مجھ سے پوچھا بھی کہ وہاں کیا کرنے جارہے ہو۔میں نے جواب دیا کہ میں اخبار نویس ہوں۔نئے چین کو دیکھ کر اس کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں۔اس پر ایک اور صاحب نے بڑے مشفقانہ انداز میں میری کمر تھپتھپاتے ہوئے کہا: 'ارے وہ تم کو کچھ دکھائیں گے ہی نہیں۔جانتے نہیں ہو تم ایک کمیونسٹ ملک میں جارہے ہو۔ وہاں کی ہر چیز پر فولادی پردا IRONCURAIN نہیں تو بانس کا پردا BAMBOO CURTAIN ضرور پڑا ہوا ہے'

اس مذاق پر وہ خود ہنس پڑا اور جب ہم ہوائی جہاز میں واپس آئے تو یہ لطیفہ باقی سب مسافروں نے ایک دوسرے کو سنایا اور 'امریکہ' ان کے قہقہوں سے گونج اٹھا اور پیچھے مڑ مڑ کر ہر کوئی مجھے دیکھنے لگا۔ عجیب الخلقت دو ٹانگ کا جانور جو ٹرومین کا امریکہ اور میک آرتھر کا جاپان اور چیانگ کائی شیک کا فادموسا چھوڑ کر ماؤ سے تنگ کے چین جارہا تھا۔' بے چارہ'!

ان کی نگاہیں مجھ پر ترس کھا کر کہہ رہی تھیں' بے چارہ! نہ جانے وہاں اسے کھانے کو بھی کچھ ملے گا یا نہیں' اور پھر ان میں سے چند نگاہوں میں شبہ اور حقارت کی چمک پیدا ہوگئی۔جیسے کہہ رہی ہوں، کہیں یہ کمبخت خود بھی تو کیمونسٹ نہیں ہے' اور اس کے بعد کئی شریف عورتوں نے میری طرف سے پیٹھ موڑ لی اور میں رابرٹ پین کی لکھی ہوئی ماؤ سے تنگ کی سوانح عمری پڑھنے لگا۔

اور اس طرح یہ 'امریکہ' برما اور تھائی لینڈ اور ملایا پر اپنا مہیب سیاہ سایہ ڈالتا چلا گیا......اور سب 'امریکہ' والوں پر دوپہر کے کھانے کے بعد کی غنودگی چھا گئی...... یہاں تک کہ اسٹیورڈ کی گنگناتی ہوئی آواز نے ان سب کو جگا دیا۔ہوائی جہاز سمندر کے کنارے نہایت خطرناک پہاڑیوں کے بیچ میں سے اتر رہا تھا اور اسٹیورڈ اعلان کر رہا تھا:

'OUR NEXT STOP IS HONGKONG CHINA..........'

'(ہمارا اگلا مقام ہانگ کانگ، چین، ہے......') سب نے اپنی اپنی پیٹیاں کس کر اپنے آپ کو کرسیوں سے جکڑ کر محفوظ کرلیا۔اس لیے کہ اس وقت 'امریکہ' نہایت تیزی سے نیچے کی طرف جارہا تھا اور اسی تیزی سے چین کی طرف جارہا تھا اور اسی تیزی سے چین کی سرزمین ہماری طرف اوپر اٹھ رہی تھی۔

○

پستول اور پھول

برطانوی ہانگ کانگ کی سرحد پار کر کے جوں ہی میں نے آزاد جمہوری چین کی سرزمین پر قدم رکھا، پہلے میرا استقبال ایک پستول سے کیا گیا اور اس کے چند منٹ بعد ہی پھولوں سے۔ یہ کیوں اور کیسے ہوا۔ یہ واقعہ دلچسپ بھی ہے اور معنی خیز بھی۔

ہوا یہ کہ ٹائم ٹیبل کے مطابق میرے ہوائی جہاز کو دوپہر سے قبل گیارہ بجے ہانگ کانگ پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ہوائی اڈے سے ہانگ کانگ اور جمہوری چین کی سرحد پچاس میل کے فاصلہ پر ہے۔ راستہ پہاڑیوں میں سے گزرتا ہے اس لیے دشوار گزار ہے۔ پھر بھی زیادہ سے زیادہ مجھے سرحد پر دو بجے تک پہنچ جانا چاہیے اور اسی حساب سے سرحد کی چوکی کے سپاہیوں کو ہدایات دی گئی تھیں۔ سرحد کے قریب کے گاؤں کے نمائندے بھی 'ہندی مہمان' کے استقبال کے لیے ایک بجے سے تین بجے تک سرحد پر کھڑے رہے تھے مگر میرا جہاز دہلی سے پہلے کراچی ہی سے آٹھ گھنٹے لیٹ چلا تھا۔ اس لیے ہم ہانگ کانگ پہنچے پانچ بجے کے بعد بھی۔ 'نیو چائنا نیوز ایجنسی' کے نمائندے مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے چند منٹ ہی میں میرا سامان کسٹم سے پاس کرا کے موٹر میں ڈالا اور موٹر روانہ ہوگئی۔ ہانگ کانگ کے گنجان بازاروں میں سے موٹروں کی رفتار کے سب قاعدے قانون توڑتے ہوئے ہم جلد ہی شہر کے مضافات میں پہنچ گئے مگر اس کے

آگے سڑک پہاڑیوں میں گزرتی ہے اس لیے مجبوراً ڈرائیور کو رفتار ہلکی کرنی پڑی۔ جگہ جگہ برطانوی فوج کی چوکیوں پر ٹھہرنا پڑا۔ آخری چوکی پر پاسپورٹ دکھا کر 'پرمٹ' لینا پڑی۔ اب ایک پہاڑی کی ڈھلان پر جا کر سڑک بند ہوگئی اور ہمیں موٹر سے اترنا پڑا۔ یہاں دو فوجی سپاہی پہرا دے رہے تھے۔ ان کی بات چیت سے اندازہ ہوا کہ ہندوستانی ہیں۔ میں نے ان کے پاس سے گزرتے ہوئے پوچھا 'کیوں بھائی ہندوستانی ہو؟ ان میں سے ایک نے پنجابی لہجے میں جواب دیا 'ہاں جی' ہندوستانی ہی تھے مگر اب تو پاکستانی ہیں میں نے سوچا کمال ہے کہ ہندوستانی اور پاکستان فوجی سپاہی اب تک چین کی سرزمین پر برطانوی علاقے کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اب ہمیں ریل کی پٹری کے کنارے کنارے کوئی دو فرلانگ پیدل چلنا پڑا۔ یہاں ہانگ کانگ سے آنے والی ریل لوووLowu کے اسٹیشن پر ختم ہو جاتی ہے۔ ریل کی لائن پر ہی کانٹے دار تار کی باڑھ بندی ہوئی ہے۔ یہ برطانوی علاقوں کی سرحد ہے۔ اس کے بعد چند گز اُدھر ایک اور کانٹے دار تار کی باڑھ ہے اس کے بعد آزاد جمہوری چین کا علاقہ ہے۔

ہم سورج ڈوبنے کے بعد پہنچے تھے۔ اس لیے دونوں طرف کے دروازے بند ہو چکے تھے اور کل صبح تک کے لیے سرحد پر آنا جانا بند تھا۔ صورت حال سمجھانے پر انگریز فوجی افسر اپنی طرف کا دروازہ کھولنے پر راضی ہوگیا۔ مگر مجھے چڑانے کے لیے کہنے لگا 'ہم تو جانے دیتے ہیں مگر دوسری طرف کیا ہوگا اس کے لیے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ کمیونسٹ لونڈے تمھیں نہیں جانے دیں گے' میں نے جل کر جواب دیا 'تم فکر نہ کرو میں چینی حکومت کا مہمان ہوں'۔

برطانوی دروازہ کھلا۔ پھر بند ہوگیا۔ اب ہم NO MANS LAND میں تھے۔ چند قدم چلنے پر دوسرا دروازہ آیا۔ اس کی حفاظت کے لیے تین نوجوان فوجی سپاہی پہرے پر کھڑے تھے۔ دوسری طرف کھڑے ہوئے انگریز افسروں کی کلف لگی استری کی ہوئی یونیفارم کے مقابلے میں نئے چین کے ان سپاہیوں کی وردیاں میلی اور مسلی ہوئی سی لگیں۔ ہر ایک کے کندھے پر ایک پرانی سی بندوق تھی اور پیٹی میں پستول۔ بالکل لڑکے معلوم ہوتے تھے۔ شاید پندرہ سولہ برس سے زیادہ عمر نہ ہوگی۔ تین نوجوان کسانوں کی اولاد......میلی مسلی ہوئی وردیاں پہنے، پرانی بندوقیں اور پستول لیے، دنیا کے سب سے بڑے ملک کی سرحد کی حفاظت کر رہے تھے......وہ ملک جس کا رقبہ

3,706,581 مربع میل ہے اور آبادی 43 کروڑ ہے اور جس کی تاریخ پانچ ہزار سال لمبی ہے۔

ان نوجوان سپاہیوں کو دیکھ کر میرے دماغ میں چین کی پوری انقلابی تاریخ گھوم گئی۔ ہر دور میں ایسے ہی کسان نوجوانوں نے ظلم اور استبداد کا مقابلہ کیا تھا۔ ہزار برس پہلے جب عوام نے انقلاب کا راستہ دریافت نہ کیا تھا، بادشاہوں اور نوابوں اور زمینداروں کے ظلم اور اپنے افلاس سے تنگ آ کر کسان ڈاکو بن جاتے تھے اور پہاڑیوں میں پناہ لے کر وہاں سے امیروں کے محلوں پر چھاپے مارتے تھے۔ مگر ڈاکو ہونے پر بھی ان کے دل انسانی ہمدردی سے خالی نہیں تھے۔ وہ امیروں کو لوٹ کر غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ ایسے ہی ڈاکوؤں کے بارے میں کئی سو برس پہلے چین کا سب سے مشہور ناول لکھا گیا تھا..... 'سب انسان بھائی بھائی ہیں'..... ALL MEN ARE BROTHERS۔

'سب انسان بھائی بھائی ہیں' انسانیت اور بھائی چارے کا یہ سنہری اصول چین کے انسان دوستوں نے ہزاروں برس پہلے دریافت کرلیا تھا۔ مگر اسے عملی جامہ پہنانے میں کتنی صدیاں لگیں، کتنا خون خرابہ ہوا، اندرونی جبر و استبداد اور بیرونی سامراج کے خلاف عوام کو کتنی ناکام لڑائیاں لڑنی پڑیں، کتنی قربانیاں دینی پڑیں......

مگر اب صدیوں کی انقلابی کش مکش کا پھل مل چکا ہے۔ چینی انقلاب کامیاب اور مکمل ہو گیا ہے اور ان تمام انقلابیوں کے جانشین، یہ تین نوجوان کسان ہیں جو میلی اور مسلی ہوئی، پیوند لگی ہوئی وردیاں پہنے، کندھوں پر پرانی بندوقیں دھرے، پیٹیوں میں دقیانوسی پستول لگائے، اپنے ملک کی، اپنی آزادی اور اپنے انقلاب کی حفاظت کر رہے ہیں۔

یہ سب کچھ ایک پل سے بھی کم میں میرے دماغ میں گھوم گیا۔ اور اسی پل میں جیسے ہی دروازہ کھلا...... اپنے چینی ساتھی کا انتظار کیے بغیر میں نے آزاد جمہوری چین کی سرزمین پر قدم رکھا۔ جی چاہتا تھا کہ اس مبارک موقع کی تقریب میں کسی طرح اپنی خوشی اور جوش کا اظہار کروں 'نیا چین زندہ باد' کے نعرے لگاؤں؟ ناچوں، اچھلوں، کودوں، دوڑوں؟...... سامنے ہی کوئی سو گز پر ریل گاڑی کھڑی تھی۔ ایک اسپیشل ٹرین جو مجھے سرحد سے کینٹن لے جانے والی تھی۔ نہ جانے کیوں میں بے تحاشا اس کی طرف دوڑ پڑا۔ شاید اس لیے کہ میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد میں اس

ٹرین میں سوار ہو جاؤں اور یہ ٹرین چل پڑے اور مجھے کینٹن اور کینٹن سے پیکنگ پہنچا دے۔ مگر میں چند قدم بھی نہ جا پایا تھا کہ ایک کڑی، فوجی آواز کان میں پڑی۔ چینی الفاظ کے معنی تو نہ سمجھ سکا مگر اتنا ضرور سمجھ گیا کہ مجھے ٹھہرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ ٹھٹھک کر میرے قدم رک گئے اور جیسے ہی میں مڑا میں نے ایک پستول کی نالی کو اپنی ناک سے چند انچ کے فاصلے پر پایا۔ گھبرا کر میں ہندوستانی ہی میں بول پڑا"ارے بھائی یہ کیا مذاق ہے، یہ بندوق پستول کبھی کبھی بے بھرے بھی چل جایا کرتے ہیں"پستول کی نالی نے اشارے سے مجھے حکم دیا کہ ایک طرف کو ہو جاؤں اور سپاہیوں کے ساتھ ساتھ چلوں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اسی پل میں حراست میں لے لیا گیا تھا۔

مگر اتنی دیر ہی میں میرے چینی ساتھی جو میرا سامان سرحد کے پار لانے کے سلسلے میں پیچھے رہ گئے تھے وہاں پہنچ گئے اور انھوں نے چینی سپاہیوں کو بتایا کہ یہ بے ڈھب اجنبی چیانگ کائی شیک کا ایجنٹ نہیں بلکہ چینی عوامی حکومت کا مہمان ہے۔ پھر ٹارچ کی روشنی میں میرے پاسپورٹ پر لگی ہوئی چینی سفارت خانے کی مہریں دکھائی گئیں۔ پستول واپس پیٹی میں پہنچ گیا۔ تینوں سپاہیوں کے چہروں پر جھینپی اور شرمندہ سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی اور اس کے بعد تو ہر ایک نے دو دو تین تین بار مجھ سے ہاتھ ملایا۔

اسپیشل ٹرین میں صرف ایک گاڑی تھی۔ اس میں چھ سونے کے کمرے تھے۔ پانچ خالی تھے، صرف ایک میں میرے لیے بستر لگا ہوا تھا۔ میز پر گرم چائے سے بھرا ہوا چائے دان فوراً لا کر رکھ دیا گیا۔ ابھی میرا سامان رکھا جا ہی رہا تھا کہ جنگلی پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے لیے ایک نوجوان لڑکی اور دو نوجوان لڑکے داخل ہوئے۔ وہ تینوں اس سرحدی گاؤں شم چن (SHUMCHUN) کے نمائندے تھے۔ ایک مزدور یونین کا نمائندہ، ایک طالب علموں کا نمائندہ اور لڑکی عورتوں کی انجمن کی نمائندہ۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ وہ لڑکی گاؤں کے اسپتال میں نرس ہے۔ دونوں لڑکے اور لڑکی تینوں نیلے رنگ کے بند گلے کے کوٹ اور پتلون اور ٹوپیاں پہنے تھے جو نئے چین کے کارکنوں کی وردی ہے اور جسے ریل کے خلاصی سے لے کر چیئرمین ماؤ سے تنگ تک ہر کوئی پہنتا ہے۔

بعد میں وفد کے دوسرے اراکین کے ساتھ کتنے ہی بڑے بڑے جلسوں میں شریک ہوا، جہاں غیر ملکی مہمانوں کا استقبال بڑی شان سے، قیمتی پھولوں اور بینڈ باجوں اور جھنڈوں اور

گانوں اور ناچوں اور تالیوں سے کیا گیا۔ مگر اپنے خلوص اور سادگی اور بے ساختگی کے لیے مجھے شم چن کا یہ استقبال ہمیشہ یاد رہے گا۔ ان تینوں نوجوان نمائندوں میں سے کسی کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ مگر ان کی مسکراہٹ، ان کی آنکھوں کی چمک، ان کے ہاتھوں کی گرمی جس محبت اور خلوص سے میرا استقبال کر رہی تھی اسے الفاظ کی ترجمانی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

تھوڑی دیر ہی میں یہ میرے نئے دوست رخصت ہو گئے اور ریل روانہ ہو گئی۔ اسی راستے سے چالیس برس پہلے سن یات سین انقلاب برپا کرنے ہانگ کانگ سے کینٹن گئے تھے۔ کینٹن جنوبی چین کی راجدھانی جہاں چینی انقلاب 1911 میں شروع ہوا اور جہاں 1949 کے اخیر میں چینی انقلاب کی تکمیل ہوئی اور کل ہوائی جہاز سے میں پیکنگ پہونچ جاؤں گا اور دس گھنٹے میں وہ تاریخی راستہ طے کرلوں گا جسے طے کرنے میں چینی انقلابیوں کو چالیس خونی سال گزارنے پڑے۔ یہ سوچتا ہوا میں سو گیا..... مگر ان جنگلی پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو رات بھر میری نیند کو معطر کرتی رہی۔

○

ماؤ سے تنگ کے مہمان

پیکنگ پہنچنے کے اگلے دن ہی چینی زبان میں چھپا ہوا ایک دعوت نامہ ملا۔ سرخ کاغذ جیسا کہ تہذیب کے رسم ورواج کے مطابق شادی بیاہ کے دعوت ناموں میں استعمال ہوتا ہے۔ سرخ کاغذ اور اس پر سنہری الفاظ چھپے ہوئے تھے۔ بڑا سا پھولدار لفافہ! اپنی میز پر یہ دعوت نامہ پا کر میں ششدر رہ گیا۔ پہلے سوچا کیا کسی کی شادی ہے جو یہ بلاوا آیا ہے۔ پھر سوچا، بھلا سرخ چین میں کون اپنی شادی میں ان پرانے رسم ورواج سے کام لے گا؟ خیر، چلو کوانگ سے پوچھتے ہیں۔

کوانگ پیکنگ ہوٹل کا (جہاں ہم ٹھہرائے گئے تھے) ایک بیرہ ہے۔ بارہ پندرہ برس سے اس ہوٹل میں کام کرتا ہے۔ گورا چٹا، لمبا چوڑا، ہنس مکھ، اونچا ماتھا، دھیمی شیریں آواز۔ اپنی سفید داڑھی میں بیرہ نہیں کوئی ڈاکٹر یا پروفیسر معلوم ہوتا ہے۔ کوانگ ہوٹل کا ملازم ہے، ہوٹل چینی سرکار کا ہے، سرکار جنتا کی ہے۔ اس لیے کوانگ اپنی قومی سرکار کا ملازم ہے۔ جنتا کا خادم ہے۔ آپ کا یا میرا یا ہوٹل میں کسی ٹھہرنے والے کا نجی ملازم نہیں ہے۔ وہ کبھی بخشش نہیں مانگتا۔ کبھی انعام کے لیے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ کبھی خوشامدانہ لہجے میں گڑگڑا کر بات نہیں کرتا۔ کبھی کمر دہری کر کے جھک جھک کر سلام نہیں کرتا۔ پرانے زمانے کے چینی خادم کی طرح کسی کو 'مالک' اور 'ماسٹر' تو کیا 'سر' بھی نہیں کہتا۔ لیکن وہ اپنا کام بڑی محنت سے، بڑی چستی سے، بڑی مسرت سے کرتا ہے۔ جوتوں پر

پالش کرتا ہے۔ پینے کے لیے ٹھنڈا پانی لا کر رکھتا ہے۔ صبح سویرے چائے لاتا ہے۔ اخبار لاتا ہے۔ غسل خانہ صاف کرتا ہے۔ نہانے کے لیے گرم پانی کا انتظام کرتا ہے۔ پینے کے لیے ٹھنڈا پانی لا کر رکھتا ہے۔ صبح ہر کمرے میں پھلوں کی پلیٹ رکھ جاتا ہے۔ شام کو اس میں پڑے ہوئے چھلکوں کو بٹور کر لے جاتا ہے۔ رات کو جب بھی ہم لوٹیں ہماری دیکھ بھال کے لیے جاگتا رہتا ہے اور سونے سے قبل ہمیں گرم گرم کوکو پلاتا ہے اور ہاں جب فرصت ملتی ہے تو ہم میں سے کسی کے کمرے میں آ کر دلچسپ باتیں کرتا ہے۔ اپنے اور اپنے بچوں کے بارے میں، چین کے بارے میں، انقلاب کے بارے میں! ایک دن کہنے لگا 'اگر انقلاب نہ آتا تو بھلا ہماری زندگی بھی کبھی بدل سکتی تھی؟'

میں نے اس سے پوچھا 'کیوں، کیا انقلاب کے بعد تمہاری تنخواہ بڑھ گئی ہے؟'

اس نے کہا 'نہیں، تنخواہ تو اتنی ہی ہے جتنی کہ پہلے تھی'

میں نے کہا 'پھر تمہاری حالت بہتر کیسے ہوئی؟'

''اس طرح کہ پہلے تنخواہ تو اتنی ہی ملتی تھی لیکن چیزوں کی قیمتیں ہر روز بڑھتی تھیں۔ اور آخری دنوں میں تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ تنخواہ میں سے سوکھے چاول کھا کر بھی گزارا نہ ہوسکتا تھا۔ اب چیزوں کی قیمتوں پر کنٹرول ہے۔ اس کے علاوہ ہماری تنخواہ کو سکوں میں نہیں ضروریات زندگی یعنی چاول، تیل، کوئلہ، نمک اور کپڑے کی اکائیوں میں دیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی بھی قیمت بڑھ جائے تو ہماری تنخواہ خود بخود بڑھ جاتی ہے''۔

اور میں نے سوچا، ہمارے یہاں مہنگائی الاؤنس مقرر کروانے اور بڑھوانے کے لیے کارخانے کے مزدوروں اور دفتر کے کلرکوں کو کتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ کتنی درخواستیں بھیجنا پڑتی ہیں۔

میں نے پوچھا 'کوانگ! تمہاری تنخواہ کیا ہے؟'

'ستر یونٹ (اکائیاں) ماہوار!' (تقریباً ستر روپے)

'یہ تو کچھ زیادہ نہ ہوئی'

'آپ کو چیئرمین ماؤ سے تنگ کی تنخواہ کا علم ہے؟'

'نہیں تو، کیا ہے؟'

'صرف سات سو یونٹ ماہوار' (تقریباً سات سو روپے)

میں نے سوچا کہوں 'ارے واہ! پینتالس کروڑ آزاد انسانوں کے جمہوری ملک کے وزیر اعظم کی تنخواہ صرف سات سو روپے ماہوار! اتنی تنخواہ تو ہمارے یہاں ڈپٹی کلکٹروں اور سرکاری دفتروں کے سینیئر سپرنٹنڈنٹوں کو ملتی ہے' لیکن میں یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ بے چارا کوانگ ہمارے یہاں کے ڈپٹی کلکٹروں اور سپرنٹنڈنٹوں کے مرتبے کو نہ سمجھ سکے گا۔

اس نے پھر کہا 'تنخواہ ہی سب کچھ تھوڑا ہوتی ہے مسٹر عباس! اس کے ساتھ اس کا بھی حساب لگائیے کہ مجھے ہوٹل میں کھانا مفت ملتا ہے۔ بچا کھچا جوٹھا کھانا نہیں بلکہ وہی سفید چاول جو آپ سب مہمان کھاتے ہیں۔ ساتھ میں گوشت، مچھلی، ترکاری! پھر میرے سب بچے اسکول جاتے ہیں۔ انھیں کوئی فیس نہیں دینی پڑتی۔ انھیں کتابیں، کاپیاں، سلیٹیں بھی اسکول سے مفت ملتی ہیں۔ یا میرے خاندان میں کوئی بھی بیمار ہو جائے تو ہوٹل کی طرف سے اس کا علاج مفت ہوتا ہے۔ چاہے اس میں ڈاکٹر کتنی ہی قیمتی دوائیں، انجکشن وغیرہ کیوں نہ تجویز کرے۔ پھر میری بیوی ایک کارخانے میں کام کرتی ہے وہ مجھ سے بھی زیادہ کماتی ہے۔ جب سے نئی سرکار نے قیمتیں کم کر دی ہیں ہم خوب اچھی طرح گزارا کر سکتے ہیں۔ کبھی کبھی سنیما یا اوپیرا بھی دیکھ سکتے ہیں'۔

'اوپیرا؟' میں نے حیرانی سے دہرایا۔ یقین نہ آتا تھا کہ ہوٹل کا ایک بیرا اور اوپیرا کا ذکر کرے!

'جی ہاں اوپیرا— مجھے مائیلنگ فان کا اوپیرا بہت پسند ہے۔ آج کل کے گانے والوں کی آواز میں ان استادوں جیسا جادو کہاں ہے؟'

میں نے سوچا، جب ہوٹل کے بیرے اوپیرا کے سنگیت کو پرکھنے کے قابل ہیں تو اس کو بھی جادو ہی سمجھنا چاہیے۔ انقلاب کا جادو!

ہاں! تو جب وہ دعوت نامہ ملا تو میں نے کوانگ کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ جب وہ آیا تو میں نے پوچھا 'کوانگ! تمھیں پڑھنا آتا ہے؟'

'انقلاب سے پہلے میں بالکل ان پڑھ تھا لیکن اب لکھ پڑھ سکتا ہوں'

'تم اتنا کام کرتے ہو۔ بھلا تمھیں پڑھنے کے لیے کون سا وقت ملتا ہے؟'

'رات کو جب آپ لوگ سو جاتے ہیں تو میں ایک گھنٹہ پڑھتا ہوں اور ایک گھنٹہ دوپہر کے کھانے کے بعد جب آپ لوگ باہر جاتے ہیں یا آرام کر رہے ہوتے ہیں'

'بہت خوب! تو یہ دعوت نامہ پڑھ کر بتاؤ، کہاں سے آیا ہے؟' یہ کہہ کر میں نے وہ سرخ اور سنہرا کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس پر نظر ڈالتے ہی کوانگ کی باچھیں کھل گئیں۔ خوشی کے مارے اس کے دانت باہر نکل آئے۔

'چیرمین نے آج رات کو آپ سب کو کھانے پر بلایا ہے'۔

'چیرمین نے؟'

'ہاں چیرمین ماؤ سے تنگ نے۔ کل پہلی اکتوبر کو جشن جمہوریت ہے نا؟ اسی خوشی میں چیرمین ماؤ نے یہ دعوت دی ہے۔ آپ لوگ جائیں گے نا؟'

میں نے کہا 'ضرور ضرور، کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ماؤ سے تنگ ہمیں کھانے پر بلائے اور ہم نہ جائیں؟'

باقی سارا دن اس دعوت کی تیاریوں میں گزرا۔ سوٹ کیسوں میں سے چوڑی دار پاجامے نکالے گئے۔ شیروانیوں پر استری کروائی گئی۔ کالے جوتوں کو پالش سے چمکایا گیا۔ دعوت کا وقت آٹھ بجے تھا۔ مقررہ وقت پر سب ہوٹل کے بڑے کمرے میں جمع ہوئے۔ ہم پندرہ ہندوستانیوں کے علاوہ باقی تمام ڈیلیگیٹ بھی روسی، برمی، انڈونیشیائی، کورین، ویت نامی، پاکستانی، ہنگرین، چیکوسلواکین، منگولین اپنے اپنے قومی لباس میں تھے۔ ہماری شریمتی سین کی سرخ ساڑی پر سب کی نظریں تھیں۔

ہر موٹر پر دو مہمان، ایک ترجمان، ایک ڈرائیور سوار ہوئے۔ چالیس موٹروں کا یہ قافلہ سوا سات بجے پیکنگ ہوٹل سے روانہ ہوا۔ سارا شہر دئیوں سے جگمگا رہا تھا۔ سڑکیں اور بازار جشن میں حصہ لینے والوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے گا رہے تھے، ناچ رہے تھے۔ ریڈیو کے لاؤڈ اسپیکر قومی ترانے اور 'یانگ کو' رقص کی دھنیں براڈ کاسٹ کر رہے تھے۔

اس ہجوم میں سے گذرتا ہوا ہمارا کارواں پونے آٹھ بجے ایک محل کے عالیشان دروازے

پر رک گیا۔ اس محل میں پہلے، مانچو بادشاہ رہتے تھے پھر چیانگ کائی شیک اور اب یہاں چین کی مرکزی سرکار کے دفاتر ہیں اور اسی جگہ خاص خاص موقعوں پر سرکاری دعوتیں ہوتی ہیں۔

ماؤ سے تنگ کی طرف سے ہمارا خیر مقدم مرکزی حکومت کے باقی تمام وزیروں نے کیا۔ اندر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ روشنیوں سے جگمگاتا ہوا ایک بہت بڑا عالیشان ہال کمرہ پہلے ہی سے کئی ہزار مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ میزوں پر خوب صورت اور بیش بہا چینی کے برتن سجے ہوئے ہیں۔ چمکتے ہوئے بلّور کے شراب کے گلاس رکھے ہوئے ہیں۔ اتنے مہمانوں کے لیے کرسیاں رکھنے کی جگہ تو بھلا کہاں تھی۔ سب کھڑے تھے اور کھڑے کھڑے ہی کھانا ہونے والا تھا۔ لیکن اس بھیڑ کو دیکھ کر ہم نے سوچا، اتنے لوگ تو یہاں پہلے سے بھرے ہوئے ہیں ہمیں کہاں جگہ ملے گی؟ ہال کے دونوں طرف دو پتلی پتلی گیلریاں تھیں۔ ان میں سے ایک میں ہمارے لیے کھانے کی میزیں لگی ہوئی تھیں۔

میں نے سوچا ماؤ سے تنگ بھی ہمارے ساتھ یہیں کھانا کھائیں گے لیکن ایک چینی دوست نے ہال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا 'نہیں وہاں کھائیں گے' ہال کی طرف کی گیلری میں دوسرے ملکوں کے سفیروں کے لیے بھی میزیں لگائی گئی تھیں۔ میں سمجھا میرے دوست کا اشارہ اس طرف ہے۔ میں نے کہا 'اچھا! وہ سفیروں کے ساتھ کھانا کھائیں گے'

میرے دوست نے سر ہلا کر انکار کیا 'نہ آپ لوگوں کے ساتھ اور نہ سفیروں کے ساتھ۔ بلکہ ان لوگوں کے ساتھ جو ہال کے بیچ میں ہیں'

'لیکن یہ لوگ ہیں کون؟' میں نے پوچھا کیونکہ اتنی دور سے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ نیلے نیلے کپڑے پہنے ہوئے مہمان کون ہیں۔

'یہ ہمارے قومی بہادر ہیں۔ انقلابی جنگوں کے بہادر ہیں۔ مختلف گاؤں کے معزز کسان ہیں جنھوں نے اپنی محنت اور ہوشیاری سے پیداوار بڑھا کر دوسرے کسانوں کے لیے مثال قائم کی ہے۔ کارخانوں کے بہترین مزدور ہیں جنھوں نے پیداوار بڑھانے میں نام کمایا ہے۔ ریلوے میں کام کرنے والے ہیں۔ اسکولوں میں پڑھانے والے اُستاد ہیں۔ یہ سب اس جشن کے لیے خاص طور پر بُلائے گئے ہیں۔ اصل میں یہ دعوت انھیں کے لیے دی جارہی ہے۔'

'ایک لمحہ کے لیے تو اپنی خودداری کو ٹھیس لگی۔ خوب! تو اصل مہمان ہم نہیں۔ یہ لوگ ہیں۔ ہم تو جیسے ان کے پچھلگو ہوئے، لیکن فوراً ہی اس انوکھے موقع کی اصلی اہمیت میرے دماغ میں بجلی کے مانند کوند گئی۔ کسان مزدور راج کی باتیں تو کرتے ہیں۔ میں نے بھی مختلف موقعوں پر کسان مزدور راج کے آدرش میں اپنے یقین کا اعلان کیا ہے لیکن یہاں اس ہال میں چین کی سرکار نے اپنے کسانوں اور مزدوروں کو سب سے اہم جگہ دے کر کسان مزدور راج کا اصل ثبوت دے دیا تھا۔ اس سماج میں سچ مچ جنتا حاکم ہے۔ جنتا ہی سرکار کا مرکز ہے۔

دوسرے وزیروں کے ساتھ ماؤ سے تنگ آئے اور اپنے خاص مہمانوں کے بیچ میں اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے (کرسی نہ ان کے لیے تھی اور نہ کسی مہمان کے لیے) سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ گیلری میں دوربین کے ذریعہ ہم نے دیکھا کہ ماؤ سے تنگ بہت خوش نظر آرہے ہیں، مسکرا رہے ہیں اور اپنے اردگرد کے خاص مہمانوں میں جن کو ذاتی طور پر جانتے ہیں ان سے باتیں کر رہے، ان سے ہاتھ ملا رہے ہیں، ان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر رہے ہیں، خود ہنس رہے ہیں اور انھیں ہنسا رہے ہیں۔

اب دوسرے مہمانوں کے تعارف کی باری آئی۔ سامنے والی گیلری سے سفیروں کا جلوس نکلا۔ سب سے پہلے روس کے سفیر اور روسی سفارت خانوں کے دوسرے لوگ! اس کے بعد ہمارے پانیکر صاحب ان کے ــــ کمار پھر دوسرے سفارت خانوں کے لوگ! باری باری ہر ایک نے ماؤ سے تنگ، مادام سن یات سین جنرل، چوڑے (CHUDE) اور دوسرے وزیروں سے ہاتھ ملائے۔ دو چار باتیں کیں اور پھر پورے ہال کے گرد گھوم کر واپس اپنی گیلری میں پہنچ گئے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ روس کے سفیر کے بعد سب سے زیادہ پرجوش خیر مقدم ہندوستانی سفیر کا ہوا۔ جب تک پانیکر صاحب اپنی جگہ پر واپس نہیں پہنچ گئے برابر تالیاں بجتی رہیں۔

پھر ہماری باری آئی۔ آگے آگے روس سے آیا ہوا ڈیلی گیشن، اس کے بعد ہمارے لیڈر پنڈت سندر لال اور ہم لوگ۔ ماؤ سے تنگ نے ہم میں سے سب کے ساتھ بڑے جوش سے ہاتھ ملایا۔ ترجمان کے ذریعہ پنڈت سندر لال سے کچھ باتیں بھی کیں۔ پندرہ سولہ برس ہوئے پہلی بار میں نے امریکی ماہنامہ 'ایشیا' میں ماؤ سے تنگ کا نام پڑھا تھا۔ پھر ایڈگر سنو کی کتاب

'ریڈ اسٹار اور چائنا' میں ماؤ سے اور چو دے اور ان کے انقلابی ساتھیوں کے پورے حالات پڑھے تھے۔ ہاتھ ملاتے ہوئے میں نے سوچا، تو یہ ہیں ماؤ سے تنگ! چوڑا چکلا بھرا ہوا شیر جیسا چہرہ، گوری رنگت، گلابی گال، اونچا ماتھا، گھنے گہرے سیاہ بال۔ خاصے بھاری بھرکم ہوتے ہوئے بھی چہرے میں ایک خاص نرمی اور نزاکت...... بلکہ جذباتیت جیسی کہ شاعروں میں پائی جاتی ہے۔ تو یہ ہیں ماؤ سے تنگ — ایک کسان کی اولاد، عالم، فلسفی، شاعر، انقلابی، جنگجو اور عوام کا محبوب لیڈر۔ مدت تک چیانگ کائی شیک کی سرکار اسے ڈاکو اور لٹیرے کے خطاب دیتی رہی۔ اس نے برسوں اپنی انقلابی فوج کے ساتھ جنگلوں، پہاڑوں، گپھاؤں اور کسانوں کے جھونپڑوں میں کاٹ دیے۔ نہ جانے کتنی بار چیانگ کی فوج سے جنگ ہوئی۔ توپوں اور مشین گنوں اور بمبار ہوائی جہازوں کا مقابلہ لاٹھیوں اور بندوقوں سے کیا۔ نہ جانے کتنی بار ہار کر بھی شکست نہ مانی۔ نہ جانے کتنی بار اس کی فوجیں تتر بتر ہو کر پھر اکٹھی ہوئیں۔ نہ جانے کتنی بار جنگلوں میں وہ مرنے سے بال بال بچا۔ نہ جانے اپنے انقلابی ساتھیوں کے ساتھ کتنے دن اس نے بھوکے رہ کر گذار دیے نہ جانے اپنی فوجوں کے ساتھ اس نے کتنے ہزار میل پیدل سفر کیا۔ یوں تو دنیا میں ہر بڑے انقلابی لیڈر نے اپنی زندگی میں دُکھ اٹھائے ہیں۔ واشنگٹن نے انگریزوں کے خلاف امریکہ کی جنگ آزادی لڑی۔ لینن کو خانہ جنگی کرنی پڑی۔ لینن اور اسٹالن برسوں بے گھر رہے۔ گاندھی اور نہرو نے کتنی ہی بار جیل یاترا کی۔ گاندھی جی نے کتنی ہی بار بھوک ہڑتال کر کے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔ اور آخر میں امن اور اتحاد کے لیے سینے پر گولیاں کھا کر شہید بھی ہو گئے۔ لیکن دنیا کی تاریخ میں کسی لیڈر نے بھی اتنی مشکلات اور مصیبتیں نہ اٹھائی ہوں گی جتنی گزشتہ بیس برس میں ماؤ سے تنگ نے برداشت کی ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اتنے برسوں کی ریاضت کے نشانات ضرور اس کے چہرے پر موجود ہوں گے۔ شاید جھریاں پڑ گئی ہوں۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے ہوں۔ بال سفید ہوں۔ رنگ سیاہ پڑ گیا ہو لیکن پچپن برس کی عمر میں آج بھی ماؤ سے تنگ جوان اور تنومند نظر آتے ہیں۔ روشن چوڑے ماتھے اور بھرے ہوئے گالوں پر نام کو بھی کوئی لکیر نہیں۔ آنکھوں میں جوانی کی چمک ہے۔ ہونٹوں پر جوانی کی مسکراہٹ ہے۔ ہاتھ میں جوانی کی گرمی اور جوش ہے۔

تو یہ ہیں ماؤ سے تنگ!

یہ تمام خیالات ایک لمحہ میں میرے ذہن میں گھوم گئے۔ ہاتھ ملاتے وقت نہ جانے میں نے کیا کہا۔ نہ جانے ماؤ سے تنگ نے کیا کہا۔ اس چہرے کی تاریخی اہمیت کے احساس سے میرے دماغ ہی نہیں سارے تن بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ کانوں میں ایک گونج سی سنائی دے رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ماؤ سے تنگ کے چہرے میں ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے چہرے گڈمڈ ہوئے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں ایک انسان سے نہیں پینتالیس کروڑ انسانوں سے ایک ہی وقت میں ہاتھ ملا رہا ہوں۔

اب مجھے پورا چکر کاٹ کر اپنی جگہ واپس پہنچنا تھا۔ ہال ہندوستانی ڈیلی گیشن کے خیر مقدم میں ابھی تک تالیوں سے گونج رہا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ سب چہرے میری آنکھوں کے فوکس میں آتے جا رہے تھے۔ 'تو یہ ہیں ماؤ سے تنگ کے مہمان' میں نے سوچا۔ کسانوں کے دھوپ میں جھلسے ہوئے چہرے مسکرا رہے تھے۔ ہلوں اور کدالوں اور ہتھوڑوں اور بندوقوں کو اٹھانے والے بڑے بڑے بھدے سے سخت ہاتھ نازک بلّوری گلاس اٹھا اٹھا کر 'ہمارا جام صحت' پی رہے تھے۔ ایک بڑھیا جس کے چہرے پر جھرّیوں کا جال بچھا ہوا تھا ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ ہاتھ ملا رہی تھی۔

'تو یہ ہیں ماؤ سے تنگ کے مہمان' انقلابی جنگ کے مہان سورما! مکدن اور ٹن سن کے لوہے کے کارخانوں کے مزدور۔ شنگھائی کی کپڑے کی ملوں میں کام کرنے والی لڑکیاں۔ شمالی اضلاع کے لمبے چوڑے تگڑے کسان، ریلوے کے انجن ڈرائیور اور فائر مین۔ ایک بڑھیا جس نے اپنے پانچ بیٹے انقلاب کی نذر کیے تھے۔ ایک کان کھودنے والا مزدور جس کے جسم پر چھ زخموں کے نشان ہیں اور جس کے سینے پر چھ تمغے جگمگا رہے ہیں۔ یہ مزدور اور کسان صرف ایک دن کی نمائش کے لیے یہاں نہیں...... ان میں سے ہر ایک اپنے گاؤں یا اپنے شہر یا اپنے ضلع میں ایک ذمہ دار اور مانی ہوئی حیثیت رکھتا ہے یا رکھتی ہے۔ ان کسانوں اور مزدوروں میں سے کتنے مرکزی پارلیامنٹوں...... کے اراکین ہیں، کتنے اپنے اضلاع کی پارلیامنٹوں کے اراکین ہیں۔ کتنے ہی اپنے کارخانوں میں 'ہیرو' کا رتبہ حاصل کر چکے ہیں۔ کتنے ہی قومی فوجی کے دستوں کے کمانڈر ہیں۔ کتنے ہی ماؤ سے تنگ کے پرانے انقلابی ساتھی ہیں۔ اور ان کے ساتھ نہ جانے

کتنی انقلابی لڑائیوں میں شامل ہو چکے ہیں۔تو یہ ہیں ماؤ سے تنگ کے خاص مہمان۔جن کی وجہ سے وزیروں اور سفیروں کو کونے میں جگہ دی گئی ہے۔میں واپس لوٹ کر اپنی گیلری میں آیا ہی تھا کہ ایک بوڑھے کسان نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا کر مجھے روک لیا۔خوب زور وشور سے ہاتھ ملانے کے بعد اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی خوب صورت چینی کی پلیٹ اور بلّور کے گلاس کو اٹھایا اور میری طرف اشارہ کرکے کچھ کہنے لگا۔میں نے اپنی ترجمان سے پوچھا 'یہ کیا کہتا ہے؟'

اس نے بتایا کہ وہ کسان جو کلدن کے پاس کے ایک گاؤں سے آیا ہے کہہ رہا ہے کہ 'ہندوستانی دوست! ان برتنوں کو دیکھتے ہو۔کبھی ان میں بادشاہ مانچو کھانا کھایا کرتے تھے۔اب ان میں ہم کھانا کھا رہے ہیں—ماؤ سے تنگ کی مہربانی سے'

اور اس کا یہ فقرہ اس دعوت کے دوران (میں) تمام وقت میرے دماغ میں گونجتا رہا۔

آدھی رات کے قریب ہم واپس اپنے ہوٹل میں پہنچے۔کوانگ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے کوکو تیار کی اور ہر ایک کمرے میں کوکو کا گلاس پہنچایا۔مجھے کوکو دینے کے بعد وہ وہاں کھڑا رہا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔

'کہو کوانگ کیا ہے؟'۔میں نے پوچھا۔

وہ ایک عجیب انداز سے مسکرایا جیسے کچھ مانگنا چاہتا ہو لیکن ہچکچا رہا ہو۔میں نے سوچا، شاید کچھ انعام چاہتا ہے لیکن مانگتے ہوئے جھجک رہا ہے۔

'کیوں کوانگ! کیا چاہیے؟' اور یہ کہہ کر میں نے کچھ سکّے نکالنے کے لیے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔

'صرف آپ سے ہاتھ ملانا چاہتا ہوں' اس نے جلدی سے کہا اور میں نے شرمندہ ہو کر اپنا ہاتھ تکیے کے نیچے سے نکال لیا اور کوانگ کی طرف بڑھایا۔اس نے زور سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے مسکرا کر کہا 'آپ چیئرمین ماؤ سے ہاتھ ملا کر آ رہے ہیں نا'؟

○

جنت کا دروازہ

پہلی اکتوبر 1951

رات کو ماؤ سے تنگ کی دعوت سے کافی دیر سے لوٹے تھے اس لیے نیند گہری تھی۔ مگر ابھی اندھیرا ہی تھا کہ کوانگ نے اٹھا دیا۔

'اٹھیے آج پہلی اکتوبر ہے'

'ہاں بھئی ہو گی' یہ کہہ کر میں نے کروٹ بدلی۔ کمبل کو اور زور سے لپیٹ لیا اور پھر سونے کی تیاری کی۔

مگر کوانگ نے کھڑکی کھول دی اور سائبیریا کی طرف سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کمبلوں کی تہوں میں سے ہوتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی تک پہنچ گئی۔ غسل خانے میں سے ٹب میں پانی گرنے کی آواز آنے لگی اور جب پلنگ کے قریب رکھی ہوئی میز پر چائے کی کشتی ایک ہلکی سی جھنکار کے ساتھ رکھی گئی تو مجھے اٹھنا ہی پڑا مگر ابھی تک دماغ نیند کے جال میں الجھا ہوا تھا۔

'کوانگ۔ رات کو دیر میں سوئے تھے۔ ذرا دیر تو اور سونے دیا ہوتا'

'آپ کی مرضی۔ مگر دیر ہو گئی اور آپ وقت پر 'تین آن من' نہ پہنچ پائے تو آپ پریڈ نہ دیکھ سکیں گے۔ آج پہلی اکتوبر ہے نا؟'

پہلی اکتوبر! پریڈ! 'تین آن من'!

دفعتاً میرا سویا ہوا دماغ جاگ اُٹھا اور گرم گرم بستر کو لات مار کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ سیدھا کھڑکی کی طرف بھاگا۔

سارے شہر میں ریشمی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ نئے چین کے انقلابی لال جھنڈے۔ ان پر چمکتے ہوئے سنہری ستارے، مکانوں، ہوٹلوں، دکانوں پر، ٹراموں، بسوں، موٹروں پر، ہر جگہ یہ ریشمی لال جھنڈے لہرا رہے تھے مگر صرف سُرخ رنگ کے جھنڈے ہی نہیں جگہ جگہ دوسرے رنگوں کے جھنڈے بھی لہرا رہے تھے۔ پیلے جھنڈے، نیلے جھنڈے، گلابی جھنڈے، دھنک کے سب رنگوں کے جھنڈے۔

میں نے کوانگ سے پوچھا 'یہ دوسرے رنگوں کے جھنڈے کن پارٹیوں کے ہیں؟'

وہ مسکرا کر بولا 'یہ کسی پارٹی کے نہیں ہیں صاحب، یہ صرف خوشی کے جھنڈے ہیں۔ آج ہمارے انقلاب کی دوسری سالگرہ ہے نا؟'

پہلی اکتوبر! نئے چین کا جشن جمہوریت۔ دو سال پہلے اسی دن، اسی شہر پیکنگ میں ماؤ سے تنگ نے اعلان کیا تھا کہ 'تاریخ گواہی دے گی کہ آج کے دن چین کے عوام، دنیا کی چوتھائی آبادی، اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے'

'کوانگ' میں نے پوچھا 'پریڈ کتنے بجے شروع ہوگی؟'

'پریڈ تو دس بجے شروع ہوگی۔ مگر آپ کو نو بجے سے پہلے 'تین آن من' پہنچ جانا چاہیے۔ نہیں تو سڑک پر بھیڑ کی وجہ سے راستہ نہیں ملے گا'

'اوہ یہ بات ہے' میں غسل خانے کی طرف دوڑا اور گھبراہٹ میں ٹھنڈے پانی کی ٹونٹی کھول کر فوارے کے نیچے سر کرتے ہوئے کپکپاتی آواز میں چلایا 'کوانگ 'تین آن من' سے کہو میرا انتظار کرے میں ابھی آیا'۔

'تین آن من' (فردوسِ امن کا دروازہ) پیکنگ شہر کا مرکز ہے۔ یہ مانچو شہنشاہوں کے پرانے محل کا شاندار دروازہ ہے جس کے اوپر کی بالکنی سے وہ سامنے کے میدان میں اپنی فوجوں کا معائنہ کیا کرتے تھے۔ شہنشاہ کے وزیر، درباری یا دوسری سلطنتوں کے ایلچی اسی دروازے سے محل میں داخل ہوتے تھے اور انھیں شہنشاہ کی تعظیم کے لیے زمین پر ماتھا ٹیک کر چاروں ہاتھ پاؤں پر رینگنا پڑتا تھا اور اگر کوئی بھولا بھٹکا کسان غلطی سے محل کی دیواروں کے قریب دیکھ بھی لیا جاتا تو اسے

فوراً قتل کر دیا جاتا تھا۔ان دنوں 'فردوس امن' کا یہ دروازہ عوام کے لیے ظلم کے جہنم کا دروازہ تھا۔
مانچو شہنشاہیت ختم ہو چکی ہے۔ مانچو TYRANTS کے جانشین چیانگ کائی شیک کی جھوٹی جمہوریت بھی ختم ہو چکی ہے۔مگر 'تین آن من' کی خوب صورت اور شاندار عمارت اب تک قائم ہے۔اس دروازے کی تصویر نئے چین کے قومی نشان میں رکھی گئی ہے، اس لیے کہ 'تین آن من' چینی تمدن، چینی فن تعمیر اور چینی آرٹ کا حسین نمونہ ہے۔یہ تمدن اور یہ آرٹ، یہ محل اور یہ شاندار دروازہ آج چینی عوام کی ملکیت ہیں۔ نئے چین کے معماروں نے اپنے قومی روایاتی تمدن کی وراثت کو ٹھکرایا نہیں، اپنایا ہے۔اسے بادشاہوں اور نوابوں اور زمینداروں کے محلوں سے نکال کر کسانوں کے جھونپڑوں میں بکھیر دیا ہے۔
'تین آن من' نے چین کی تاریخ کے کتنے ہی یادگار لمحے دیکھے ہیں۔اسی دروازے کے سامنے 4 مئی 1919 کو پیکنگ کے وطن پرست طالب علموں نے چینی حکومت کے جاپانی پٹھو وزیروں کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا جس نے سارے ملک میں انقلابی آگ لگا دی 'چار مئی تحریک' ہی کا نتیجہ تھا کہ ایک بار ناکام ہو کر ڈاکٹر سن یات سین کی انقلابی کوششیں پھر کامیاب ہوئیں اور کینٹن میں نئی انقلابی حکومت قائم ہوئی۔
اور پہلی اکتوبر 1949 کو اسی مقام پر اسی 'جنت کے دروازے' کے اوپر کی بالکنی سے، ایک کسان کے بیٹے ماؤ سے تنگ نے اعلان کیا کہ انقلابی فوجوں کی کامیابی کے بعد چین میں ایک نیا جمہوری راج قائم ہو گیا ہے۔
آج 'تین آن من' اس جمہوری راج کی دوسری سالگرہ کا جشن دیکھ رہا ہے۔
اسی بالکنی پر جہاں کبھی شہنشاہ اور ان کے درباری زرق برق ریشم اور کمخواب کے لباس پہن کر اپنی فوجوں کی سلامی لیتے تھے۔آج صدر جمہوریت 'چیر مین' ماؤ سے تنگ اور حکومت کے دوسرے وزیر کھڑے ہیں۔سب کے سب معمولی کپڑے کی وردیاں پہنے ہوئے۔ان میں جنرل چودے (CHUDE) انقلابی فوجوں کے کمانڈر بھی موجود ہیں جو پچیس برس سے ماؤ سے تنگ کے دست راست رہے ہیں اور مادام سن یات سین جو اپنے مرحوم شوہر کی انقلابی روایات کو اب تک زندہ کیے ہوئے ہیں۔اس بلند بالکنی کے دائیں بائیں تماشائیوں کے لیے دو سیڑھی نما گیلریاں بنائی گئی

ہیں۔ایک میں غیر ملکی سفارت خانوں کے لوگ اور ہمارے جیسے 'دوستانہ وفدوں' کے اراکین ہیں جو ہندوستان کے علاوہ روس، مشرقی جرمنی، چیکوسلوواکیہ، ہنگری، پولینڈ، برما، انڈونیشیا اور پاکستان سے آئے ہیں۔دوسری گیلری میں دو ہزار کے قریب مزدوروں اور کسانوں اور پرانے انقلابی چھاپہ ماروں کے وہ نمائندے ہیں جو اس جشن میں شرکت کے لیے ملک کے کونے کونے سے بُلائے گئے ہیں۔

ماضی اور حال آج گھل مل گئے ہیں' تین آن مِن' کے سامنے پتھر کے دو 'فتح کے ستون' کھڑے ہیں جو مانچو حکمرانوں نے اپنی جنگی فتحوں کی یادگار میں نصب کیے تھے۔آج ان ستونوں پر لگے ہوئے 'لاؤڈ اسپیکر' عوام کی فتح کا اعلان کر رہے ہیں۔

ماضی اور حال۔تمدن اور انقلابی جوش۔لیڈر اور عوام۔ماؤ سے تنگ اور اس کے 'سر پھرے باغی' کسان۔چودے CHODE اور اس کی 'سرخ' فوج۔آج ایک ہی تصویر میں چین کی تاریخ کے پانچ ہزار برس اکٹھے ہو گئے ہیں۔

ٹھیک دس بجے۔ایک دھماکے کے ساتھ توپیں دغنے لگیں اور سامنے کھڑے ہوئے بینڈ کے ساتھ سو ساز بیک وقت پکار اُٹھے۔دور سے نپے تلے فوجی قدموں کی آواز آئی اور پریڈ شروع ہوگئی۔

یہ ہیں چین کی سرخ فوج (جواب عوامی آزادی کی فوج کہلاتی ہے) کے جرنیل اور کمانڈر جو قدم ملائے، سینے ابھارے، نظریں دائیں جانب ماؤ سے تنگ اور چودے CHODE کی طرف گھمائے چلے جارہے ہیں۔ان میں وہ بھی ہیں جو پچیس برس سے انقلابی کش مکش میں پیش پیش رہے ہیں۔جنھوں نے برسوں پہاڑیوں اور غاروں میں کاٹے ہیں۔جنھوں نے نہتے کسانوں کو لے کر جاپانی سامراج اور کومن ٹانگ کی فوجوں کا مقابلہ کیا ہے۔ان میں وہ بھی ہیں جو LONG MARCH کے تاریخی سفرِ دراز میں ماؤ اور چودے CHUDE کے ساتھ تھے۔ان میں وہ بھی ہیں جو پہلے چیانگ کائی شیک کی فوجوں کے کمانڈر تھے۔جنھوں نے برسوں کیمونسٹ فوجوں کے خلاف جنگ آزمائی کی تھی، مگر جو آخر کار اپنی پرانی غلطیوں کو تسلیم کر کے چیانگ کا ساتھ چھوڑ کر عوام سے آملے تھے۔

تین برس پہلے تک اس فوج کے افسر اور سپاہی سب پھٹی پرانی وردیوں میں ملبوس نظر آتے تھے، پرانے دقیانوسی ہتھیاروں سے لڑتے تھے، غاروں یا جھونپڑوں میں رہتے تھے۔پاؤں میں جوتوں کے بجائے گھاس پھونس کے بنے ہوئے چپل پہنتے تھے......

مگر آج جب چین میں عوامی حکومت قائم ہو چکی ہے، اس فوج کی شان ہی اور ہے۔ چمکتے ہوئے اونچے بوٹ، نئی وردیاں۔ نئے سے نئے ہتھیار۔ ٹوپیوں پر چمکتے ہوئے سرخ ستارے۔ قطار در قطار ایک ساتھ اٹھتے ہوئے قدم، بینڈ کے جوشیلے ترانے، پتھریلی سڑک پر ایک ساتھ ہزاروں جوتوں کے گرنے کا آہنگ......

پیدل فوج......

گھوڑ سوار فوج...... چھوٹے چھوٹے منگول نسل کے گھوڑوں پر سوار......

نئی نسل کے گھوڑے جن پر چنگیز خاں کی فوجوں نے آدھی دنیا کو فتح کیا تھا......

سمندری فوج......

ہوائی فوج......

پیرا ٹروپر (چھتری سے کودنے والے سورما)

فوجی لاریاں......

فوجی جیپ گاڑیاں......

فوجی موٹر سائیکلیں......

چھوٹے ٹینک......

منجھولے ٹینک......

بڑے ٹینک......

توپیں......

ہوائی جہاز مار توپیں......

اور ان میں سے کتنے ہی امریکہ میں بنے ہوئے ہتھیار جو امریکہ کی حکومت نے چیانگ کو کمیونسٹ سے لڑنے کے لیے بھینٹ کیے تھے اور جو آخر کار عوامی فوجوں کے ہاتھ لگے۔

اور پھر ہوائی جہاز۔ بم بار، لڑاکا، گولی کی رفتار سے اڑنے والے جیٹ ہوائی جہاز۔ ان کے پائلٹ وہی چینی قلی اور کسان ہیں جن کے بارے میں مغربی ماہروں کی رائے تھی کہ وہ کبھی مشینوں کو قابو میں نہیں کر سکتے، وہی چینی جنھیں صرف رکشا کھینچنے اور کپڑا دھونے اور کھانا پکانے کے قابل ہی سمجھا جاتا تھا!

باقاعدہ فوج کے پیچھے ہی نیلے کپڑے پہنے، سر پر کفن کی طرح سفید تولیے لپیٹے کون چلے آرہے ہیں؟ ان کی وردیاں فوجی نہیں ہیں مگر ان کے چلنے کے انداز میں فوجی شان ضرور ہے۔ یہ وہ انقلابی کسان چھاپہ مار ہیں جو برسوں تک اپنے اپنے گاؤں میں جاپانی سامراجیوں اور چیانگ کی فوجوں کا ناک میں دم کیے رہے۔ جس انقلابی جوش اور ہمت سے انہوں نے ان دشمنوں کا مقابلہ کیا تھا اسی طرح وہ آج اپنے اپنے کھیتوں کے سورچوں پر لگے ہوئے اناج کی پیداوار بڑھا رہے ہیں مگر ان کے گٹھے ہوئے جسموں اور ان کی فوجی شان سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت پڑنے پر اپنے ملک کی حفاظت کے لیے وہ ایک پل میں ہل چھوڑ کر بندوق اٹھا سکتے ہیں۔

پچاس لاکھ کی باقاعدہ فوج کے علاوہ چین میں پچاس لاکھ ایسے انقلابی سپاہی بھی ہیں جو کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ خدمت کے اوقات میں فوجی قواعد بھی کرتے ہیں۔ نئے چین کے دشمنو، ہوشیار! خبردار!

اور اب اس بے قاعدہ فوج کا آخری سپاہی بھی گزر گیا۔ اس وقت دن کے بارہ بجے ہیں۔ چند لمحے تین آن من پر خاموشی چھا گئی۔ ہم میں سے کسی نے پوچھا 'کیوں؟ پریڈ ختم ہوگئی؟' جواب ملا 'یہ تو فوجی پریڈ تھی۔ اصل جلوس تو ابھی آرہا ہے''۔ اسی وقت کئی ہزار جوشیلی آوازوں کا ایک نعرہ دور سے سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی بینڈ کی زبردست جھنکار—

فوج ہی کی طرح منظم اور باقاعدہ مگر کہیں زیادہ رنگین اور دلچسپ۔ عوام کا جلوس

مل مزدور

ریل مزدور

معمار۔ کاریگر۔

یونی ورسٹی کے پروفیسر اور طالب علم

اسکولوں کے استاد اور طالب علم

کسان

کلاکار گانے والے مصوّر

مصنف، شاعر

فلم اسٹار
اسٹیج کے ایکٹر اور ایکٹرسیں
یوتھ لیگ کے لڑکے اور لڑکیاں
عورتوں کی انجمنوں کے نمائندے
کمیونسٹ پارٹی

دوسری سیاسی پارٹیاں۔ ڈیموکریٹک لیگ۔ کیومن ٹانگ کی انقلابی کمیٹی۔

قومی زندگی کا کوئی شعبہ نہیں جو اس جلوس میں شریک نہ ہو۔ سینکڑوں انجمنوں اور اداروں کے نمائندے، مرد اور عورتیں، بوڑھے، اور نوجوان بچے جھنڈے لیے، نعرے لگاتے، ہنستے، گاتے، ناچتے، اچھلتے، کودتے چلے جارہے ہیں، بہے جارہے ہیں۔ ایک ٹھاٹیں مارتا ہوا انسانی دریا بہا جارہا ہے۔ اسے کون روکے گا؟ اسے کون روک سکتا ہے؟

زندگی۔
رنگیلی۔
خوشی۔
جوش۔

کئی ہزار یانگ کو ڈانسر۔ رنگین۔ ریشمی لباس پہنے ہوئے لڑکے او رلڑکیاں۔ کئی ہزار جھانجھوں کی جھنکار۔ کئی ہزار ڈھولکوں کی تھاپ۔

کئی ہزار بچے، صحت مند، شوخ گال، خوشی سے اچھلتے ہوئے، ہر ایک کے ہاتھ میں ایک سرخ کتاب یا (پھولوں کا) گلدستہ۔ باری باری ہاتھ اونچے کرتے ہوئے۔ ایک پل سرخ کتابوں کا سمندر۔ دوسرے پل اس کی جگہ دور تک پھیلا ہوا پھولوں کا چمن۔

رنگین غبارے، رنگین رومال۔ (پھولوں کے) گلدستے، کتابیں، نیزوں کے برابر قلم، اوکھلوں کے برابر دواتیں۔ نئے چین کے لیڈروں کی تصویریں۔ کارخانوں کے ماڈل، ایک فوج کے سپاہی کی مورتی، ایک کئی گز اونچا کپاس کا پھول۔ ایک عظیم الشان کھلی ہوئی کتاب، الماری سے بھی

بڑی، اور کتاب پر لکھا ہے 'ہم پڑھیں گے۔ ہم پڑھیں گے' ہزاروں کھلاڑی ہر ایک کے ہاتھ میں ایک رنگین فٹ بال۔ یہ ہزاروں فٹ بالیں ایک ساتھ اچھلتی ہوئی۔ کئی ہزار نوجوان۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک فاختہ اور جیسے ہی وہ 'تین آن من' کے سامنے آئے سب کے ہاتھ ایک ساتھ کھلے اور آزاد فاختاؤں کا ایک جھنڈ کا جھنڈ بلند ہوا اور 'فردوسِ امن دروازے' پر سے اڑتا ہوا غائب ہو گیا......

رنگین نظارے۔ دلچسپ تماشے، تالیاں بجاتے تماشائیوں کے ہاتھ سرخ ہو گئے۔

بارہ سے ایک — پھر دو تین بج گئے۔ یہ جلوس نہیں ہے۔ یہ چینی انقلاب کا کارواں ہے جو چلا جارہا ہے، چلا جا رہا ہے...... نہ اس کا شروع ہے نہ اخیر

یہ نئے چین کے انسان ہیں۔

وہ خوش ہیں۔

وہ آزاد ہیں۔

وہ خوش حال ہیں۔

ان میں جوش ہے، ہمت ہے، عزم ہے، استقلال ہے، اپنی حکومت میں، اپنے لیڈروں میں اعتقاد ہے۔ ان کی زبان پر ایک ہی نعرہ ہے 'ماؤ سے تنگ وان شوئے' (ماؤ سے تنگ دس ہزار برس) ماؤ سے تنگ زندہ باد — ماؤ سے تنگ زندہ باد!

دو برس ہی میں غریب اور مظلوم کسانوں اور قلیوں، اکال کے ماروں اور ان پڑھ جاہلوں کی یہ قوم کہاں سے کہاں آن پہنچی ہے۔ دس لاکھ کا یہ جلوس اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ لیکن ماؤ سے تنگ کا کہنا ہے کہ 'ابھی تو ہزار میل کے سفر میں ہم نے صرف پہلا قدم اٹھایا ہے' انقلابی چین نے متمدن انکسار کو ابھی تک نہیں چھوڑا۔

شام کو اس پریڈ سے جب ہم ہوٹل واپس پہنچے تو ایسا لگتا تھا کہ ہم ایک پریڈ نہیں بلکہ زندہ تاریخ کا مشاہدہ کر کے آئے ہیں۔ احساس میں اس شدت کی تھرتھراہٹ تھی کہ بہت دیر تک ایک دوسرے سے بات بھی نہ کر سکے۔

مگر اندھیرا ہوتے ہی پیکنگ چراغاں کی روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ رات دن میں تبدیلی

ہو گئی۔ انقلاب کی شب برات، آزادی کی دیوالی اور لاکھوں کے ہجوم کے ساتھ ہم میں سے بھی بہت سے آتش بازی کا تماشا دیکھنے کے لیے واپس 'تین آن من' کے سامنے کے میدان میں پہنچ گئے۔ یہ سچ مچ جشنِ جمہوریت تھا۔ میدانوں میں، چوراہوں پر، سڑکوں کے بیچ میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں۔ کارخانوں کے مزدور، کالجوں کے طالب علم۔ تالیاں بجا بجا کر ناچ رہے تھے۔ شہر کے کونے کونے سے ہزاروں کے جلوس گاتے، بینڈ باجے بجاتے، شور مچاتے چلے آرہے تھے۔ چوراہوں پر لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر ریڈیو کے گانے براڈ کاسٹ کر رہے تھے۔

اور پیکنگ کے آسمان پر ایک انوکھی قوس وقزح (دھنک) کھلی ہوئی تھی۔ رنگا رنگ کی آتش بازی نے روشنی کے قلم سے اندھیرے کی تختی پر کیا کیا گل کاریاں نہ کی تھیں! روشنی کے مینار، روشنی کے درخت، روشنی کے دائرے، روشنی کے فوارے، رنگ اور روشنی اور آگ کا ایک طوفان تھا جو زمین سے آسمان کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ آکاش کے سب ستارے ماند پڑ گئے اور پھیلے ہوئے اندھیرے پر روشنی مکمل فتح پا گئی۔

تماشا دیکھنے کے لیے میں ہوٹل کی چھت پر پہنچا تو دیکھا 'میمی' اکیلی کھڑی آتش بازی کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ 'میمی' پیکنگ یونی ورسٹی میں انگریزی پڑھتی ہے اور ہماری مترجم INTERPRETER ہے۔ بڑی زندہ دل، بڑی ذہین اور ان تھک کام کرنے والی لڑکی ہے۔ اس کا اصلی نام مس یانگ ہے۔ مگر پروفیسر حبیب اور پنڈت سندر لال اسے پیار سے 'میمی' کہتے ہیں۔

وہ اس طرح ٹکٹکی باندھے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی کہ میں نے پوچھا 'میمی کیا دیکھ رہی ہو؟'

بغیر نظر ہٹائے اس نے جواب دیا 'مسٹر عباس۔ میں اپنا مستقبل دیکھ رہی ہوں'۔

میں اس کا مطلب نہیں سمجھا 'کیا اس آتش بازی میں تمھیں اپنا مستقبل نظر آتا ہے؟' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

'جی ہاں۔ اپنا اور اپنے جیسے لاکھوں، کروڑوں چینی عوام کا۔ ہمارا مستقبل اتنا ہی روشن اور رنگین ہے جیسے یہ آتش بازی'۔

میں نے سر سے پاؤں تک میمی کو دیکھا۔ وہ روئی سے بھرا ہوا سستے نیلے کپڑے کا کوٹ اور نیلی ڈبل زین کی پتلون پہنے ہوئے تھی۔ اس کے کٹے ہوئے بالوں میں 'پرم' کے خم تو کیا کلپ

تک نہ تھے۔ اس کے پیروں میں بھدے سے مردانہ جوتے تھے۔

میں نے کہا ’کیوں سیمی کیا تمھیں اس آتش بازی میں اپنے لیے ریشمی گاؤن اور مخمل کے جوتے اور کانوں میں جھولتے بُندے نظر آتے ہیں؟‘

اس نے کہا: ہاں اپنے لیے ہی نہیں۔ اپنی جیسی سب چینی لڑکیوں کے لیے اور ریشمی گاؤن ہی نہیں، رہنے کے لیے اچھے گھر اور پڑھنے کے لیے اچھی کتابیں اور اسکول اور کالج، کھیتوں کے لیے ٹریکٹر اور کارخانوں کے لیے بڑی بڑی مشینیں جو عوام کے لیے کپڑا بُنیں گی اور قلم بنائیں گی۔ اور کتابیں چھاپیں گی......‘

ایک روشنی کا فوارہ تیزی سے اچھلا اور اوپر جا کر ایک گولا دھماکے کے ساتھ پھوٹا اور لاکھوں سرخ ستارے آسمان پر بکھر گئے......

’مسکرا کر بولی‘ ’دیکھئے آپ نے ہمارے مستقبل کے سرخ ستارے؟‘

اور پھر سنجیدگی سے کہا: ’انقلاب اگر نہ آتا تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میری جیسی مزدور گھرانے کی لڑکی آج یونی ورسٹی میں پڑھتی ہوتی؟ میرے ماں باپ نے تو مجھے اسکول کی تعلیم بھی بڑی مشکل سے اپنا پیٹ کاٹ کر دلوائی تھی۔ کالج یونی ورسٹی کا تو میں نے خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر اب انقلاب نے میرے لیے سب دروازے کھول دیے ہیں۔ میں بڑی محنت سے پڑھوں گی۔ انگریزی زبان کی ماہر بن جاؤں گی۔ شاید کسی دن جب ہماری حکومت بین الاقوامی انجمن U.N.O میں اپنے نمائندے بھیجے گی مجھے چینی ڈیلی گیشن کے ساتھ مترجم کی حیثیت سے بھیجا جائے اور اس طرح میں اپنی قوم کی آواز دنیا تک پہنچانے میں مدد دے سکوں......اب کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ اس نئی دنیا میں، اس نئے چین میں، میں سب کچھ کر سکتی ہوں......‘

ہوٹل سے تین من آن میل بھر سے زیادہ فاصلے پر تھا مگر روشنی کا ایک سنہری گولا ہوا میں بلند ہوا، پھٹا اور پل بھر کے لیے تاریکی کے سمندر میں سے جگمگاتا ہوا تین آن من ابھر آیا۔

’دیکھا آپ نے؟‘ سیمی چلائی ’تین آن من! فردوس امن کا دروازہ!......عباس صاحب۔ ابھی تو چینی عوام کے لیے جنت کا دروازہ کھلا ہی ہے......‘

○

مسافر کی ڈائری

کھلی ہوئی کھڑکیاں

سنا تھا کہ سفر علم حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ پانچ مہینے میں دنیا کے گرد سترہ ملکوں میں پچیس ہزار میل سے زیادہ سفر کرنے کے بعد مجھے تو فقط یہ احساس ہوا کہ میں دنیا اور دنیا والوں کے متعلق کتنا کم جانتا ہوں۔ اگر میں یہ سمجھوں کہ ایک ہفتہ نیویارک میں رہنے کے بعد امریکہ کی سیاست پر حاوی ہو گیا یا جینیوا میں چار دن گزارنے کے بعد لیگ آف نیشنز اور بین الاقوامی معاملات کا ماہر ہو گیا تو یہ میری حماقت ہوگی۔ اور اگر آپ نے اس کتاب کو اس امید پر خریدا ہے کہ اس کو پڑھ کر آپ پر جاپانی صنعتی ترقی کا راز کھل جائے گا یا ترکی کے سماجی انقلاب کا پورا حال معلوم ہو جائے گا تو یہ آپ کی............ میرا مطلب یہ ہے کہ ممکن ہے آپ کو مایوسی ہو۔

پانچ مہینے میں سترہ ملکوں کی سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور تعلیمی حالت کا مطالعہ تو کیا مشاہدہ کرنا بھی ناممکن ہے۔ شاید اگر میں گھر بیٹھ کر ان پانچ مہینے میں دو سو کتابیں پڑھ جاتا تو ان ملکوں کے متعلق میری واقفیت زیادہ ہوتی۔ اس سفر کے بعد تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ رومانیہ کی آبادی کیا ہے اور کینیڈا کا رقبہ کتنا ہے۔

پھر میں نے پانچ مہینے اور ساڑھے تین ہزار روپے کا خون کر کے یہ سفر کیا ہی کیوں؟ سچ بات تو یہ ہے کہ فقط اس لیے کہ مجھے سفر کا شوق ہے۔ اگر سفر سے کوئی اور فائدہ نہ ہوتا۔ کوئی تجربہ

نہ حاصل ہوتا اور میری اخبار نویسی میں اس سے کوئی مدد نہ ملتی تب بھی موقع ملنے پر میں سفر ضرور کرتا۔ شاید میرے خون میں کوئی کیڑا ایسا ہے جو مجھ کو سفر اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ حرکت کا ہی نام زندگی ہے۔ کہتے ہیں لڑھکتے ہوئے پتھروں میں کائی نہیں لگتی۔ مجھے کائی نہیں پسند خواہ وہ پتھر پر لگی ہو یا دماغ پر۔ جب ہی تو لڑھکنے کو جی چاہتا ہے۔

جاپان میں، میں ریل میں ناگاساکی سے کوبے جا رہا تھا۔ میرے قریب ہی ایک انگریز تاجر بیٹھا ہوا تھا جو کئی بار پہلے بھی جاپان آچکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کھڑکی بند رکھے مجھے اصرار تھا کہ کھڑکی کھلی رہے۔ جیت میری ہوئی۔ اس پر وہ کھڑکی سے سرک کر دور بیٹھ گیا اور ایک بار بھی باہر نہ جھانکا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم کئی بار جاپان آچکے ہو۔ کیا بتا سکتے ہو کہ ریل کی پٹری کے کنارے جو کھیت لگے ہیں ان میں کیا بویا ہوا ہے۔ اُس نے کہا۔ ''مجھے معلوم نہیں اور نہ مجھے اس کی پرواہ ہے۔'' بعض لوگ ریل اور دماغ دونوں کی کھڑکیاں بند کر کے سفر کرتے ہیں۔ اس سفر میں میں نے اور کچھ کیا یا نہیں کم از کم یہ دونوں کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رکھیں۔ ان کھڑکیوں میں میں نے کیا دیکھا۔ وہ آپ کو یہ کتاب پڑھنے سے معلوم ہو جائے گا۔

(خواجہ) احمد عباس

○

بمبئی سے شنگھائی تک

28 جون—13 جولائی

پاسپورٹ:

قید خانے سے نکل بھاگنا کتنا کٹھن ہوتا ہے۔ ہندوستانی کے لیے دوسرے ملکوں کے سفر کا پاسپورٹ لینا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ چار سال پہلے جب میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں پڑھتا تھا تو تاریخ کی انجمن کی طرف سے لڑکوں کی ایک جماعت افغانستان کے سفر کے لیے بھیجی گئی۔ اس سفر کا انتظام کرنے والوں میں میں بھی تھا۔ سب کے ساتھ میں نے بھی درخواست دی۔ دو مہینے کی بھاگ دوڑ کے بعد اور سب کو پاسپورٹ مل گئے مگر مجھے نہ ملا۔ سرکار نے سوچا کہ ایسے خطرناک آدمی کا ایک آزاد ملک میں جانا اچھا نہیں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ پشاور بلکہ اس سے بھی آگے افغانستان کی سرحد تک گیا اور سپاہیوں کی نظر بچا کر ہندوستان کے باہر دو چار قدم رکھ کر واپس آگیا اب دنیا کے سفر کا جب ارادہ کیا تو سوچا کہ سرکار شاید چار سال کی بات اب بھول گئی ہو۔ بمبئی میں پاسپورٹ کی درخواست دی۔ مختلف فارم بھرنے پڑے۔ پولیس کے ایک افسر کے سامنے پیشی ہوئی۔ درجنوں سوالوں کا جواب دینا پڑا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟'' ''تمھارے پاس کتنا روپیہ ہے؟'' جائیداد کتنی ہے؟'' ''تنخواہ کیا ملتی ہے؟'' شادی ہوگئی ہے؟'' وغیرہ وغیرہ۔

اِن سب سوالوں کے جواب دے کر اور درخواست کے ساتھ تین عدد تصویریں نتھی کر کے میں سمجھا کہ اب تو پاسپورٹ مل ہی جائے گا۔ وطن گیا، وہاں عزیزوں سے رخصت ہو کر 24 جون کو بمبئی واپس آ گیا۔ درخواست دیئے کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ جہاز کی روانگی 28 کو تھی۔ یقین تھا کہ اس سے پہلے ہی پاسپورٹ مل جائے گا مگر بمبئی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ میری درخواست اب تک پنجاب سے واپس نہیں آئی۔ پنجاب کیوں بھیجی گئی؟ اس لیے کہ میری پیدائش اس صوبے کی ہے۔ معلوم ہوتا تھا 28 جون کا جہاز نکل جائے گا اور اگر ایسا ہوا تو شاید اس سفر کو بالکل ملتوی کرنا پڑے مگر بھلا ہو بمبئی کی نئی کانگریسی وزارت کا، 27 جون کو پاسپورٹ مل گیا۔ چھوٹی سی نیلی جلد کی کتاب، اوپر سرکاری مہر۔ اندر وائسرائے کی طرف سے اعلان کہ میں (خواجہ احمد عباس) برطانوی ہند کی رعایا ہوں۔ چھوٹی سی میری تصویر۔ جس میں عادی مجرم معلوم ہوتا ہوں۔ پہچان کے لیے مخصوص علامات۔ سیاہ بال، سیاہ آنکھیں، بائیں آنکھ کے اوپر ٹھوڑی پر زخم کے نشان آنکھ پر کرکٹ کی گولی تھی اور ٹھوڑی پر چوٹ۔ سفر کے شوق کا نتیجہ ہے۔ برس گزر گئے۔ جب میں پانچ یا چھ برس کا تھا۔ نانا صاحب نے کہا ہمارے ساتھ گاؤں چلو گے؟ خوشی کا یہ حال کہ بے تحاشا دوڑا اور ٹھوکر کھا کر پتھر پر گرا اور اب 25 ہزار میل کے سفر کے خیال سے بھی اتنی خوشی نہیں ہوئی۔

ویزا:

ہندوستان کی سرکار نے تو سفر کی اجازت دے دی۔ مگر دوسرے ملکوں میں داخل ہونے کے لیے ان کی سرکاروں کی اجازت چاہیے۔ بعض ملکوں مثلاً فرانس، سوئزرلینڈ وغیرہ کے ساتھ سلطنت برطانیہ کے ایسے معاہدے ہیں جن کی رو سے وہاں جانے پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں کے قونصل خانوں سے خاص اجازت لینی پڑتی ہے۔ جس کو ویزا کہتے ہیں۔ امریکہ میں داخلے کی اجازت بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ وہاں کی سرکار یہ نہیں چاہتی کہ دوسرے ملکوں کے لوگ امریکہ میں آ کر بس جائیں اور ان کی دولت میں حصہ بٹائیں۔ ایشیا والوں پر خاص پابندیاں ہیں۔ دو مہینے سے زیادہ رہنے کی اجازت تو تقریباً ناممکن ہی ہے۔ مجھے چار پانچ ہفتے ہی رہنا تھا اس لیے زیادہ دقت نہیں ہوئی مگر یہ اقرار کرنا پڑا کہ میں وہاں روزی کمانے نہیں

بلکہ سیر کرنے جارہا ہوں اور اس کے مقابلے میں ہمارے ملک میں جو امریکن یا غیر ملکی چاہے بغیر روک ٹوک کے چلا آتا ہے۔

بلارڈ پیئر :

بمبئی کی بندرگاہ تو میلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر بلارڈ پیئر ہی وہ مقام ہے جہاں سے بڑے بڑے جہاز روانہ ہوتے ہیں۔ میں درجنوں مرتبہ دوستوں کو پہنچانے یا لینے یا اخبار کے کام سے مشہور مسافروں سے ملنے بلارڈ پیئر آیا ہوں۔ جس دن جہاز آتا ہے یا روانہ ہوتا ہے عجب سماں ہوتا ہے۔ سامان سے لدی ہوئی موٹریں، بڑھیا کپڑے پہنے ہوئے امیروں کے غول کے غول چمکتی ہوئی ساڑیاں۔ ہار اور پھول، قہقہے اور آنسو۔ شور اتنا کہ آواز سنائی نہیں دیتی۔ غیر ملکی سیاح آنکھیں پھاڑے ہر چیز کو تعجب سے دیکھتے ہوئے۔ انگریز افسر چھٹی پر جارہے ہیں یا ولایت سے واپس آرہے ہیں۔ سفید یونیفارم والے انگریز سارجنٹ، نیلے کپڑے والے پولیس کے سپاہی، سامان سے لدے ہوئے قلی۔ پریشان طالب علم ولایت جانے کے شوق میں خوش مگر اتنے بڑے سفر کے خیال سے سہمے ہوئے۔ کوئی لبرل پارٹی کا لیڈر ولایت کی یاترا کر کے واپس آیا ہے۔ اخباروں کے رپورٹر گھیرے ہوئے ہیں۔ بیان لکھوانے آرہے ہیں۔ بڑی توند والے سیٹھ تجارت کی خاطر سات سمندر پار جارہے ہیں۔ آخری وقت میں بھی کاروبار کی باتیں کررہے ہیں اور ہال کے دروازوں کے باہر جہاز کھڑا ہے۔ ایک زبردست دیو کی طرح سے اور یہی جہاز ان ہزاروں آدمیوں کو لے کر یورپ یا چین یا جاپان یا امریکہ جائے گا۔ ڈراؤنا بھی اور دل کش بھی پہلے ہی سے اس خیال سے کوفت ہے کہ اسی ماحول میں مجھے بھی روانہ ہونا ہے۔ اب تک تماشائی تھا۔ اب تماشا ہوں گا۔

28 جون :

روانگی کا دن بھی آ گیا۔ رات بھر دوستوں سے گپ رہی۔ صبح کو سامان باندھا۔ ٹکٹ وغیرہ کے سلسلے میں امریکن ایکسپریس AMERICAN EXPRESS کے دفتر گیا۔ سامان کو بندرگاہ روانہ کیا۔ کرانیکل کے ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی کے ہاں رخصتی کی دعوت تھی مگر کھانا نہ کھایا گیا۔

پریشانی اور گھبراہٹ یا رات بھر جاگنے کی تکان۔ بلارڈ پیئر پر حسب معمول شور وغل، چیخ پکار، غیر معمولی بھیڑ، دوست پہنچانے آئے ہیں۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر مذاق کر رہے ہیں۔ صلاح مشورہ دے رہے ہیں۔ خط ضرور لکھنا' اجنبیوں سے دور ہی رہنا' انگلستان میں بڑی سردی ہوگی؟ بس دو سوٹ کیس ہی لے کر جا رہے ہو؟ یہ ٹائپ رائٹر کیا ہوگا۔ کام کرنے جا رہے ہو یا سیر کرنے؟ اور پیرس........... پیرس کا حال ضرور لکھنا۔ ''یار بڑے خوش قسمت ہو۔'' اور میں دل ہی دل میں روپے آنے پائی کا حساب لگا رہا ہوں۔ چند سو روپے لے کر چلا ہوں۔ کیسے کام چلے گا کہیں مشکل میں نہ پڑ جاؤں مگر ٹکٹ تو واپسی کا خرید ہی لیا ہے۔ جب پیسہ نہ رہے گا۔ واپس آجاؤں گا........... ڈاکٹری معائنہ۔ سب ٹیکوں کے سرٹیفیکٹ دکھائے۔ ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھا اور مجھ سے کہا۔ ادھر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ دوسرے مسافروں کا معائنہ ہونے لگا اور میں انتظار کر رہا ہوں۔ دوست دوسرے دروازے سے اندر پہنچ گئے اور جہاز پر چڑھنے لگے اور میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ وہ لوگ اِدھر اُدھر مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے اور سب کا معائنہ کرنے کے بعد دوبارہ میری نبض دیکھی۔ پھر تھرمامیٹر نکال کر میرے منہ میں دیا۔ کیا مجھے بخار ہے؟ گھڑی ٹک ٹک کیے جا رہی ہے۔ اب جہاز روانہ ہونے میں آدھ گھنٹے سے بھی کم رہ گیا اور یہ ڈاکٹر مجھے جانے ہی نہیں دیتا تھرمامیٹر بھی عجیب دقیانوسی ہے۔ پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر نے منہ سے تھرمامیٹر نکال کر دیکھا اور سر ہلایا۔ ''تمھیں بخار ہے۔'' اب میں سمجھا رہا ہوں کہ رات بھر سویا نہیں ہوں اس لیے معمولی حرارت ہوگئی ہوگی۔ مگر ڈاکٹر کہتا ہے۔ مجھے اس جہاز سے جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ عجیب مصیبت ہے۔ کیا میں سچ مچ اس جہاز سے نہ جا سکوں گا؟ میرا تمام پروگرام اُلٹ پلٹ ہو جائے گا۔ شاید پھر بالکل ہی نہ جا سکوں اور خفت کس قدر ہوگی۔ اب تو اخبار میں تصویر بھی نکل چکی ہے اور یہ دوست جو پہنچانے آئے ہیں اور تین تین روپے کے ٹکٹ لے کر جہاز پر گئے ہیں۔ یہ کیا کہیں گے؟ ''لوگ کیا کہیں گے۔'' انسان کی زندگی میں یہ کس قدر زبردست سوال ہے، کوئی اپنی خوشی یا رنج۔ اپنے نفع نقصان کا اتنا خیال نہیں کرتا جتنا دوسروں کی رائے کا۔ ''لوگ کیا کہیں گے؟'' کہیں گے تو کہنے دو۔ اب مجھے ڈاکٹر پر غصہ آ رہا ہے۔ اگر مجھے بخار ہے تو اس کا کیا جاتا ہے۔ اگر مروں گا تو میں........... تھوڑی دیر میں جہاز کا ڈاکٹر آ گیا۔

دوبارہ معائنہ ہوا۔ اس نے بھی سر ہلایا۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں مگر وہ اطالوی ہے۔ انگریزی واجبی ہی جانتا ہے۔ خیر میرے اصرار پر اس نے کہا کہ اچھا جہاز کے اسپتال میں چلو وہاں پھر معائنہ ہوگا ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ میں بھی چلا۔ زینہ پر چڑھتا ہوا جہاز پر پہنچ گیا۔ اب ذرا اطمینان ہوا۔ اب میں نہیں واپس جاؤں گا۔ خواہ یہ لوگ میرا سامان کیوں نہ سمندر میں پھینک دیں۔ دوبارہ معائنہ ہوا۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر ٹائیفائڈ سے خائف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مجھے بھی کہیں یہی بیماری نہ ہو۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے سمجھایا کہ اگر دو دن تک میرا بخار نہ اترا تو اسے حق ہوگا کہ کولمبو پر مجھے اتار دے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی مگر اس نے شرط لگائی کہ میں ابھی فوراً جہاز کے اسپتال میں داخل ہو جاؤں گا۔ مگر میں نے کہا کہ میرے دوست تو باہر کھڑے انتظار کر رہے ہیں آخر کار اس نے اجازت دے دی کہ ان سے رخصت ہولو۔ مگر فوراً یہاں اسپتال میں آؤ.......... جہاز کی روانگی کی پہلی سیٹی بھی ہوگئی۔ اب لوگ جو پہنچانے آئے تھے اُتر رہے ہیں۔ میں بھی اپنے دوستوں سے رخصت ہوا۔ جلدی جلدی ان کو صورت حال سمجھائی اور اطمینان دلایا کہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ آخر وہ سب بھی اُترے اور کنارے پر کھڑے ہوگئے۔ زینہ ہٹا دیا گیا اور جہاز نے آہستہ آہستہ حرکت شروع کی۔ دوست پکار پکار کر کچھ کہہ رہے ہیں مگر کچھ سنائی نہیں دیتا۔ دونوں طرف سے رومال ہلنے لگے۔ ایک صاحب میرے قریب کھڑے ہوئے رو رہے ہیں مگر مجھے...... مجھے وطن چھوڑنے کا دوستوں سے رخصت ہونے کا کوئی رنج نہیں۔ اتنے بڑے سفر کی کوئی ہیبت نہیں۔ شاید میں سخت دل ہوں۔ اس وقت تو بس یہ خیال ہے کہ چلو سفر شروع تو ہوگیا۔ کتنی دقتیں ہوئیں۔ پاسپورٹ ملنے میں مشکل ہوئی۔ روانگی سے چند روز پہلے ٹراونکور بینک، جس میں آدھی پونجی جمع تھی، فیل ہوگیا اور پھر دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا یہ بخار کی مصیبت۔ خیر اب تو جہاز چل ہی پڑا۔ اپنی خوش قسمتی پر غور کر رہا تھا کہ ڈاکٹر نے پھر آن پکڑا اور مجھے پکڑ کر اسپتال کی طرف چلا۔ میں نے ساحل کی طرف آخری نظر ڈالی۔ بلارڈ پیئر اب چھوٹا سا نظر آ رہا تھا اور اس کے پیچھے بمبئی...... سندر بمبئی، خوب صورت بمبئی...... پھیلا ہوا تھا۔

اسپتال:

عمر بھر کبھی اسپتال میں داخل ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ کیا معلوم تھا کہ سب سے پہلے ایک جہاز کے اسپتال میں داخل ہوں گا۔ معلوم نہیں لوگ عام طور سے اسپتال سے کیوں گھبراتے ہیں۔ مجھے تو فقط ہنسی آئی یہ سوچ کر کہ عام خیال کے مطابق مجھے تو ڈک پر گھٹنوں کھڑے ہو کر وطن کی سرزمین کو خیر باد کہنا چاہیے تھا اور اس کے بجائے مجھے یہاں بند کر دیا گیا ہے۔ اسپتال کا کمرہ اچھا بڑا ہے۔ آٹھ پلنگ ہیں جن میں سے پانچ خالی ہیں۔ ایک کونے میں ایک ہٹا کٹا اطالوی ملاح ہے۔ دوسرے کونے میں میں ہوں اور میرے برابر ایک ہندوستانی مسافر۔ یہ ایک سندھی تاجر ہے جو جاپان کاروبار کے سلسلے میں جا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کو بھی بخار ہے اور اس کے ساتھ بھی تقریباً وہی واقعات پیش آئے جو میرے ساتھ۔ میں نے سوچا یہ بھی اچھا ہے کہ کوئی بات کرنے کو تو موجود ہے۔ کپڑے اتار میں تو چادر اوڑھ لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ جلد ہی سو گیا۔ جہاز بمبئی سے تین بجے روانہ ہوا تھا۔ چار گھنٹے کے بعد آنکھ کھلی تو کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ ہلکا ہلکا سر چکرا رہا تھا۔ سوچا کہ یہ کیا قصہ ہے، کھڑے ہو کر کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو دیکھا سورج غروب ہو رہا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ جہاز بری طرح ہل رہا ہے۔ بڑی بڑی لہروں کے تھپیڑے اس کو اچھال رہے ہیں۔ اتنے میں ڈاکٹر آ گیا۔ تھرما میٹر لگایا تو معلوم ہوا کہ اب بالکل بخار نہیں ہے۔ نیند پوری ہوتے ہی حرارت جاتی رہی۔ میں نے کہا، دیکھا میں کیا کہتا تھا مگر ڈاکٹر نے اسپتال چھوڑنے کی اجازت نہ دی اور کہا کہ ابھی چوبیس گھنٹے تم کو اور رہنا پڑے گا۔ میں نے کہا کوئی حرج نہیں۔ اس طوفان میں چلنا پھرنا تو ناممکن ہے۔ جیسے کیبن میں لیٹے ویسے یہاں۔ پھر پڑ کر سو گیا۔ رات کو ایک دفعہ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اطالوی ملاح بیٹھا ہوا کھانا کھا رہا ہے، مزے لے لے کر۔ ممکن ہے یہ بیماری کا بہانہ کر کے اسی لیے اسپتال میں داخل ہوا ہو کہ کام سے چھٹی ملے گی اور کھانا بھی بہتر ملے گا۔ ہم دونوں کو کھانے کی ممانعت تھی۔ پینے کو لیموں کا شربت بتایا گیا تھا۔ اس کا ایک گلاس پی کر میں پھر سو گیا۔ رات بھر پلنگ اس طرح ہلتا رہا جیسے مسلسل زلزلہ آ رہا ہو۔

کونٹے ورڈے:

دوسرے دن صبح کو اٹھا تو بھوک اور کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے ناشتہ کی اجازت دے دی اور میں نے ڈٹ کر کھایا۔ آج صبح میرے ہندوستانی ساتھی کا بخار بھی اتر گیا۔ وہ بیچارہ اب تک سخت پریشان تھا کہ کہیں کولمبو پر نہ اتار دیا جائے۔ آج اس کے چہرے پر کچھ رونق آئی۔ اس سے باتیں کرنے سے معلوم ہوا کہ نہ صرف وہ بلکہ اس جہاز پر بہت سے ہندوستانی تاجر ہیں جو جاپان جا رہے ہیں۔ جون اور جولائی میں یہ لوگ جاتے ہیں۔ جاڑے کے لیے سامان لانے۔ یہ تاجر مشرقی افریقہ میں بھی کافی عرصہ رہا ہے۔ وہاں کے حالات بیان کرتا رہا کہ وہاں ہندوستانیوں اور دوسرے کالے آدمیوں پر کتنا ظلم ہوتا ہے۔

ہم جس جہاز پر ہیں یہ اطالوی کمپنی کا جہاز کونٹے ورڈے CONTE VERDE ہے جو سوئیز کے راستے اٹلی سے آیا ہے اور اب کولمبو، ہانگ کانگ ہوتا ہوا شنگھائی جا رہا ہے۔ اس کا وزن بیس ہزار ٹن ہے جو ایک اچھے اوسط درجہ کے جہاز کا وزن ہوتا ہے۔ زیادہ تر مسافر ہانگ کانگ پر اتر جائیں گے۔ سندھی تاجر اور دوسرے ہندوستانی بھی سب ہانگ کانگ سے جاپان کے لیے دوسرے جہاز پر سوار ہوں گے۔ شنگھائی کوئی نہیں جانا چاہتا۔ جنگ کی وجہ سے سب ڈرے ہوئے ہیں۔

آج ڈاکٹر پھر کئی بار آیا۔ اس کی شکل بالکل مسولینی کی طرح ہے مگر زیادہ خوفناک آدمی نہیں ہے۔ اب کیونکہ ٹائیفائڈ کا خطرہ نہیں رہا اس لیے ہم سے ہنسی خوشی بات کرتا ہے۔ میں نے کہا مجھے کم از کم اپنے کیبن تک جانے دو تاکہ میں منہ ہاتھ دھوکر کپڑے بدل سکوں اور پڑھنے کے لیے کوئی کتاب لے آؤں۔ اس نے کہا اچھا جاؤ مگر پندرہ منٹ میں آ جانا۔

زندہ مردہ:

جہاز کو چلے ہوئے تقریباً بیس گھنٹے ہو گئے۔ مگر لطف یہ کہ میں نے اب تک اپنے کیبن کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ یہ بھی نہ معلوم تھا کہ سامان وہاں رکھ دیا گیا ہے یا نہیں، نمبر بتا کر پوچھتا پوچھتا وہاں پہنچا۔ سامان موجود تھا۔ میرے علاوہ دو مسافر اور ہیں۔ ایک بوری تاجر جاپان جا رہا ہے اور ایک لڑکا سنگاپور، مجھے دیکھ کر یہ لوگ حیران رہ گئے۔ ان کا خیال تھا میں بمبئی ہی میں رہ گیا

ہوں۔ اتنے میں کیبن اسٹیورڈ CEBIN STEWARD یعنی جہاز کا ملازم بھی آ گیا اور مجھے دیکھ کر اطالوی زبان میں حیرت اور تعجب کا اس قدر زور سے اظہار کیا گویا میں کوئی مردہ تھا جو دفعتاً زندہ ہو گیا ہو۔ کہنے لگا۔ "تم بیچ سمندر میں کہاں سے دفعتاً ٹپک پڑے۔ میں تو سمجھا تھا تم یا تو بمبئی میں رہ گئے ہو یا سمندر میں کود پڑے ہو۔" میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں بھوت نہیں ہوں اور یہ ڈاکٹر کا قصور تھا کہ اس نے ان لوگوں کو کیوں نہیں اطلاع دی کہ مجھے اسپتال میں روکا گیا ہے۔

خیال تھا شام کو اسپتال سے چھٹی مل جائے گی مگر ڈاکٹر نے کہا۔ اب کل صبح ہی جانا۔ میں دیکھ آیا تھا کہ کیبن میں سخت گرمی ہے اس لیے میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ ایک رات اور یہیں گزاری جائے۔ پڑھنے کے لیے کتابیں اور اخبار لے آیا ہوں۔ اس لیے وقت کاٹنے کا بھی انتظام ہے۔ تین سال تک روزانہ دفتر میں کام کرنے کے بعد آرام کرنے اور کتاب پڑھنے کی اتنی فرصت غنیمت ہے۔

ہم سفر:

30 جون۔ آج صبح ڈاکٹر نے کیبن جانے کی اجازت دے دی چھوٹا سا کمرہ ہے۔ اس میں چار آدمیوں کے سونے کی جگہ، دو نیچے دو اوپر۔ سمندر میں طوفان ہونے کی وجہ سے کھڑکی بند ہے۔ سخت گرمی ہے۔ نہا کر اور کپڑے بدل کر اوپر ڈیک پر گیا۔ میں سستے درجہ ECONOMY CLASS میں سفر کر رہا ہوں۔ جس کو تقریباً ریل کے انٹرمیڈیٹ درجے جیسا سمجھنا چاہیے، جہاز پر زیادہ مسافر نہیں ہیں۔ کل تعداد شاید پانچ سو سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس میں آدھے سے زیادہ ہمارے درجے میں ہیں۔ ہمارے لیے ایک نیچی چھت کا کمرہ ہے اور ایک عام بیٹھنے اٹھنے کا کمرہ۔ گرمی کی وجہ سے مسافر عام طور سے یہیں بیٹھے رہتے ہیں یا ہمارے لیے جو چھوٹا سا ڈک کا حصہ مخصوص ہے وہاں ٹہلتے ہیں یا کوئی کھیل کھیلتے ہیں مگر کبھی کبھی سیکنڈ کلاس والے ہماری طرف آ نکلتے ہیں۔ ہم ان کے درجے میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ سماج میں جتنے جماعتی اختلافات نظر آتے ہیں چھوٹے پیمانے پر ان کا نقشہ جہاز پر نظر آتا ہے۔ یہاں بھی اوپر کے درجے والے نیچے درجے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور نیچے کے درجے والے اوپر کے درجے والوں کو رشک اور حسد اور غصہ

سے۔ اس جماعتی تفریق میں ایک حد تک نسلی اور قومی اختلافات بھی مٹ جاتے ہیں۔ ہمارے درجے میں انگریز، جرمن، اطالوی، یہودی، ہندوستانی چینی سب قسم کے لوگ ہیں۔ انگریز تو اپنی عادت کے مطابق ذرا الگ الگ رہتے ہیں۔ مگر اور باقی مسافروں میں آپس میں اچھے دوستانہ تعلقات ہیں۔ بعض جرمن، یہودی جو اپنے وطن سے نکالے ہوئے ہیں شمالی چین میں قسمت آزمائی کے لیے جارہے ہیں۔ ان بیچاروں کی پریشان حالت دیکھ کر ہٹلر کے ظلم کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ چند چینی طالب علم ہیں جو جرمن یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کر کے وطن جارہے ہیں۔ یہ بیچارے انگریزی بہت کم جانتے ہیں اور کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اور کچھ اشاروں سے ہم لوگ ان سے بات چیت کرتے ہیں۔ ان سے مل کے اور باتیں کر کے چین کی نئی اسپرٹ کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ جس وقت چین اور جاپان کی موجودہ جنگ شروع ہوئی ان طالب علموں نے فوراً اپنی حکومت کو لکھا کہ ان کو واپس بلا لیا جائے تاکہ اپنے وطن کی حفاظت کے لیے لڑسکیں مگر چینی حکومت نے جواب دیا کہ تم اس وقت جو تعلیم حاصل کر رہے ہو یہ بھی قوم ہی کے لیے ہے۔ اس لیے اس کو بیچ میں مت چھوڑو ایک چینی طالب علم نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں مجھ سے کہا ''چین...... ہندوستان..........ہم دوست۔''

ہندوستانی تاجر:

ہمارے درجے میں تقریباً ایک درجن ہندوستانی تاجر ہیں۔ ایک کولمبو جارہا ہے، جہاں اس کی دوکان ہے۔ ایک سنگاپور میں کاروبار کرتا ہے، تین ہانگ کانگ جارہے ہیں اور باقی سب سامان خریدنے جاپان جارہے ہیں۔ ان سے باتیں کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ جاپان نے کس طرح ہندوستان کی منڈیوں پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ یہ لوگ کاروبار کے بین الاقوامی اور سیاسی پہلو کو نہیں سمجھتے، وہ یہ نہیں جانتے کہ جاپان کس طرح اپنے اقتصادی اور کاروباری ذرائع کو چین پر قبضہ کرنے کے لیے استعمال کررہا ہے۔ وہ تو بازار کے نرخ سے واقف ہیں اور جاپانی مال اس لیے خریدتے ہیں کہ سستا ہوتا ہے۔ اس میں ان کا کوئی زیادہ قصور بھی نہیں ہے۔ اگر جاپانی مال کا بائیکاٹ کرنا ہے تو اس کے لیے ہمیں باقاعدہ تمام ملک میں پروپیگنڈا کرنا ہوگا ایک دو آدمیوں سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔

ان تاجروں میں ایک نوجوان سندھی لڑکا قابلِ ذکر ہے۔ اس کی عمر کوئی پچیس سال کی ہوگی مگر وہ کاروبار کے سلسلے میں تقریباً تمام دنیا گھوم چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض سندھی تاجروں کا کاروبار تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کی دوکانوں کی شاخیں چین، جاپان، یورپ، امریکہ وغیرہ سب جگہ موجود ہیں۔ یہ لڑکا اس سے پہلے جبرالٹر میں کام کرتا تھا۔ اب اس کو ہانگ کانگ بھیجا جارہا ہے۔ یہ سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ہمارے ملک میں بھی (جہاں والدین اپنے لڑکوں کو دہلی سے بمبئی اکیلے بھیجتے گھبراتے ہیں) غیر ملکوں کے سفر کی کاروباری اہمیت کو سمجھا جارہا ہے۔

اٹلی

شام کو جہاز کولمبو پہنچ جائے گا۔ جہاز کی تصویروں کے پوسٹ کارڈ خرید کر گھر والوں اور دوستوں کو خط لکھے، معلوم ہوا کہ ڈاک کے ٹکٹ بھی یہیں مل سکتے ہیں۔ جب ٹکٹ خریدے تو دیکھا کہ ان پر اٹلی کے بادشاہ وکٹر ایمانول کی تصویر ہے۔ یہ کیسے؟ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اگرچہ ہم بحیرۂ عرب میں اور ہندوستان کے ساحل کے بالکل قریب ہیں۔ مگر یہ جہاز ہر لحاظ سے اٹلی کا ٹکڑا ہے۔ ایک تیرتا ہوا اٹلی جب تک ہم اس جہاز پر ہیں، ہم اطالوی قانون کے ماتحت ہیں۔ جہاز پر جتنے خط ڈالے جائیں گے ان پر اٹلی کے ٹکٹ لگانے ہوں گے۔ جہاز والے نہیں چاہتے کہ ہم ایک منٹ کے لیے بھی یہ نہ بھولیں کہ ہم فی الحال اٹلی کی ''سرزمین'' پر ہیں۔ جہاز کے اوپر فاشی پارٹی کا مخصوص نشان (لکڑیوں کا بندھا ہوا گٹھا اور کلہاڑ) بنا ہوا ہے۔ مسولینی کی تصویریں جابجا لگی ہیں، بیٹھنے کے کمرے میں ایک چھوٹی سی لائبریری بھی ہے۔ جس میں کئی موٹی موٹی کتابیں مسولینی کی زندگی اور فاشیست کے سیاسی نظام کے متعلق ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان کو کوئی پڑھتا ہی نہیں!

کولمبو:

تقریباً پانچ بجے ہمارا جہاز کولمبو کی بندرگاہ کے باہر لنگر انداز ہوا۔ یہاں کنارے پر پانی کافی گہرا نہیں ہے۔ اس لیے بھاری جہازوں کو دور ہی ٹھہرنا پڑتا ہے۔ لنکا کے متعلق بہت کچھ سنتے آئے تھے' جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نکلا' شاید بارش ہو رہی تھی اس لیے اچھا نہیں معلوم ہوا مگر کولمبو کا پہلا منظر جو ڈک پر سے دیکھا تو کافی حوصلہ شکن تھا۔ ساحل کے کنارے کنارے میلوں

تنگ نیچی چھت کی ٹین کی بدصورت عمارتیں چلی گئی ہیں۔ چار پانچ چھوٹے چھوٹے جہاز کوئلے سے بھرے ہوئے کھڑے ہیں۔ راون کی لنکا کو (جس کا رامائن میں اس قدر ذکر ہے) تو ایک سحر آفریں ملک ہونا چاہیے تھا اور یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا ولایت کی گھٹیا بندرگاہیں، جن کو فلموں میں دیکھا ہے مگر اس میں کولمبو کا کیا قصور ہے، روایات کی بنا پر ہم ہر جگہ کی ایک خیالی تصویر قائم کر لیتے ہیں جو اکثر غلط ثابت ہوتی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ کولمبو کے ساحل پر خوب صورت تاڑ اور کھجور کے درختوں کے جھنڈ ہوں گے، مگر ان کے بجائے دیکھا کہ ٹین کے گوداموں کے آگے ایک بہت بڑا بورڈ لگا ہے۔ جس پر انگریزی میں لکھا ہے۔ ''اچھی چائے کے لیے سیلون'' CEYLON FOR GOOD TEA موجودہ کاروباری تمدن کی اشتہار بازی۔ اور یہ سوچ کر تو یہ اعلان اور بھی برا معلوم ہوا کہ سیلون کے چائے کے کھیتوں میں یورپین مالک سیلونی اور ہندوستانی مزدوروں پر کتنا ظلم کرتے ہیں۔

علی گڑھ کے پرانے ساتھی بدیع الدین جن کو پہلے اطلاع دے دی تھی مجھ سے ملنے کے لیے موجود تھے۔ ان کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر ساحل پر گیا۔ اتنا بڑا شہر دیکھنے کے لیے چار گھنٹے کافی تو نہیں ہوتے، مگر پھر بھی موٹر میں گھوم کر بہت کچھ دیکھا۔ بمبئی کلکتہ کے برابر تو نہیں مگر تقریباً اسی انداز کا شہر ہے۔ یعنی ایک حصہ تو مغربی وضع کا امیروں رئیسوں افسروں کے رہنے کے لیے، صاف اور چوڑی سڑکیں۔ بڑی بڑی دوکانیں، اونچے اونچے عالیشان مکان، پارک اور باغ۔ دوسرا حصہ وہ جہاں شہر کی 80 فی صدی آبادی رہتی ہے۔ یہاں تنگ بازار، بھیڑ، شور، افلاس اور گندگی۔

عرب جہاز رانوں کی اولاد:

کولمبو کی آبادی زیادہ تر سنگھالی نسل کی ہے یہ لوگ زیادہ تر غربت کی حالت میں رہتے ہیں۔ بڑی بڑی دوکانیں اور چائے کا کاروبار یورپین تاجروں کے ہاتھ میں ہے۔ چھوٹی دوکانیں عام طور سے مدراسیوں اور گجراتیوں کی ہیں۔ اصل باشندے مزدوری کر کے پیٹ پالتے ہیں یا تھوڑی سی تعداد میں جو پڑھ لکھ گئے ہیں۔ وہ سرکاری نوکری کرتے ہیں۔ یہاں کی آبادی میں کافی تعداد مسلمانوں کی بھی ہے جو ان عرب جہاز رانوں کی اولاد ہیں جو تیرہویں اور چودھویں

صدی میں تجارت کے لیے ہندوستان آیا کرتے تھے۔

سیلون ایک برطانوی شاہی مقبوضہ CROWN COLOR ہے انگریز افسروں کی حکومت ہے، ایک کاؤنسل ہے جس کے ممبروں کا الیکشن ہوتا ہے۔ مگر اب تک پارٹی بندی نسلی اور مذہبی بنیادوں پر ہے۔ سنگھالیوں، مدراسی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ پارٹیاں ہیں۔ ''سیلون قومی کانگریس CEYLON NATIONAL CONGRESS نام ہی کی ہے اور ہماری لبرل پارٹی کے اصولوں پر چلتی ہے۔ مگر اب نوجوان اشترا کیوں کی ایک جماعت 'لنکا ساما سماج' اقتصادی سوالوں کو لے کر اٹھی ہے۔ اس میں سب فرقوں کے لوگ موجود ہیں اور اس کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ سیلون کی سیاسی اور اقتصادی آزادی میں اس پارٹی کا وہی نمایاں حصہ ہوگا جو کانگریس کا ہندوستان میں ہے۔

رات کو خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ معلوم نہیں اب بریانی کب نصیب ہو۔ 9 بجے جہاز نے لنگر اٹھایا۔

پانی ہی پانی:

30 جون سے 3 جولائی تک، چاروں طرف پانی ہی پانی، زمین کا کہیں پتہ نہیں۔ اب ہم کھلے سمندر (بحر ہند) میں ہیں۔ خط استوا EQUATOR کے بالکل قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لیے گرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ کیبن میں بیٹھنا ناممکن ہے۔ پنکھے کی ہوا بھی گرم ہے۔ تمام دن مسافر ڈک پر یا سیلون SALOON میں تاش کھیل کر گزارتے ہیں۔ وقت کاٹنا مشکل ہے۔ زیادہ تر وقت باتوں میں گزرتا ہے۔ سیکنڈ کلاس کے تین ہندوستانی مسافر بھی ہمارے درجے میں آجاتے ہیں اور سب ہندوستانیوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ کم از کم یہاں فرقہ وارانہ اختلافات نہیں۔ ہندو مسلمان، یہودی، عیسائی سب ایک ہی ہیں۔ سب ہندوستانی مسافر ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جو لوگ جاپان جا رہے ہیں ان کا اصرار ہے کہ میں بھی ہانگ کانگ پر جہاز تبدیل کروں اور شنگھائی نہ جاؤں کیونکہ اس کے آس پاس اب لڑائی ہو رہی ہے۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ میرا ارادہ خطرہ کے مقام کے قریب بھی جانے کا نہیں۔ مگر پھر بھی یہ لوگ میری سلامتی کی فکر سے پریشان ہیں۔

جہاز کی دلچسپیاں:

وقت گزارنے کے لیے مختلف دلچسپیاں ہیں۔ یورپین مسافروں کے کئی گروہ تو دن رات تاش کھیلتے ہیں اور شراب پیتے ہیں بعض لوگ کینوس کے پانی کے تالاب میں مچھلی کی طرح پڑے رہتے ہیں۔ ڈک پر کئی قسم کے کھیل ہیں، مگر دو پہر کو اتنی گرمی ہوتی ہے کہ ان کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں کرتا۔ ہندوستانی مسافر زیادہ تر گپ میں وقت گذارتے ہیں۔ مجھے کئی سال کے بعد فرصت نصیب ہوئی ہے۔ چند کتابیں جو ساتھ لے کر چلا تھا وہ ختم کر کے، جہاز کی لائبریری سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ پرل بک PEARL BOOK کے ناول جو چین کے متعلق ہیں پڑھ رہا ہوں۔ یہ مصنفہ وہی مشہور امریکن عورت ہے جس کو اس سال ادب کی خدمت کے لیے نوبل انعام NOBLE PRIZE ملا ہے۔ اس نے اپنی عمر کا کافی حصہ اپنے شوہر کے ساتھ چین میں گزارا ہے۔ اپنے ناولوں میں اس نے چین کے بدلتے ہوئے سماجی حالات کی نہایت دل چسپ اور سچی تصویر پیش کی ہے۔ چین کی قومی حکومت نے بھی اس کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ کتابیں پڑھنے کے علاوہ لکھنے کا بھی آج کل بہت وقت ملتا ہے۔ دوستوں اور عزیزوں کو خط لکھے 'بمبئی کرانیکل' کے لیے اپنا ہفتہ وار مضمون تیار کیا۔ پھر بھی دن کاٹنا مشکل معلوم ہوتا ہے آخر ایک ناول لکھنا شروع کر دیا ہے۔ معلوم نہیں کبھی پورا ہوگا یا نہیں۔ اگر شنگھائی تک بجائے دس دن کے مہینے ڈیڑھ مہینے کا راستہ ہوتا تو ضرور پورا ہو جاتا۔ جہاز پر آ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی معمولی زندگی میں کتنا وقت روزانہ ضائع کرتے ہیں، تقریباً تین گھنٹے تو روزانہ مکان سے دفتر آنے جانے میں بیکار جاتے ہیں، اور معلوم نہیں کتنا وقت دوستوں سے گپ کرنے میں، کسی سے ملنے چلے گئے تو چند گھنٹے اس میں نکل گئے اور یہاں جہاز پر سوائے کیبن سے ڈک پر آ جانے کے اور کوئی جگہ ہی نہیں جہاں جا سکے، نہ یار دوست ہی ہیں، نہ سنیما اور تھیٹر، نہ اپالو بندر اور چوپاٹی اور نہ مالا بار ہل۔

سنیما:

مگر نہیں اور کچھ ہو نہ ہو سنیما تو ضرور جہاز پر بھی موجود ہے۔ کولمبو چھوڑنے کے تیسرے دن سیلون SALOON میں اشتہار لگ گیا کہ آج رات کو فرسٹ کلاس کی ڈک پر سنیما دکھایا جائے

گا۔ دن بھر اسی امید میں گزرا کہ تفریح کی کوئی صورت تو ہوئی، کھانے کے بعد فرسٹ کلاس کی ڈک پر گئے، آج پہلی بار ہماری اور اونچے درجے والوں کی ڈک کے درمیان کا دروازہ کھلا ہے۔ فرسٹ کلاس کے شاندار اور پرتکلف کیبنوں میں جھانکنے کا موقع ملا۔ کھانے کا کمرہ، بیٹھنے کا کمرہ، لائبریری وغیرہ کو دیکھ کر کسی راجا کے محل کا دھوکا ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو سوائے شیشوں میں سے جھانکنے کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں آکر اچھی طرح سے اس نئی چھوت چھات کا پتہ چلتا ہے۔ جو پیدائشی ذات پات کی تفریق کے بجائے امیری اور غریبی پر قائم ہے۔

سنیما کا پروگرام کافی لچر ثابت ہوا، چار پانچ سال پرانے فلم دکھائے گئے۔ مگر یہ اطمینان تھا کہ پیسے نہیں دینے پڑے۔ اس کے علاوہ جہاز کی زندگی سے سب اس قدر اکتا گئے ہیں کہ اگر اس سے بھی خراب فلم دکھائے جاتے تو وہ بھی غنیمت سمجھے جاتے، یہ سنیما فرسٹ کلاس کی فراخ ڈک کے ایک کونے میں قائم کیا گیا تھا۔ ایک طرف پردہ لگا ہوا تھا اور اس کے آگے سو سوا سو کرسیاں ڈال دی تھیں۔ سمندر پر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کبھی کبھی لہروں کے شور میں فلم کے کرداروں کی گفتگو سنائی نہیں دیتی تھی۔ مجھے اپنے اخباری کام کے سلسلے میں تقریباً ہر روز ایک فلم دیکھنا پڑتا ہے مگر یہ جہاز کا سنیما دیکھنا ایک نیا اور دل چسپ تجربہ تھا۔

اُڑنے والی مچھلیاں:

3 جولائی۔ اس ماحول میں معمولی سے معمولی تبدیلی بھی سنسنی خیز بن جاتی ہے۔ آج صبح ہمارے کیبنوں کی گول کھڑکیاں PORT HOLE کھول دی گئیں۔ اب سمندر میں طوفان کم ہو گیا ہے۔ خدا خدا کر کے اب چین سے رات کو سو سکتے ہیں، دن میں بھی اب کیبن بھٹی کی طرح نہیں تپتا۔ آج دن بھر جہاز کے دونوں طرف سمندر میں اُڑنے والی مچھلیاں نظر آتی رہیں۔ مگر ان کا اڑنا پرندوں کی طرح نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ چند سیکنڈ تک ہی وہ ہوا میں قائم رہ سکتی ہیں مگر ایک جست میں کئی گز پار کر جاتی ہیں۔ شام کے قریب ہماری مخالف طرف سے آتا ہوا ایک جہاز قریب سے گزرا، تمام مسافر ڈک پر جمع ہو گئے، یہ جہاز اسی کمپنی کا ہے۔ اس لیے دونوں کے کپتانوں میں جھنڈوں کے اشاروں سے باتیں ہوئیں۔ آج کی شام بہت پر فضا تھی۔ رنگ

برنگ کے بادل سورج کی آخری کرنوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ سورج جو ایک تاریخی گیند کے مانند تیر رہا تھا آخر کار خونیں سمندر میں ڈوب گیا۔ دور بہت دور اپنے وطن ہندوستان میں اب بھی دن کی روشنی ہوگی۔ مغرب میں ابھی شفق کی سرخی باقی تھی مگر مشرق میں جلد ہی اندھیرا چھا گیا۔

سنگاپور:

4 جولائی۔ صبح، آنکھ کھلی تو کھڑکی میں سے سرسبز زمین نظر آئی۔ جلدی ناشتہ سے فارغ ہو کر ڈک پر گیا تو نہایت دل کش سماں نظر آیا۔ جہاز ایک تنگ آبنائے میں سے گزر رہا تھا۔ ایک طرف سماٹرا کا جزیرہ ہے اور دوسری طرف خاکنائے ملایا۔ یہ محسوس کر کے کہ ہم ایک ہی وقت میں دو مختلف ملکوں کو دیکھ رہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا جغرافیہ کے نقشہ میں دفعتاً زندگی کا رنگ بھر دیا گیا ہو۔ اسکول میں جغرافیہ پڑھنے اور نقشے دیکھنے کے بعد دل میں ایک شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ شاید یہ سب کسی نے ایسے ہی لکھ دیا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے گویا پہلی بار واقعی جغرافیہ پڑھ رہا ہوں۔ نہ صرف جغرافیہ بلکہ تاریخ اور بین الاقوامی سیاسیات، دائیں بازو سماٹرا کے خوب صورت جزیرہ پر ہالینڈ کا قبضہ ہے، بائیں طرف ملایا برطانیہ کی ملکیت ہے۔ دنیا کی بساط پر شہنشاہیت کے پھیلے ہوئے مہرے۔

دوپہر کو سخت گرمی رہی نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اب ہم خط استوا کے بالکل قریب آ گئے ہیں۔ کھانے کے کمرے میں ایک نقشہ لگا ہوا ہے۔ جس پر ہمارے جہاز کا راستہ ایک لکیر کھینچ کر دکھایا گیا ہے۔ ہر روز دوپہر کے بارہ بجے جہاں جہاز ہوتا ہے نقشہ پر اس جگہ ایک چھوٹی سی کاغذ کی جھنڈی لگا دی جاتی ہے۔ آج جب یہ جھنڈی لگائی گئی تو کافی ہجوم تھا۔ اوپر ڈک پر جا کر بعض مسافر اِدھر اُدھر غور سے دیکھ رہے تھے شاید اس امید میں کہ سمندر پر بھی خط استوا نظر آئے گا۔ سہ پہر کے تین بجے سنگاپور پہنچ گئے۔

جنگی جہاز:

سب سے پہلی چیز سنگاپور کی بندرگاہ میں نظر آئی وہ ایک زبردست برطانوی جنگی جہاز تھا جو ایک مہیب دیو کی طرح لنگر ڈالے کھڑا تھا۔ نقشہ دیکھنے سے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ کیوں

برطانیہ نے سنگاپور میں اپنے جنگی جہازوں کا زبردست بیڑا رکھا ہے۔ مشرق میں سنگاپور برطانوی بحری فوج کی سب سے بڑی اور اہم چھاؤنی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ سنگاپور پر۔ چین، ہندوستان اور آسٹریلیا کے راستے آکر ملتے ہیں۔ ان دونوں ملکوں میں اپنی حکومت اور تاجرانہ کاروبار کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ اس مقام پر قبضہ کیا جائے، اسی غرض سے 1819 میں سنگاپور کو برطانوی سلطنت میں شامل کرلیا گیا تھا۔ اس کے بعد جاپان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھتے ہوئے اور بھی ضروری ہوا کہ اس مورچے کو اور مستحکم بنایا جائے، اسی لیے پچھلے سال کروڑوں روپے کے خرچ سے یہاں جنگی جہازوں کی زبردست چھاؤنی بنائی گئی ہے مگر اس چھاؤنی کے آس پاس جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

چینی:

سنگاپور میں جو چند گھنٹے گزارے وہ بھی یادگار رہیں گے۔ اس لیے کہ چین کا پہلا منظر اس شہر میں دیکھا۔ جغرافیہ کے لحاظ سے بے شک سنگاپور چین میں نہیں بلکہ خاکنائے ملایا میں شامل ہے۔ مگر یہاں کی زیادہ تر آبادی چینی ہے۔

یہ لاکھوں کی تعداد میں چینی یہاں کیوں آباد ہیں؟ جب انگریزوں نے سنگاپور کے قریب ٹین کی کانوں کو دریافت کیا تب ان کانوں میں کام کرنے کے لیے چینی قلیوں کو لایا گیا۔ جن مکانوں میں یہ رہتے ہیں وہ سرمایہ داری نظام کے ظلم اور ناانصافی کا ثبوت ہیں۔ تنگ اور تاریک گلیاں۔ ان میں کئی کئی منزل کے مکان جن کی مرمت شاید پچاس برس سے نہیں ہوئی۔ ہر مکان میں سینکڑوں کوٹھریاں، اور ہر کوٹھری میں ایک چینی مزدور کا خاندان، یہیں اسی تاریکی اور گندگی میں وہ پیدا ہوتے ہیں، یہیں رہتے ہیں اور یہیں مر جاتے ہیں۔ ہمارے ہندوستان میں بھی مزدور جن مکانوں میں رہتے ہیں وہ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مگر اپنے ملک کی مصیبت دیکھتے دیکھتے عادت ہو جاتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں ان حالات کو دیکھ کر زیادہ احساس ہوتا ہے۔

ہندوستانی:

علاوہ چینیوں کے سنگاپور میں باقی آبادی ملایا کے باشندوں اور ہندوستانیوں کی ہے۔ ملایا

والے عام طور سے چھوٹے قد اور گہرے سانولے رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان میں اکثر مسلمان ہیں، ہندوستانی زیادہ تر ٹین کی کانوں یا بڑے کارخانوں میں مزدوری کرتے ہیں لیکن تھوڑی سی تعداد سندھی تاجروں کی بھی ہے، جو سنگاپور کے کاروبار پر کافی حد تک حاوی ہیں، بازار میں برابر برابر تین دوکانوں کے بورڈ لی دو اینڈ کو۔ نسیم صالح۔ کشن چند'' چینی۔ ملایا اور ہندوستانی تاجر، یہی تین قومیں یہاں آباد ہیں۔

بائیکاٹ:

سنگاپور پہنچ کر پہلی بار چین اور جاپان کی جنگ کا پتہ ملتا ہے۔ ہر چینی کی صورت پر اپنے وطن کی مصیبت کا احساس نظر آتا ہے۔ سینکڑوں چینی جو جاپان کے بموں اور گولوں کی بدولت بے گھر ہو گئے ہیں سنگاپور چلے آئے ہیں اور یہاں ان کے ہم وطن ان کی پرورش کرتے ہیں، حال ہی میں انگریزی حکومت نے ایسے چینیوں کا آنا بند کر دیا ہے۔ مگر اس کے خلاف سنگاپور کی چینی آبادی نے زبردست احتجاج کیا ہے، وطن پرستی اس کا نام ہے کہ گو خود بھوکے مرتے ہیں اور مصیبت سے رہتے ہیں مگر اپنے ہم وطنوں کی مدد کے لیے پھر بھی تیار ہیں، میں ایک سندھی تاجر کی دوکان میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک متوسط درجے کی چینی لڑکی کپڑا خریدنے آئی۔ دوکاندار سے کہا مجھے بہت سستا کپڑا چاہیے۔ اس نے کئی تھان سامنے رکھ دیئے، مگر یہ سب جاپانی مال تھا، اس لیے لڑکی نے خریدنے سے انکار کر دیا، جب دوکاندار نے کہا کہ سستا مال تو جاپانی ہی ہوگا تو لڑکی نے جواب دیا، پھر میں اس سال کپڑا ہی نہیں بناؤں گی۔''

بعد میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سنگاپور کی تمام چینی آبادی نے جاپانی مال کا پورا پورا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ حالانکہ اس وجہ سے انھیں بہت سی ضروریات سے محروم رہنا پڑتا ہے۔

چینی نواب:

کئی سال ہوئے کسی ضرورت سے مجھے شمالی ہندوستان کی ایک ریاست میں جانا ہوا تھا۔ (ریاست کا نام لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ریاستیں سب ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں) وہاں بعض افسروں کی مہربانی سے مجھے نواب صاحب کے محل کو دیکھنے کا موقع ملا تھا، دولت اور بدمذاقی

کا اچھا خاصا نمونہ تھا۔ ہر کمرے میں اتنی تصویریں لگی ہوئی تھیں کہ ان میں سے ایک کو بھی دیکھنا مشکل تھا، فرنیچر ہر قسم اور ہر زمانے کا اس طرح بھرا ہوا تھا گویا کباڑی کی دوکان ہے، عظیم الشان میزوں پر چاندی کے قلم دان، مگر دواتوں میں کبھی روشنائی ہی نہ پڑی تھی۔ ہر طرف بے ترتیبی، لاپرواہی اور بدمذاقی۔ تقریباً وہی منظر سنگاپور کے ایک چینی نواب کے محل میں دیکھا، جو شام کو تماشائیوں کے لیے کھلا رہتا ہے۔ آرٹ اور فن کے سینکڑوں نادر نمونے تھے، مگر سب اس بری طرح سے کھچا کھچ بھر گئے تھے کہ کمرے گودام معلوم ہوتے تھے، باہر شاندار باغ تھا۔ جس میں چھوٹے چھوٹے گڑیا کے گھر کے برابر مندر، مصنوعی پہاڑ، نقلی درخت، جانوروں کے بت۔ معلوم ہوتا تھا کسی دیوانے بچّے کے دماغ سے اس مکان اور باغ کا نقشہ نکلا ہے، اس محل پر کہا جاتا ہے کئی کروڑ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ اگر اس روپے کا صحیح مصرف ہوتا تو سنگاپور کے کئی لاکھ چینی مزدوروں کے لیے معقول مکانوں کا انتظام ہو جاتا اور وہ ان اندھیری اور گندی گلیوں سے نجات پاتے، جہاں وہ اب زندگی گزارتے ہیں۔ سرمایہ داری کے کھیل جو ہندوستان میں ہیں وہی سنگاپور میں۔

ہڑتال:

سنگاپور کے اخبار پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ملایا کی اکثر ٹین کی کانوں میں مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کو مزدوری کافی نہیں ملتی اور کام کرنے کی شرطیں سخت ہیں۔ افسر ظلم کرتے ہیں۔ اب تک چینی مزدور یہ سب ظلم سہتے آئے تھے، مگر اب بیدار ہو رہا ہے' مزدور اس صدی کا' انھوں نے مالکوں کے سامنے اپنی مانگیں رکھیں اور جب وہ منظور نہیں ہوئیں تو ہڑتال کر دی۔ اس ہڑتال میں ہندوستانی اور ملایا مزدور بھی ان کے ساتھ ہیں، اسی سلسلے میں ایک اور واقعہ معلوم ہوا۔ چند ہفتے ہوئے چینی مزدوروں کو معلوم ہوا کہ جس کان میں وہ کام کرتے تھے وہاں سے ٹین جاپان بھیجا جا رہا ہے، ہتھیار بنانے کے لیے۔ یہ سوچ کر کہ یہ وہی ہتھیار ہیں جن کی مدد سے جاپان ان کے ملک پر حملہ کر رہا ہے انھوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ مالکوں نے ان کے بجائے ہندوستانی مزدوروں کو بھرتی کر لیا۔ اس پر چینی مزدوروں کے لیڈروں نے پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ کو ہندوستان تار دیے۔ پنڈت جواہر لال نے فوراً تار کے ذریعہ

سنگاپور کے بعض ہندوستانیوں سے کہا کہ وہ جا کر ہندوستانی مزدوروں کو سمجھائیں کہ اگر چینی مزدوروں نے ہڑتال کر دی ہے تو ان کو بھی ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس لڑائی میں ہندوستان چین کا ساتھی ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی مزدوروں نے بھی کام کرنے سے انکار کر دیا، ہڑتال کامیاب ہوئی اور مالکوں کو وعدہ کرنا پڑا کہ ٹین جاپان نہ بھیجا جائے گا۔

منحوس ستارہ:

شام کو جہاز پر واپس آنے سے پہلے ہم سنگاپور کی ہوائی جہازوں کی چھاؤنی دیکھنے گئے، کہا جاتا ہے کہ تمام دنیا میں پیرس کے بعد یہ ہوائی جہازوں کا سب سے بڑا مرکز ہے، پانچ چھ مختلف ہوائی راستے یہاں ملتے ہیں اس کے علاوہ برطانیہ کی مشرقی سلطنت کے لیے بھی سنگاپور میں ایک زبردست ہوائی چھاؤنی کی ضرورت ہے۔ ہم ابھی یہ جگہ دیکھ ہی رہے تھے کہ اندھیرا چھا گیا۔ چھت پر سے ایک عجیب اور دلچسپ نظارہ دیکھا۔ ایک ہوائی جہاز اپنے ''طویلے'' سے باہر نکالا گیا اور ایک آدمی اس کو اڑا کر اوپر لے گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہوائی جہاز اندھیرے آسمان میں کھو گیا۔ آواز بھی نہیں سنائی دیتی تھی۔ مگر فوراً ہی تین بجلی کے ہنڈے روشن ہو گئے اور ان کا رخ آسمان کی طرف کر دیا گیا۔ روشنی کی تین 'انگلیوں' نے آسمان کو کھوجنا شروع کیا اور جلد ہی ہوائی جہاز کو ڈھونڈ نکالا، ہزاروں فٹ اونچا ہوائی جہاز ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک پروانہ روشنی میں آ کر پھنس گیا ہو۔ تب معلوم ہوا کہ یہ ہوائی جنگ کی مشق ہو رہی ہے، جہاز پر ہم واپس آ گئے اور آہستہ آہستہ جہاز چلنے بھی لگا۔ مگر اوپر آسمان میں یہی 'آنکھ مچولی' کا کھیل جاری تھا۔ ہوائی جہاز ایک منحوس ستارے کی طرح سنگاپور پر منڈلا رہا تھا۔

حاکموں کا پسینہ:

اگلے دن ہم پھر کھلے سمندر میں ہیں۔ گرمی کافی ہے اور تالاب پر ہجوم ہے، ہمارے کمروں کی کھڑکیاں پھر بند کر دی گئی ہیں کیونکہ سمندر میں بے چینی کے آثار نظر آتے ہیں، دن بھر سب لوگ ڈیک پر بیٹھے رہے، گرمی کی وجہ سے ہندوستانی چینی، جرمن اور اطالوی مسافر نیکر، کرتا، پاجامہ، یا اسی قسم کے ہلکے کپڑے پہنے ہوئے ہیں مگر انگریز مسافر اب بھی کالر، ٹائی، واسکٹ

سمیت پورے سوٹ میں نظر آتے ہیں، پسینہ میں شرابور مگر حکومت کے دبدبہ کا اتنا خیال۔
رات کو پھر سنیما دکھایا گیا۔ اس دفعہ پھر چار پانچ سال پرانا امریکن فلم دکھایا گیا جو نہایت غیر دلچسپ ثابت ہوا۔ اس کے بعد اٹلی کے متعلق دو چھوٹے چھوٹے فلم دکھائے گئے۔ ایک میں وہاں کے مشہور مقامات دکھائے گئے اور دوسرے میں اطالوی فوج کی پریڈ دکھا کر ہم پر اپنی طاقت کا رعب ڈالا گیا۔

جہاز پر پریڈ:

7 جولائی۔ صبح اٹھ کر ناشتہ کے بعد چند اور مسافروں کے ساتھ جہاز کے دوسرے کنارے تک گیا۔ تیسرے درجے کی ڈک پر دیکھا کہ مسافروں کے بستر سامان وغیرہ ہٹا کر وہاں جہاز کے ملاحوں اور خلاصیوں کو فوجی پریڈ کرائی جا رہی تھی، یہی لوگ ایک دن مسولینی کے بڑھتے ہوئے ارادوں کی خاطر اپنی جان دیں گے اور دوسروں کی جان لیں گے۔
کل ہانگ کانگ پہنچنے پر جاپان جانے والے سب ہندوستانی مسافر اتر جائیں گے۔ آج دن بھر گپ ہوتی رہی۔ سب کا اصرار ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ ہانگ کانگ اتر کر سیدھا جاپان چلا جاؤں، مگر میں شنگھائی دیکھنے کا یہ موقع نہیں کھونا چاہتا ہوں۔ یہ سب لوگ جو تجارت پیشہ ہیں اور جن کے سفر کی وجہ فقط کاروبار ہے میرے اس شوق پر نہایت تعجب کرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اس خطرے کے علاقے سے نکل جائیں، اگر حالات اجازت دیتے تو میں شنگھائی سے بھی آگے اندرونی چین میں جانے کی کوشش کرتا تاکہ اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ کس طرح بہادر چینی باوجود ہتھیاروں اور فوجی سامان کی کمی کے جاپانی قوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ مگر جس علاقے میں جنگ ہو رہی ہو وہاں غیر ملکیوں کو آنے جانے میں نہ صرف دقت ہوتی ہے بلکہ خرچ بھی بہت ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑے گا۔
شام کو سیکنڈ کلاس کے ہندوستانی مسافر بھی ہماری طرف آ گئے اور ڈک پر جمگھٹا رہا۔ ایک صاحب اپنا گراموفون نکال لائے اور دیر تک ہندوستانی گانوں کے ریکارڈ بجتے رہے، صبح چار بجے ہانگ کانگ پہنچ جائیں گے، اس لیے رات کا کھانا کھا کر سب سویرے ہی سو گئے۔ بعض

ایسے بھی شوقین مزاج ہیں جو اپنے کمبل اٹھا کر ڈک پر آگئے ہیں اور رات کرسیوں پر لیٹ کر گزاریں گے تاکہ سب سے پہلے ہانگ کانگ پر نظر ڈال سکیں۔

ہانگ کانگ:

8 جولائی۔ صبح کے ٹھیک چار بجے تھے جب میری آنکھ کھلی۔ کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو ایسا معلوم ہوا جیسے آسمان کے تارے زمین کے قریب آگئے ہوں، حواس درست ہونے پر یاد آیا کہ یہ ہانگ کانگ کی روشنیاں ہیں، جہاز ٹھہر گیا تھا۔ فقط سامان اتارنے کی کرین CRANE کی گھر گھراہٹ سنائی دے رہی تھی، جلدی جلدی کپڑے پہن کر اوپر ڈک پر گیا تو بہت سے مسافروں کو موجود پایا، بندرگاہ کی روشنیوں میں دیکھا کہ جہاز گودی پر لگ گیا ہے سامان اتارنے کا انتظام ہو رہا تھا۔ مزدوروں کے دھیمے دھیمے سائے حرکت کر رہے تھے۔ سماں دیکھنے کے قابل تھا، معلوم ہوتا تھا شملہ، نینی تال اور مسوری کو سمندر کے کنارے بسا دیا گیا ہے، ہانگ کانگ نیچی نیچی پہاڑیوں کے سلسلے پر آباد ہے، اس لیے تمام شہر کی روشنیاں ایک وقت میں نظر آتی ہیں۔

چین کا دروازہ:

ہانگ کانگ جنوبی چین کا دروازہ ہے، یہاں پہنچ کر انسان آپ سے آپ اس زبردست ملک کی تاریخ اور موجودہ حالات پر غور کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یورپین اور امریکن تمام مشرقی قوموں کی طرح چینیوں کو بھی غیر مہذب سمجھتے ہیں۔ انگریزی ناولوں اور امریکن فلموں میں عام طور سے چینیوں کا کردار نہایت خراب دکھایا جاتا ہے، مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ آج سے ہزاروں برس پہلے جب یورپ کی آبادی کھال لپیٹے پھرتی تھی، چین، تہذیب، تمدن، آرٹ اور ادب کا مرکز تھا، مغرب والوں کو اپنی سائنس کی ایجادوں پر بڑا فخر ہے مگر دراصل انسانی زندگی کے لیے جتنی چیزیں چین میں ایجاد کی گئی ہیں وہ کسی اور ملک میں نہیں ہوئیں۔ ریشم، لکھنے کا کاغذ، سکے سکوں کے بجائے کاغذ کے نوٹ، چائے آتش بازی ان سب چیزوں کا استعمال مغرب نے چین سے سیکھا، بارود چین میں فقط تفریح کے لیے آتش بازی بنانے کے کام آتا تھا، یورپ والوں نے اس سے بندوق اور توپ اور بم جیسے خوفناک ہتھیار بنائے۔ چین کی تہذیب کا مقصد انسان

کی سمجھ بوجھ کو ترقی دینا اور اس کی زندگی کی مشکلوں کو آسان کرنا تھا اور مغربی تہذیب کا مقصد؟ دوسروں کو دھوکہ دے کر، ان پر ناجائز اثر ڈال کر، ڈرا کر، دھمکا کر، روپے کے زور سے، ہتھیاروں کے زور سے اپنی دولت اور اثر کو بڑھانا۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ دس ہزار میل کے فاصلے پر برطانیہ نے ہانگ کانگ پر قبضہ کرنا ضروری سمجھا ہے، کولمبو، سنگاپور، ہانگ کانگ۔ غرض جہاں بھی جاؤ وہاں برطانوی شہنشاہیت (سامراج) کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ ہانگ کانگ پر برطانوی قبضہ دو وجہ سے ضروری تھا، اول تو فوجی نقطۂ نگاہ سے کولمبو اور سنگاپور کی طرح یہ مقام بھی ہندوستان کی 'حفاظت' کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی چین پر قبضہ کرنے کے لیے ہانگ کانگ اتنا ہی ضروری تھا جتنا شنگھائی شمالی چین میں۔ چین میں جمہوریت قائم ہونے کے بعد برطانیہ کا سیاسی اور فوجی اثر اس علاقے میں کم ہو گیا ہو مگر کاروباری دلچسپی باقی ہے۔ ہانگ کانگ کے دروازے سے انگریزی کارخانوں کا مال چین میں داخل ہوتا ہے۔ ہمارے جہاز میں سے بھی لاکھوں کا مال بندرگاہ پر اتارا گیا۔

جاپان کا سایہ:

ہانگ کانگ پر بے شک برطانوی قبضہ ہے۔ جب جہاز سے اتر کر میں شہر کی سیر کو گیا تو ہر جگہ انگریزی دوکانیں، انگریزی بینک، انگریزی گرجا اور انگریزی سپاہی نظر آئے۔ چین کی قومی حکومت پر دباؤ ڈال کر انگریزوں نے اس بندرگاہ پر اپنا قبضہ قائم رکھا تھا۔ مگر اب جاپان کا خوفناک سایہ بڑھتا ہوا آ رہا ہے۔ میں ہانگ کانگ کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر گیا، وہاں سے تمام شہر نظر آتا ہے، ہانگ کانگ کے دو حصے سمجھنے چاہئیں، شہر کا زیادہ تر حصہ تو ایک جزیرے پر آباد ہے۔ بمبئی کی طرح، اس جزیرے اور چین کی سرزمین کے درمیان فقط ایک میل چوڑا سمندر کا حصہ ہے۔ اس لیے شہر کا ایک حصہ دوسری طرف بھی آباد ہے، جس کو کاؤلون کہتے ہیں۔ یہاں سے ریل کی لائن جنوبی چین کے سب سے بڑے شہر کینٹن کو جاتی ہے۔ جو تقریباً سوا سو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس ریلوے لائن پر جاپانی ہوائی جہاز برابر گولے برساتے رہتے ہیں تا کہ چین کی حکومت ہتھیار اور دوسرا ضروری سامان ہانگ کانگ کے راستے سے نہ لا سکے، شنگھائی ختم ہونے

کے بعد اب دوسرے ملکوں سے تجارتی تعلقات رکھنے کے لیے ہانگ کانگ ہی چین کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔ مگر جاپانیوں کی پوری کوشش ہے کہ یہ راستہ بھی بند ہو جائے۔ جس وقت تک جاپانی، چینی شہروں پر بم اور گولے برساتے ہیں انگریز اطمینان سے بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر ان کو یہ نہیں معلوم کہ اگر جنوبی چین پر جاپانی قبضہ ہو گیا تو پھر ہانگ کانگ کی بھی خیر نہیں کیونکہ ایک میان میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو سامراجی طاقتیں نہیں رہ سکتیں۔

جنگ کی برسی:

جس دن ہم ہانگ کانگ پہنچے اس سے ایک دن پہلے تمام چین میں موجودہ جنگ کی پہلی برسی منائی گئی تھی۔ سال بھر ہوئے اسی تاریخ کو جاپانی فوجوں نے شمالی چین پر قبضہ کیا تھا چینی قوم پرستوں نے چین کے ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں جلسے کیے اور اس جنگ کی اہمیت لوگوں کو سمجھائی۔ جاپان کے خوفناک ارادوں سے قوم کو آگاہ کیا اور ہر چینی مرد اور عورت نے قسم کھائی کہ اس وقت تک اطمینان سے نہ بیٹھیں گے جب تک جاپانی فوج کو اپنے ملک سے بالکل نہ نکال دیں گے، ایک ہندوستانی تاجر سے معلوم ہوا کہ ہانگ کانگ میں بھی یہ برسی زور شور سے منائی گئی تھی، علاوہ جلسوں اور جلوس کے ہانگ کانگ والوں نے ہزاروں روپیہ قومی حکومت کے جنگی فنڈ کے لیے جمع کیا۔ آج کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ہماری ہندوستانی کانگریس نے ایک طبی مشن چین بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس خبر پر چینی اخباروں اور عوام نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور بہت سے چینی جو مجھے ملے انھوں نے اتنی گرمجوشی سے میرا شکریہ ادا کیا گویا یہ طبی مشن میں نے خود ذاتی کوشش سے بھجوایا ہے۔

کینٹن پر بم:

ہانگ کانگ کے شاندار کاروباری علاقہ کو چھوڑ کر شہر کے اندر گلیوں کوچوں میں جا کر چینی آبادی کی مفلسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مزدور پیشہ چینی تو پہلے بھی غریب تھے مگر جب سے موجودہ جنگ شروع ہوئی ہے اندرون ملک سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ پناہ لینے کے لیے ہانگ کانگ آگئے ہیں، ان سب کے رہنے کھانے کا انتظام بھی ہانگ کانگ کے چینیوں نے کیا ہے۔

سمیت پورے سوٹ میں نظر آتے ہیں، پسینہ میں شرابور مگر حکومت کے دبدبہ کا اتنا خیال۔

رات کو پھر سینما دکھایا گیا۔ اس دفعہ پھر چار پانچ سال پرانا امریکن فلم دکھایا گیا جو نہایت غیر دلچسپ ثابت ہوا۔ اس کے بعد اٹلی کے متعلق دو چھوٹے چھوٹے فلم دکھائے گئے۔ ایک میں وہاں کے مشہور مقامات دکھائے گئے اور دوسرے میں اطالوی فوج کی پریڈ دکھا کر ہم پر اپنی طاقت کا رعب ڈالا گیا۔

جہاز پر پریڈ:

7 جولائی۔ صبح اٹھ کر ناشتہ کے بعد چند اور مسافروں کے ساتھ جہاز کے دوسرے کنارے تک گیا۔ تیسرے درجے کی ڈک پر دیکھا کہ مسافروں کے بستر سامان وغیرہ ہٹا کر وہاں جہاز کے ملاحوں اور خلاصیوں کو فوجی پریڈ کرائی جا رہی تھی، یہی لوگ ایک دن مسولینی کے بڑھتے ہوئے ارادوں کی خاطر اپنی جان دیں گے اور دوسروں کی جان لیں گے۔

کل ہانگ کانگ پہنچنے پر جاپان جانے والے سب ہندوستانی مسافر اتر جائیں گے۔ آج دن بھر گپ ہوتی رہی۔ سب کا اصرار ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ ہانگ کانگ اتر کر سیدھا جاپان چلا جاؤں، مگر میں شنگھائی دیکھنے کا یہ موقع نہیں کھونا چاہتا ہوں۔ یہ سب لوگ جو تجارت پیشہ ہیں اور جن کے سفر کی وجہ فقط کاروبار ہے میرے اس شوق پر نہایت تعجب کرتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اس خطرے کے علاقے سے نکل جائیں، اگر حالات اجازت دیتے تو میں شنگھائی سے بھی آگے اندرونی چین میں جانے کی کوشش کرتا تاکہ اپنی آنکھوں سے دیکھوں کہ کس طرح بہادر چینی باوجود ہتھیاروں اور فوجی سامان کی کمی کے جاپانی قوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ مگر جس علاقے میں جنگ ہو رہی ہو وہاں غیر ملکیوں کو آنے جانے میں نہ صرف دقت ہوتی ہے بلکہ خرچ بھی بہت ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑے گا۔

شام کو سیکنڈ کلاس کے ہندوستانی مسافر بھی ہماری طرف آ گئے اور ڈک پر جمگھٹا رہا۔ ایک صاحب اپنا گراموفون نکال لائے اور دیر تک ہندوستانی گانوں کے ریکارڈ بجتے رہے، صبح چار بجے ہانگ کانگ پہنچ جائیں گے، اس لیے رات کا کھانا کھا کر سب سویرے ہی سو گئے۔ بعض

ایسے بھی شوقین مزاج ہیں جو اپنے کمبل اٹھا کر ڈک پر آ گئے ہیں اور رات کرسیوں پر لیٹ کر گزاریں گے تاکہ سب سے پہلے ہانگ کانگ پر نظر ڈال سکیں۔

ہانگ کانگ:

8 جولائی۔ صبح کے ٹھیک چار بجے تھے جب میری آنکھ کھلی۔ کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو ایسا معلوم ہوا جیسے آسمان کے تارے زمین کے قریب آ گئے ہوں، حواس درست ہونے پر یاد آیا کہ یہ ہانگ کانگ کی روشنیاں ہیں، جہاز ٹھہر گیا تھا۔ فقط سامان اتارنے کی کرین CRANE کی گھر گھراہٹ سنائی دے رہی تھی، جلدی جلدی کپڑے پہن کر اوپر ڈک پر گیا تو بہت سے مسافروں کو موجود پایا، بندرگاہ کی روشنیوں میں دیکھا کہ جہاز گودی پر لگ گیا ہے سامان اتارنے کا انتظام ہو رہا تھا۔ مزدوروں کے دھیمے دھیمے سائے حرکت کر رہے تھے۔ سماں دیکھنے کے قابل تھا، معلوم ہوتا تھا شملہ، نینی تال اور مسوری کو سمندر کے کنارے بسا دیا گیا ہے، ہانگ کانگ نیچی نیچی پہاڑیوں کے سلسلے پر آباد ہے، اس لیے تمام شہر کی روشنیاں ایک وقت میں نظر آتی ہیں۔

چین کا دروازہ:

ہانگ کانگ جنوبی چین کا دروازہ ہے، یہاں پہنچ کر انسان آپ سے آپ اس زبردست ملک کی تاریخ اور موجودہ حالات پر غور کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یورپین اور امریکن تمام مشرقی قوموں کی طرح چینیوں کو بھی غیر مہذب سمجھتے ہیں۔ انگریزی ناولوں اور امریکن فلموں میں عام طور سے چینیوں کا کردار نہایت خراب دکھایا جاتا ہے، مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ آج سے ہزاروں برس پہلے جب یورپ کی آبادی کھال لپیٹے پھرتی تھی، چین، تہذیب، تمدن، آرٹ اور ادب کا مرکز تھا، مغرب والوں کو اپنی سائنس کی ایجادوں پر بڑا فخر ہے مگر دراصل انسانی زندگی کے لیے جتنی چیزیں چین میں ایجاد کی گئی ہیں وہ کسی اور ملک میں نہیں ہوئیں۔ ریشم، لکھنے کا کاغذ، سکے سکوں کے بجائے کاغذ کے نوٹ، چائے آتش بازی ان سب چیزوں کا استعمال مغرب نے چین سے سیکھا، بارود چین میں فقط تفریح کے لیے آتش بازی بنانے کے کام آتا تھا، یورپ والوں نے اس سے بندوق اور توپ اور بم جیسے خوفناک ہتھیار بنائے۔ چین کی تہذیب کا مقصد انسان

کی سمجھ بوجھ کو ترقی دینا اور اس کی زندگی کی مشکلوں کو آسان کرنا تھا اور مغربی تہذیب کا مقصد؟ دوسروں کو دھوکہ دے کر، ان پر ناجائز اثر ڈال کر، ڈرا کر، دھمکا کر، روپے کے زور سے، ہتھیاروں کے زور سے اپنی دولت اور اثر کو بڑھانا۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ دس ہزار میل کے فاصلے پر برطانیہ نے ہانگ کانگ پر قبضہ کرنا ضروری سمجھا ہے، کولمبو، سنگاپور، ہانگ کانگ۔ غرض جہاں بھی جاؤ وہاں برطانوی شہنشاہیت (سامراج) کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ ہانگ کانگ پر برطانوی قبضہ دو وجہ سے ضروری تھا، اول تو فوجی نقطۂ نگاہ سے کولمبو اور سنگاپور کی طرح یہ مقام بھی ہندوستان کی 'حفاظت' کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی چین پر قبضہ کرنے کے لیے ہانگ کانگ اتنا ہی ضروری تھا جتنا شنگھائی شمالی چین میں۔ چین میں جمہوریت قائم ہونے کے بعد برطانیہ کا سیاسی اور فوجی اثر اس علاقے میں کم ہوگیا ہو مگر کاروباری دلچسپی باقی ہے۔ ہانگ کانگ کے دروازے سے انگریزی کارخانوں کا مال چین میں داخل ہوتا ہے۔ ہمارے جہاز میں سے بھی لاکھوں کا مال بندرگاہ پر اتارا گیا۔

جاپان کا سایہ:

ہانگ کانگ پر بے شک برطانوی قبضہ ہے۔ جب جہاز سے اتر کر میں شہر کی سیر کو گیا تو ہر جگہ انگریزی دوکانیں، انگریزی بینک، انگریزی گرجا اور انگریزی سپاہی نظر آئے۔ چین کی قومی حکومت پر دباؤ ڈال کر انگریزوں نے اس بندرگاہ پر اپنا قبضہ قائم رکھا تھا۔ مگر اب جاپان کا خوفناک سایہ بڑھتا ہوا آرہا ہے۔ میں ہانگ کانگ کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر گیا، وہاں سے تمام شہر نظر آتا ہے، ہانگ کانگ کے دو حصے سمجھنے چاہئیں، شہر کا زیادہ تر حصہ تو ایک جزیرے پر آباد ہے۔ بمبئی کی طرح، اس جزیرے اور چین کی سرزمین کے درمیان فقط ایک میل چوڑا سمندر کا حصہ ہے۔ اس لیے شہر کا ایک حصہ دوسری طرف بھی آباد ہے، جس کو کاؤلون کہتے ہیں۔ یہاں سے ریل کی لائن جنوبی چین کے سب سے بڑے شہر کینٹن کو جاتی ہے۔ جو تقریباً سوا سو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس ریلوے لائن پر جاپانی ہوائی جہاز برابر گولے برساتے رہتے ہیں تاکہ چین کی حکومت ہتھیار اور دوسرا ضروری سامان ہانگ کانگ کے راستے سے نہ لا سکے، شنگھائی ختم ہونے

کے بعد اب دوسرے ملکوں سے تجارتی تعلقات رکھنے کے لیے ہانگ کانگ ہی چین کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔ مگر جاپانیوں کی پوری کوشش ہے کہ یہ راستہ بھی بند ہو جائے۔ جس وقت تک جاپانی، چینی شہروں پر بم اور گولے برساتے ہیں انگریز اطمینان سے بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر ان کو یہ نہیں معلوم کہ اگر جنوبی چین پر جاپانی قبضہ ہو گیا تو پھر ہانگ کانگ کی بھی خیر نہیں کیونکہ ایک میان میں دو تلواریں اور ایک ملک میں دو سامراجی طاقتیں نہیں رہ سکتیں۔

جنگ کی برسی:

جس دن ہم ہانگ کانگ پہنچے اس سے ایک دن پہلے تمام چین میں موجودہ جنگ کی پہلی برسی منائی گئی تھی۔ سال بھر ہوئے اسی تاریخ کو جاپانی فوجوں نے شمالی چین پر قبضہ کیا تھا چینی قوم پرستوں نے چین کے ہر شہر، قصبے اور گاؤں میں جلسے کیے اور اس جنگ کی اہمیت لوگوں کو سمجھائی۔ جاپان کے خوفناک ارادوں سے قوم کو آگاہ کیا اور ہر چینی مرد اور عورت نے قسم کھائی کہ اس وقت تک اطمینان سے نہ بیٹھیں گے جب تک جاپانی فوج کو اپنے ملک سے بالکل نہ نکال دیں گے، ایک ہندوستانی تاجر سے معلوم ہوا کہ ہانگ کانگ میں بھی یہ برسی زور شور سے منائی گئی تھی، علاوہ جلسوں اور جلوس کے ہانگ کانگ والوں نے ہزاروں روپیہ قومی حکومت کے جنگی فنڈ کے لیے جمع کیا۔ آج کے اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ہماری ہندوستانی کانگریس نے ایک طبی مشن چین بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس خبر پر چینی اخباروں اور عوام نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور بہت سے چینی جو مجھے ملے انھوں نے اتنی گرمجوشی سے میرا شکریہ ادا کیا گویا یہ طبی مشن میں نے خود ذاتی کوشش سے بھجوایا ہے۔

کینٹن پر بم:

ہانگ کانگ کے شاندار کاروباری علاقہ کو چھوڑ کر شہر کے اندر گلیوں کوچوں میں جا کر چینی آبادی کی مفلسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مزدور پیشہ چینی تو پہلے بھی غریب تھے مگر جب سے موجودہ جنگ شروع ہوئی ہے اندرون ملک سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ پناہ لینے کے لیے ہانگ کانگ آ گئے ہیں، ان سب کے رہنے کھانے کا انتظام بھی ہانگ کانگ کے چینیوں نے کیا ہے۔

اس لیے ان کی اقتصادی حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوگئی ہے، سینکڑوں بھیک مانگنے پر مجبور ہیں، چند روز پہلے کینٹن پر بڑی سخت بم باری ہوئی تھی، اس کی وجہ سے ہزاروں بے گھر ہو گئے تھے۔ ان میں سے کافی تعداد نے اب ہانگ کانگ میں پناہ لی ہے، میں ایک ہندوستانی تاجر سے ملا جو دو دن پہلے کینٹن سے آیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کینٹن کی چینی آبادی کتنی بہادری سے جنگ کی مصیبتوں کا مقابلہ کر رہی ہے، ہر دوسرے تیسرے روز جاپانی ہوائی جہاز نہتے شہریوں پر بم گراتے ہیں مگر پھر بھی شہر میں کسی قسم کی بھگدڑ یا بد انتظامی نہیں ہے۔ حملہ ختم ہوتے ہی لوگ زخمیوں کو اسپتال لے جاتے ہیں اور کاروبار پھر اسی طرح شروع ہو جاتا ہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

کشتی میں مکان:

ہانگ کانگ کی آبادی کا کافی حصہ زمین پر مکانوں میں رہنے کے بجائے کشتیوں میں رہتا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو بیچارے مکان کا کرایہ ادا نہیں کر سکتے، دن بھر وہ اپنی کشتیوں میں ادھر سے ادھر سامان ڈھوتے پھرتے ہیں اور رات کو ان کشتیوں ہی میں پڑے رہتے ہیں۔ ان میں سینکڑوں ایسے ہیں جنھوں نے آج تک ایک رات بھی زمین پر نہیں گذاری ہے۔ میں نے دیکھا ان کشتیوں کو اکثر عورتیں بھاری چپوؤں سے کھیتی ہیں، جس ملک میں بھی جاؤ مزدور پیشہ عورتوں کو کام میں مصروف پاؤ گے۔ ان بیچاریوں کو نہ سنگھار کرنے کی فرصت ہے اور نہ پردے اور برقعے کے تکلفات کی، ہانگ کانگ میں یہ دیکھ کر بھی تعجب ہوا کہ اخبار عام طور سے عورتیں بیچتی ہیں۔

چینی حملہ:

اپنے ہندوستانی ساتھیوں سے رخصت ہو کر (جو دوسرے جہاز سے جاپان جائیں گے) شام کو جہاز پر واپس آیا تو دیکھا کہ سینکڑوں کی تعداد میں چینی مسافر آ گئے ہیں، یہ سب لوگ ہانگ کانگ سے شنگھائی جا رہے ہیں۔ یعنی کاروبار کے سلسلہ میں سفر کر رہے ہیں۔ مگر زیادہ تر وہ ہیں جو کینٹن یا کسی اور اندرونی شہر سے ہجرت کر کے شنگھائی تلاش معاش کے سلسلے میں جا رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر موجودہ جنگ کے شکار ہیں کسی کا عزیز جاپانی بم کا نشانہ بنا ہے، کسی کا مکان تباہ ہو گیا ہے مگر پھر بھی میں نے ان کو نہایت ہنس مکھ پایا۔ وہ اپنی مصیبتوں کا اعلان نہیں کرتے،

میرے کمرے میں تین چینی مسافر آ گئے ہیں۔ ان میں سے ایک انگریزی بولتا ہے اس لیے سب سے گفتگو ہو سکتی ہے، یہ نوجوان کوانکسی یونیورسٹی میں زراعت کا پروفیسر ہے اور چھٹیوں میں اپنے عزیزوں سے ملنے شنگھائی جا رہا ہے۔ ایک اور تاجر سے ملاقات ہوئی جو شنگھائی کا رہنے والا ہے اور ہانگ کانگ کا روبار کے سلسلے میں آیا تھا۔ بات کرنے پر معلوم ہوا کہ شنگھائی میں اس کا ایک سگریٹوں کا کارخانہ تھا جو جاپانی ہوائی جہازوں کا شکار ہو گیا۔ کہنے لگا: "لاکھوں سگریٹ تھے، جاپانی ہوائی جہاز نے ایک بم چھوڑا۔ سب ایک ساتھ ہی جلنے لگے اور یہ کہہ کر خوب ہنسا، یہ ہے وہ اسپرٹ جس کے مقابلے میں جاپان کی فوجیں بیکار ہیں۔ قوم کی خاطر ذاتی نقصان کی پرواہ نہ کرنا اور مصیبت کی حالت میں بھی ہنس مکھ رہنا ہمیں ان چینیوں سے سیکھنا چاہیے۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی خوشی ہوئی کہ عام ہندوستانیوں کی طرح یہ چینی، یورپین لوگوں سے ذرا نہیں دبتے، تمام جہاز پر چینیوں کا قبضہ ہے۔ یورپین مسافروں کو بیٹھنے کے لیے کرسی بھی نہیں ملتی، انگریز تو غصے کے مارے لال پیلے ہو رہے ہیں، ان کا بس چلے تو سب چینیوں کو نکال باہر کریں مگر نہ یہ ہندوستان ہے اور نہ یہ چینی ہماری طرح محکوم ہیں، باوجود از حد خودداری کے سب چینی نہایت بااخلاق اور تمیزدار ہیں، بات بات پر شکریہ ادا کرتے ہیں اور جھک کر سلام کرتے ہیں۔ رات کے کھانے پر ایک بڑے میاں اور ان کا پانچ چھ برس کا پوتا میری میز پر تھے۔ میں نے اپنے ہاتھ سے ان دونوں کو کھانا نکال کر دیا اور بچے کے لیے ایک اونچی کرسی منگوا کر رکھوا دی تو بڑے میاں اس قدر خوش ہوئے کہ کچھ حد نہیں اور اشاروں سے میرا اتنا شکریہ ادا کیا کہ میں پریشان ہو گیا۔

گاؤں میں یونی ورسٹیاں:

9 جولائی۔ آج ہم پھر کھلے سمندر میں ہیں مگر ساحل سے دور نہیں ہیں، دن بھر چینی پروفیسر سے باتیں رہیں۔ چین کی موجودہ حالت، جنگ کے امکانات، چین اور ہندوستان کے تعلقات، بین الاقوامی سیاست، غرض ہر موضوع پر گفتگو ہوئی ان پروفیسر کی یونی ورسٹی اندرون ملک میں ہے۔ جنگ کے علاقے سے دور۔ مگر اس سے یہ جان کر نہایت تعجب ہوا کہ شنگھائی کی تمام چینی یونی ورسٹیاں جو جاپانی قبضہ کے بعد بند ہو گئی تھیں اب اندرون ملک میں پھر کھول دی گئی ہیں۔

ہزاروں کی تعداد میں ان یونی ورسٹیوں کے طالب علم پیدل چل کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے ہیں اور پڑھائی پھر باقاعدہ شروع ہوگئی ہے کیونکہ چین کی قومی حکومت کا خیال ہے کہ جنگ کی وجہ سے انھیں اپنا تعلیمی پروگرام نہیں روکنا چاہیے۔ کمال تو یہ ہے کہ اب پہلے سے کہیں زیادہ ان طالب علموں کی تعداد ان یونی ورسٹیوں میں پڑھ رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگ سے پہلے یونی ورسٹیاں اور کالج زیادہ تر ساحل کے بڑے شہروں سنگھائی پکینگ وغیرہ میں تھیں، مگر اب وہ اندرون ملک کے قصبوں میں کھولی گئی ہیں، جہاں دور دور سے طالب علم پڑھنے آتے ہیں۔ پروفیسر کا خیال ہے کہ جنگ کی وجہ سے چین میں تعلیم بہت پھیل گئی ہے کیونکہ اب ایسے ایسے قصبوں میں کالج کھل گئے ہیں جہاں پہلے اسکول بھی نہ تھے۔

زراعت:

ہندوستان کی طرح چین کا اصل مسئلہ بھی زراعتی ترقی ہے، اس کے متعلق پروفیسر سے معلوم ہوا کہ چین کی حکومت مدت سے خاص کوشش کر رہی ہے۔ طالب علموں کو موجودہ زراعتی طریقے سیکھنے کے لیے امریکہ، روس، ہالینڈ وغیرہ بھیجا جاتا ہے تاکہ واپس آکر وہ چین میں بھی زراعت کی حالت بہتر بنا سکیں، مویشیوں کو پالنے اور ان کی نسل کو بہتر بنانے کے لیے بھی کافی کوشش کی جارہی ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستان چین سے زیادہ خوش قسمت ہے، ہمارے ہاں ہر قسم کے مویشی کثرت سے پائے جاتے ہیں مگر چین میں مویشیوں کی کمی ہے، یہ چین کی حکومت کی قوم پرستی کا ثبوت ہے کہ باوجود جنگ کے وہ تعلیم اور اقتصادی ترقی کے لیے مختلف ذرائع اختیار کر رہی ہے۔

فتح کس کی ہوگی؟:

چینی پروفیسر سے باتوں کے دوران میں نے یہ بھی پوچھا کہ اس کی رائے میں کیا چین باوجود اپنی فوجی کمزوری کے مدت تک جاپان کا مقابلہ کر سکے گا، پروفیسر کا خیال ہے کہ فی الحال جاپان بعض بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر سکتا ہے لیکن آخر کار جاپانی فوجوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا ہوگا۔ اس کی کئی وجوہات پروفیسر نے بیان کیں۔

(1) جاپان کی سمندری فوج بہت زبردست ہے، چین کے پاس اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی جنگی جہاز نہیں ہیں۔ اس لیے ساحل پر اور بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے جہاں تک جنگی جہاز جا سکتے ہیں جاپانی فوجیں شہر فتح کر سکتی ہیں لیکن اندرونی ملک میں خصوصاً پہاڑی علاقوں میں جنگی جہاز بلکہ ہوائی جہاز اور بھاری جنگی مشینیں ٹینک وغیرہ بیکار ہیں۔

(2) اپنی فوجی کمزوری کو دیکھتے ہوئے جاپانی حکومت نے طے کرلیا ہے کہ اس کی فوجیں خواہ مخواہ دشمن کا مقابلہ کر کے اپنا نقصان نہ کرے گی۔ اگر کسی بڑے شہر پر جاپانی قبضہ ہونے کا خدشہ ہوتا ہے تو وہ شہر خالی کر دیتے ہیں، تمام آبادی اندرون ملک میں چلی جاتی ہے، تاکہ جب 'فتح یاب' جاپانی فوجیں داخل ہوں تو ان کو سوائے کھنڈروں کے اور کچھ نہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ جس علاقے پر جاپانیوں کا قبضہ ہے اس کی آبادی بہت ہی کم ہے۔ جاپان کے بادشاہ کو چینی ویرانوں کا شہنشاہ کہا جا سکتا ہے۔

(3) جن علاقوں پر جاپان نے اپنا قبضہ کر کے فوجیں ٹھہرادی ہیں وہاں بھی اُن کو امن نصیب نہیں ہے۔ چینی قوم پرستوں کے 'بے قاعدہ' جنگی دستے شب خون مار کر ان کو برابر تنگ کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ہزاروں جاپانی سپاہی مارے جا رہے ہیں۔

(4) مدت سے چینی مصیبت سہنے کے عادی ہو چکے ہیں، قحط، سیلاب، ٹڈی، وبا غرض قدرت کے تمام ظلم وہ جھیل چکے ہیں اس لیے اور لوگوں کے مقابلے میں وہ موجودہ جنگ کی مصیبتوں کو آسانی سے جھیل سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ چین کے زبردست رقبہ اور پچاس کروڑ کی آبادی کو فتح کرنا جاپان کے لیے آسان کام نہیں ہے۔

(5) مگر اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ تاریخ میں پہلی بار تمام چینی قوم پوری طرح متحد ہے۔ اس سے پہلے جاپان نے اکثر آپس کے لڑائی جھگڑوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر اب ایسا ممکن نہیں۔ شمال اور جنوب کے آپس کے اختلافات مٹ گئے ہیں، کئی سال سے حکومت اور کمیونسٹوں میں جو جنگ جاری تھی۔ وہ اب ختم ہوگئی ہے اور جاپان کے خلاف حکومت اور کمیونسٹوں نے متحدہ مورچہ قائم کیا ہے۔ جب تک چین میں یہ اتحاد رہے گا جاپان کامیاب نہیں ہو سکتا۔

شنگھائی:

10 جولائی، آسمان پر گدلے بادل، سمندر کا پانی بھی گدلے رنگ کا۔ یہ ینگ سی اور وانگ پو دریاؤں کا متحدہ ڈیلٹا ہے، سمندر کو چھوڑ کر اب ہم دریا میں جا رہے ہیں۔ پانی کا مخالف بہاؤ تیز ہے، جہاز چیونٹی کی رفتار سے چل رہا ہے۔ تمام مسافر ڈک پر کھڑے ہوئے ہیں مگر آج صبح چینی مسافر خاموش نظر آتے ہیں۔ ٹکٹکی باندھے کنارے کو دیکھ رہے ہیں۔ جہاں دور تک کوئی آبادی کے آثار نہیں ہیں، مگر وہ کیسا شہر ہے؟ 'اس کا نام دوسنگ تھا۔' تھا؟ کیا معنی؟ قریب آنے پر 'تھا' کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔ میلوں تک کھنڈر چلے گئے ہیں، یہ شنگھائی کے نواح ایک رونق دار شہر تھا۔ اب ہم دوسنگ کے بالکل برابر سے گزر رہے ہیں، ان کھنڈروں کو دیکھ کر مشکل سے یقین ہوتا ہے کہ اب سے چند مہینے پہلے یہاں ہزاروں انسان رہتے تھے، ہر طرف ویرانی ہی ویرانی، ایک مسافر مجھے بتاتا جا رہا ہے، یہ کالج تھا، یہ تھیٹر ہال تھا، یہ اسپتال تھا، یہ کپڑے کا کارخانہ تھا، یہ رہنے کے مکان تھے، یہ بچوں کا مدرسہ تھا۔ اور اب؟ ایک کھنڈر پر جاپانی جھنڈا لہرا رہا ہے اور دنیا کو بتا رہا ہے کہ یہ سب کس کا کارنامہ ہے۔ چینی مسافر اسی متانت اور خاموشی سے کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے صبر پر حیرت ہوتی ہے.......... اب ہم وانگ پو دریا میں ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دور پر جاپانی جنگی جہاز کھڑے نظر آتے ہیں۔ دوسنگ کے کھنڈر اور یہ جنگی جہاز، نتیجہ اور سبب، یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس ڈک پر سے کھڑے ہوئے ہم تاریخ کا ایک خونیں باب لکھا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ دریا میں ایک موڑ آتا ہے۔ جہاز آہستہ آہستہ رخ بدلتا ہے اور اکثر مسافروں کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے۔ شنگھائی۔''

رکشا:

شملہ اور نینی تال میں سرکاری افسروں، مسوری میں زمینداروں اور تعلقہ داروں اور کلکتہ میں موٹے موٹے ساہوکاروں کو رکشا میں جاتے دیکھ کر ہمیشہ غصہ آیا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کا بوجھ اٹھائے یا گھسیٹے، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ ایک روز مجھے بھی اس منحوس سواری میں بیٹھنا پڑے گا۔ شنگھائی کی بندرگاہ پر اتر کر سامان امریکن ایکسپریس کمپنی کے

آدمی کے سپرد کیا کہ کسٹم کا معائنہ کرا کر لائے اور خود باہر نکلا۔ اب کیا دیکھتا ہوں کہ سوائے رکشاؤں کے کوئی سواری ہی نہیں ہے۔ نہ موٹر، نہ گھوڑا گاڑی، نہ بس نہ ٹرام۔ دور فاصلے پر ٹرام جاتی نظر آئی۔ مگر غیر شہر میں بغیر زبان جانے ہوئے اپنے ٹھکانے پر کیسے پہنچ سکتا ہوں؟ یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ رکشا والوں نے آگھیرا اور ایک دو نے تو مجھے اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اب وہ چینی میں کہہ رہے ہیں اور میں سمجھ ہی نہیں رہا ہوں۔ تنگ آ کر میں نے کہا "وائی۔ ایم سی۔ اے" Y.M.C.A جہاں مجھے ٹھہرنا تھا۔ یہ کہنا ہی تھا کہ "پابدست دگرے۔ دست بدست دگرے" والا معاملہ ہوا۔ اور آنکھ کھلی تو میں اور رکشا ہے کہ اڑی چلی جا رہی ہے۔ اول تو اس نامعقول سواری سے عمر بھر کی نفرت اور پھر یوں زبردستی لاد دیے جانا۔ پھر رکشا والا اتنا تیز جا رہا تھا کہ ٹوپی اڑ جانے کا خیال اور ہر قدم پر دوسری سواریوں سے ٹکر کھانے کا ڈر۔ راستے بھر یہ معلوم ہوا کہ ہر شخص میری حالت پر ہنس رہا ہے، کسی نہ کسی طرح وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ پہنچے۔ چودہ منزل کی شاندار عمارت۔ سامنے ہی گھوڑ دوڑ کا میدان۔ میں نے سوچا جگہ تو اچھی ہے۔ اندر جا کر مسافری چیک بھنایا اور پوچھا کہ رکشا والے کو کیا دیا جائے۔ معلوم ہوا کہ دس سینٹ (یعنی ہندوستانی سکّہ میں تقریباً ایک آنہ) یعنی دو تین میل تک مجھے گھسیٹ کر لانے کی مزدوری چار پیسے، اپنی ذات سے نفرت ہونے لگی اور سوچنے لگا کہ اگر میں رکشا والا ہوتا اور مجھے اتنی محنت کے چار پیسے ملتے تو کیسا محسوس ہوتا۔ مگر موجودہ اقتصادی نظام میں احساس کہاں، مفلس کی مفلسی سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں، رکشا والا غریب اتنی کم مزدوری پر کام کرنے کے لیے مجبور ہے ورنہ بیکاری اور فاقہ کی نوبت آ جائے گی۔

مگر مزدوری کا سوال چھوڑ کر بھی یہ سواری نہایت وحشیانہ ہے۔ شملہ وغیرہ کے رکشا قلیوں کی اوسط عمر پچیس تیس سال سے زیادہ نہیں ہوتی، چین میں تو اور بھی کم ہو گی کیونکہ یہاں لوگوں کے قوئ اتنے مضبوط نہیں ہوتے اور مزدوری بھی اتنی کم ہے کہ اس میں پیٹ بھرنے کو بھی کافی نہیں ملتا۔

ساجھے کی ہنڈیا:

11 جولائی۔ یہ شنگھائی بھی دنیا کا سب سے عجیب و غریب شہر ہے اور سب سے عجیب چیز اس شہر کی حکومت ہے۔ موجودہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے شنگھائی شہر کے تین حصے تھے۔ اول تو

چینی حصہ جو بذاتِ خود ایک بہت بڑا شہر تھا۔ یہ حصہ جمہوری چین کے علاقہ میں تھا۔ اب اس پر جاپانی قبضہ ہے مگر فقط کھنڈر ہی کھنڈر ہیں۔ آبادی نام کو نہیں۔ تمام باشندے جاپانیوں کا قبضہ ہونے سے پہلے شہر چھوڑ چکے ہیں۔ دوسرا شنگھائی وہ ہے جو بین الاقوامی علاقہ INTERNATI- ONAL SETTLEMENT کہلاتا ہے۔ جب چین میں قومی جمہوریت قائم ہوئی اور غیر ملکی طاقتوں، انگلستان، فرانس، امریکہ وغیرہ کو اپنا بوریا بستر سمیٹنا پڑا تو تجارت کی غرض سے بعض بندرگاہوں کو بین الاقوامی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ ان میں سے ایک شنگھائی بھی ہے۔ اس شہر کو ساجھے کی ہنڈیا سمجھنا چاہیے، اس پر برطانیہ امریکہ چین اور جاپان سب کا مشترکہ قبضہ ہے۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری زیادہ تر برطانوی اور امریکن فوج پر ہے۔ انگریزی فوج میں بہت سے سکھ اور پٹھان بھی ہیں جو ہندوستان سے لائے گئے ہیں، سامراجی شطرنج کے چار مہرے۔ اسی علاقہ کے ایک حصہ کی ذمہ داری جاپانی فوج پر رکھی گئی تھی، جب جنگ شروع ہوئی تو جاپانیوں نے بلا تکلف اس پر اپنا پورا قبضہ کر لیا اور دوسرے ساجھی دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ بین الاقوامی علاقہ کے علاوہ شنگھائی کا ایک حصہ بلاشرکت غیرے فرانس کی ملکیت بھی ہے۔ اس کو فرانسیسی اجارہ FRENCH CONCESSION کہتے ہیں ایک معاہدہ کی رو سے چینی حکومت نے یہ حصہ فرانس کو دے دیا تھا۔ شہر کے ان مختلف حصوں کے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ چینی شہر اور بین الاقوامی علاقہ کے درمیان فقط کانٹے دار تاروں کا ایک جنگلہ لگا ہوا ہے۔ اس کے ایک طرف انگریز اور سکھ سپاہی پہرہ دیتے ہیں اور دوسری طرف جاپانی، جہاں تک نظر جاتی ہے کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں۔ جن میں سب سے نمایاں شنگھائی، ننکنگ ریلوے کا اسٹیشن ہے جو کبھی تمام مشرق میں ریلوں کا سب سے بڑا مرکز تھا، اس تمام علاقہ پر جاپانی ہوائی جہازوں نے بم پھینکے تھے، نشانہ کبھی کبھی خطا بھی ہو جاتا ہے، اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بین الاقوامی علاقے کی سرحد پر بھی بہت سے مکانوں کے کھنڈر نظر آتے ہیں اور نہ صرف سرحد پر بلکہ شہر کے بیچ میں بھی بعض اوقات گولے اور بم آ کر گرے ہیں۔ جب انگریزوں اور امریکنوں کے شکوے شکایت کے جواب میں جاپانی حکومت نے مسکرا کر معافی مانگ لی۔ بین الاقوامی اور فرانسیسی علاقوں کے درمیان فقط ایک سڑک حائل ہے۔

پچ میل آبادی:

جس شہر پر پانچ مختلف حکومتوں (برطانیہ، امریکہ، فرانس، جاپان اور چین) کا قبضہ ہوگا اس کی عجیب وغریب آبادی کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ علاوہ پانچ قوموں کے باشندوں کے شنگھائی میں بھگوڑے روسی بھی بہت سے آباد ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو روس میں زار کی حکومت ختم ہونے پر اپنے ملک سے بھاگ آئے۔ ان میں سے زیادہ تر پرانے روسی رئیسوں، مالداروں اور تاجروں کی اولاد ہیں۔ جن کو مزدوروں کے راج میں رہنا گوارا نہیں تھا۔ مگر یہ گوارا ہے کہ ان کی عورتیں شنگھائی کے گلی کوچوں میں حسن فروشی کریں اور وہ خود مختلف قوموں کے لیے مخبری کرتے پھریں۔ منچوریا، کوریا اور چین کے دوسرے علاقوں سے بھی جن پر جاپانی قبضہ ہوگیا ہے ہزاروں کی تعداد میں لوگ پناہ ڈھونڈنے آگئے ہیں، مدت سے چین مغربی سامراج اور کاروبار کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے، ملک کی غیر ساکن حالت کو دیکھ کر یورپ کے کونے کونے سے ہر قسم کے لوگ پیسہ بنانے کی غرض سے آگئے ہیں، ان میں سوداگر بھی ہیں اور بدمعاش بھی۔ سیدھی طرح قانون کی حد میں رہ کر اتنا روپیہ نہیں کمایا جاسکتا جتنا خلاف قانون طریقوں سے، اس لیے شنگھائی میں ایسے لکھ پتیوں کی کمی نہیں جن کی دولت چوری کے سامان، افیم، کوکین، شراب اور ہتھیاروں کی ناجائز تجارت سے جمع ہوئی ہے، جہاں تک ممکن ہوتا ہے سرمایہ داری قانونی راستوں پر چلتی ہے، مگر خلاف قانون ذرائع سے بھی دولت جمع کرنے میں اس کو عار نہیں ہے۔ شنگھائی کے بین الاقوامی سرمایہ دار ہر اس جنس کی تجارت کرنے کے لیے تیار ہیں جس میں کافی منافع ہو، خواہ وہ جنس انسان ہی کیوں نہ ہو! اگر کسی یورپین کمپنی کو چین یا ملایا میں کانیں کھودنے کے لیے دس ہزار مزدور درکار ہیں یا شنگھائی کے کسی قحبہ خانے کو پچاس لڑکیاں چاہئیں تو وہ یہ کام بھی کرسکتے ہیں.........اگر منافع کافی ملے۔ ہر اس شہر کی طرح جہاں ملی جلی آبادی ہوتی ہے اور باشندوں کی کافی تعداد ناجائز ذرائع سے دولت کماتی ہے، شنگھائی میں بھی گناہ کا بازار گرم ہے۔ مگر سیاست اور اقتصادی حالات کو یہاں بھی دخل ہے، منچوریا، کوریا اور اندرونی چین سے ہزاروں کی تعداد میں چینی لڑکیاں بے کسی اور لاچارگی کی حالت میں شنگھائی آتی ہیں۔ ان کے ماں باپ، بھائی یا شوہر

جاپانی سامراج کے بموں کے شکار ہو چکے ہیں۔ اس حالت میں کوئی تعجب نہیں کہ وہ ان خونخوار انسانی بھیڑیوں کے فریب میں آجاتی ہیں جو چند ڈالر کی خاطر ان لڑکیوں کو بیچ ڈالتے ہیں، جاپان نے جو ظلم چین پر ڈھائے ہیں ان میں سے یہ بھی نہایت سنگین ہے۔

ناچ گھر:

شنگھائی میں نہ صرف بیچ میل آبادی ہے بلکہ یہاں کی فضا میں ایک بے چینی اور بدامنی ہے۔ کسی چیز کو سکون میسر نہیں۔ کل کیا ہوگا؟ کسی کو نہیں معلوم، جاپان کا خوفناک سایہ تمام ملک پر پھیلتا جا رہا ہے۔ لاوارثوں، یتیموں، بے گھروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ بین الاقوامی علاقہ میں بھی جاپانی دست درازی شروع ہوگئی ہے۔ ایسی حالت میں ذہنی بے چینی اور اخلاقی بے قاعدگی قدرتی ہیں۔ جنگ اور اسی قسم کے خوفناک موقعوں پر زندگی اور اس کی دلچسپیوں کے لیے انسان کی خواہش بہت بڑھ جاتی ہے۔ سنا گیا ہے کہ 1914 کی جنگ کے دوران میں لندن اور پیرس وغیرہ میں سنیما، تھیٹر، ناچ گھر، شراب خانے وغیرہ ہمیشہ سپاہیوں سے بھرے رہتے تھے، جو اپنے اپنے موروچوں سے چھٹی لے کر آئے ہوتے تھے، یہی حال شنگھائی کا ہے۔ رات کو تمام تماشوں کے مقام کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں۔ میں نے چند ناچ گھر جا کر دیکھے، یہاں مغربی وضع کا ناچ ہوتا ہے۔ ناچنے والوں میں زیادہ تر تعداد چینیوں کی تھی۔ تھوڑی سی تعداد یورپین لباس پہنے ہوئے تھی مگر زیادہ تر کا لباس ایک گلا بند لمبا ریشمی کوٹ تھا جو متوسط درجے کے چینی عام طور سے پہنتے ہیں۔ پچاس کے قریب حسین اور نوجوان چینی لڑکیاں کرسیوں پر کمرے کے گرد بیٹھی تھیں، یہ پیشہ ور ناچنے والیاں TAXI DANCERS ہیں۔ ان میں سے اس لڑکی کو فقط تقریباً ڈیڑھ آنہ فی ناچ ملتا ہے۔ باقی سرمایہ داری کے اصول کے ماتحت اس ناچ گھر کا مالک رکھ لیتا ہے۔ اچھی ناچنے والیاں دوڈھائی روپے روز کما لیتی ہیں۔ یہ لڑکیاں صرف ناچتی ہیں۔ پیشہ ور کسبیاں نہیں ہیں۔ ان میں سے اکثر اچھے معزز متوسط درجے کے خاندانوں کی ہیں جو اقتصادی مشکلات سے مجبور ہو کر یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی ہیں کیونکہ مجھے ناچنا نہیں تھا اس لیے میں ایک چینی دوست کے ساتھ ایک کونے کی میز پر بیٹھ کر چائے پیتا رہا۔ اس دوست کے ذریعہ سے میں نے

دو تین لڑکیوں سے باتیں کیں اور چند سوالات پوچھے، اپنا حال بتاتے ہوئے ایک لڑکی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ ایک معزز تاجر کی لڑکی تھی اور جنگ شروع ہونے سے پہلے ایک اسکول میں پڑھتی تھی جنگ کے پہلے مہینے میں اس کا باپ، بھائی اور تمام خاندان جاپانی بموں کا شکار ہو گئے، اور ہزاروں بے گھروں لاوارثوں کے ساتھ اس کو بھی بین الاقوامی علاقے میں پناہ لینی پڑی میرے سامنے دو ہی صورتیں تھیں، اس نے اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی ہوئی انگریزی میں کہا۔ اپنے جسم کی تجارت یا اس ناچ گھر کی ملازمت۔ اور اس جگہ اتنی بھیڑ اور شور میں کم از کم تھوڑی دیر کے لیے میں اپنی مصیبتوں کو بھول سکتی ہوں۔ اتنے میں دو جاپانی سپاہی شور مچاتے نہایت بدتمیزی سے داخل ہوئے۔ اس لڑکی نے جس نگاہ سے ان کی طرف دیکھا اس میں غصہ، نفرت، حقارت اور انتقام کا جذبہ سب ہی کچھ تھا۔

چینی مسلمان:

شنگھائی میں چار دن میں میں نے چین کی موجودہ حالت کے متعلق بہت کچھ سیکھا، علاوہ اور لوگوں کے میں کئی انگریز اور امریکن اخبار والوں سے ملا، جو شروع جنگ سے چین کی موجودہ حالت کا مطالعہ کر رہے ہیں ان سب کی یہی رائے ہے کہ تمام چین کو فتح کرنا جاپان کے لیے تقریباً ناممکن ہے۔ یہ سچ ہے کہ اپنے جنگی اور ہوائی جہازوں کے زور سے جاپانیوں نے تقریباً ایک تہائی ملک پر قبضہ کر لیا ہے، مگر اس علاقہ میں بھی چینیوں کے بے قاعدہ سپاہیوں نے شب خون مار کر جاپانی فوج کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ خود شنگھائی کے ارد گرد جہاں جاپانی قبضہ ہوئے ایک سال ہو چکا ہے، جاپانی فوجوں کو امن نصیب نہیں ہے، روز رات کو مشین گنوں اور رائفلوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جاپانیوں نے کئی بار کوشش کی کہ اپنے نامزد غدار چینیوں کی ایک حکومت اس علاقہ پر قائم کریں۔ مگر ہر دفعہ ان قوم فروشوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا، اس کے علاوہ جاپانی مقبوضہ علاقے میں کوئی آبادی ہی نہیں ہے جس پر وہ حکومت کریں۔ غریب چینی کسان جن کی عمر مصیبت جھیلتے گزری ہے جاپانی قبضہ ہونے سے پہلے ہی اپنا ہل کندھے پر رکھ کر بیوی بچوں کو ایک گاڑی پر لاد اندرون ملک میں چلے جاتے ہیں............ شنگھائی میں مجھے پہلی بار

معلوم ہوا کہ چین میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد آباد ہے، چند دوستوں نے میری دعوت ایک ہوٹل میں کی، جو ایک چینی مسلمان کی ملکیت ہے، یہاں یہ دیکھ کر مجھے نہایت تعجب ہوا کہ چینی مسلمان بھی شراب پیتے ہیں۔ مگر دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اور لحاظ سے وہ اپنے مذہب کے کافی پابند ہیں، جمہوری چین میں ان کو پوری مذہبی آزادی اور شہری حقوق حاصل ہیں۔ موجودہ جنگ شروع ہونے پر جاپانیوں نے پوری پوری کوشش کی کہ چینی مسلمانوں کو ورغلا کر اپنی طرف توڑ لیں۔ مگر ان کی یہ چال کامیاب نہ ہوئی چینی مسلمان سب قوم پرست ہیں اور موجودہ جنگ میں ہر طرح سے جاپانی حملے کو روکنے کے لیے قومی فوجوں کے ساتھ ہیں۔ جنرل عمر جو ایک معزز مسلمان ہیں جنرل چیانگ کائی شک کے دست راست سمجھے جاتے ہیں۔ لباس، زبان، طرز رہائش ہر لحاظ سے چینی مسلمانوں اور دوسرے چینیوں میں کوئی فرق نہیں ہے جب تک آپ خاص طور سے یہ سوال نہ کریں۔ کسی چینی کے متعلق یہ کہنا ناممکن ہے کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ آپس میں شادیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ میرے ایک چینی دوست نے بتایا کہ وہ خود عیسائی ہے، اس کا باپ بدھ مذہب کا پیرو، اس کا بھائی لامذہب اور اس کی عیسائی بہن نے ایک مسلمان سے شادی کی ہے۔ باوجود اس کے وہ سب ساتھ ایک ہی مکان میں رہتے ہیں اور ساتھ کھاتے پیتے ہیں اور ملک کی خاطر برابر قربانیاں کرنے کو تیار ہیں کاش میں اس کو ہندوستان کے متعلق بتا سکتا کہ ہمارے ہاں بھی اتنا زبردست اتحاد ہے۔

آزاد عورتیں:

شنگھائی میں میں جن لوگوں سے ملا ان میں مسٹر اور مسز چاؤ CHOW قابل ذکر ہیں، یہ دونوں نوجوان میاں بیوی اخبار نویس ہیں۔ مسٹر چاؤ ایک انگریزی اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں اور چینی سیاسی مسائل پر مضمون لکھتے ہیں، مسز چاؤ بھی جن کی تعلیم یورپ اور امریکہ میں ہوئی ہے مختلف اخباروں اور رسالوں میں لکھتی ہیں۔ وہ مادام چیانگ کائی شیک (چین کے پریزیڈنٹ جنرل چیانگ کی بیوی) کی دوست ہیں اور ساتھ کام کرنے والی ہیں۔ حال ہی میں وہ آسٹریلیا سے لوٹی ہیں، جہاں عورتوں کی بین الاقوامی کانفرنس میں انھوں نے چین کی نمائندگی کی تھی۔ مسز چاؤ نے مجھے بتایا کہ آسٹریلیا میں لوگوں کو یقین نہ آتا تھا کہ ایک چینی نوجوان عورت اس طرح آزادی

سے ان کے سامنے انگریزی میں تقریر کرسکتی ہے۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ موجودہ نسل کی چینی عورتوں کو دیکھ کر ہر غیر ملکی کو تعجب ہوتا ہے۔ اب سے تیس چالیس برس پہلے تک چین میں عورت کی سماجی حالت نہایت خراب تھی۔ ان کو مردوں کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ بچپن سے ان کے پاؤں باندھ دیے جاتے تھے تا کہ وہ آزادی سے چل پھر نہ سکیں، مگر جمہوری حکومت قائم ہونے کے بعد سے یہ سب حالت بدل گئی ہے۔ اب قانون نے مرد اور عورت کا فرق مٹا دیا ہے۔ دونوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں، عورتوں کی تعلیم کی طرف حکومت نے خاص توجہ دی ہے۔ لاکھوں لڑکیاں اسکولوں اور ہزاروں لڑکیاں کالجوں میں پڑھتی ہیں، سرکاری ملازمت میں عورتوں کا کافی حصہ ہے اور اسکولوں، کالجوں، عدالتوں، دفتروں اور دوکانوں میں ہر جگہ عورتیں کام کرتی ہوئی ملتی ہیں۔ سرکاری وظیفوں سے دوسرے ملکوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔ پرائمری درجے تک تعلیم سب کے لیے لازمی اور مفت ہے۔ آج شنگھائی کی سڑکوں پر چینی لڑکیوں اور عورتوں کو آزادانہ چلتے پھرتے اور کام کرتے دیکھ کر یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ سب ترقی انھوں نے پچھلے بیس سال میں کی ہے۔ اس ترقی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انھوں نے یورپین تمدن کی تقلید کرنا، سنگار کرنا اور انگریزی میں بات کرنا سیکھ لیا ہے۔ بلکہ چینی عورتیں آج نہ صرف اپنے حقوق بلکہ اپنی ذمہ داریوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ جاپان کے خلاف جنگ میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں چینی لڑکیاں فوج میں بھرتی ہوگئی ہیں، اسپتالوں میں کام کرتی ہیں۔ زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، فوجی موٹریں چلاتی ہیں۔ اب سے چند سال پہلے تک عورتوں میں آزادی کی لہر شہروں تک محدود تھی۔ مگر جب سے یہ جنگ شروع ہوئی ہے اور لاکھوں کی تعداد میں شہر کے لوگ اندرون ملک میں آباد ہوگئے ہیں، گاؤں کی عورتیں بھی بیدار ہو رہی ہیں، جو کسان عورت آج جاپانیوں کے خلاف مردوں کے دوش بدوش بندوق ہاتھ میں لے کر لڑ رہی ہے وہ کل مردوں کی غلامی ہرگز قبول نہ کرے گی۔

چینی تھیٹر:

چینی زندگی کا جتنا مطالعہ کیا جائے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان اور چین کے حالات میں کتنی مناسبت ہے۔ دونوں زراعتی ملک ہیں جن کی زیادہ تر آبادی کی گزر اوقات کھیتی باڑی پر ہے۔

دونوں ملکوں پر مدتوں تک مطلق العنان بادشاہوں نے حکومت کی ہے۔ دونوں پر مغربی سرمایہ داروں اور سامراجی حکومتوں نے قبضہ کیا۔ چین کسی حد تک غیر ملکی اثر سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوا اور ہندوستان ابھی تک جنگ آزادی میں مصروف ہے۔ ایک سے تاریخی حالات ایک سے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ میں شنگھائی میں ایک چینی تھیٹر دیکھنے گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ہمارے ہاں کے دقیانوسی تھیٹر سے کتنا ملتا جلتا تھا۔ وہی رنگین پردوں کا اسٹیج وہی اشعار میں گفتگو، موقع بے موقع گانا، لچر مذاق، جواب سے چند سال پہلے تک ہمارے لیلیٰ مجنوں والے ڈراموں کی خصوصیات تھیں، دلچسپ بات یہ تھی کہ تماشہ کرنے والوں اور تماشائیوں میں بھی فقرہ بازی ہوتی رہتی تھی۔ یہ تھیٹر پرانے چینی تھیٹر کی یادگار ہے۔ پڑھے لکھے چینی ایسی جگہ کبھی نہیں جاتے۔ تعلیم یافتہ طبقہ کی کوششوں سے چینی ڈراموں کو مغربی وضع پر پیش کرنے کے لیے چند تھیٹر بنائے گئے تھے۔ جواب جنگ کی وجہ سے بند پڑے ہیں۔ فی الحال شنگھائی کے غریب چینی اس تھیٹر میں آکر دل بہلاتے ہیں اور اپنی مصیبتوں کو بھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ملک کے اندرونی حصوں میں جہاں چینی کسان نہ صرف جاپان کے حملے کو روکے ہوئے ہیں بلکہ سوشلسٹ لیڈروں کی سرکردگی میں اپنے خون اور پسینہ سے ایک نیا چین قائم کر رہے ہیں............ایسا چین جہاں مزدور اور کسان کو اپنی محنت کا صلہ مل سکے گا اور دنیا کی راحتیں امیروں، رئیسوں کے لیے وقف نہ ہوں گی............ جہاں چھوٹے چھوٹے اسکولوں اور گاؤں کی چوپالوں میں ایک نئی قسم کے ڈرامے کھیلے جا رہے ہیں، جن میں روس اور فرانس اور اسپین کے انقلابی ڈراموں کی جھلک ہے............ایسے ڈرامے جو چند رومانی گیت سنا کر عوام کو سلاتے نہیں بلکہ جو زندگی کی اصلیتوں کو انقلابی نقطۂ نگاہ سے پیش کرتے ہیں۔ وہاں نہ صرف ایک نیا چینی تھیٹر جنم لے رہا ہے بلکہ ایک نیا تمدن، ایک نیا سنسار۔

آخری رات:

12 جولائی (رات کے بارہ بجے) یہ شنگھائی میں میری آخری رات ہے، اس عجیب وغریب شہر میں میں نے چین جیسے عظیم الشان ملک کی ایک جھلک دیکھی، یہاں چین کی مصیبتوں اور چین کی آرزوؤں دونوں کا پتہ ملتا ہے۔ میں ہر قسم کے چینیوں سے ملا............ پروفیسر، اخبارنویس،

سرکاری ملازم، طالب علم، رکشا قلی، پیشہ ور ناچنے والیاں! میں نے یہاں کے شاندار ہوٹل بھی دیکھے اور غریبوں کے وہ تنگ اور اندھیرے محلّے بھی جہاں ایک ایک کمرے میں بیس بیس آدمی رہتے ہیں۔ میں نے جگمگاتے ہوئے ناچ گھر، تھیٹر، سنیما اور قہوہ خانے دیکھے اور ان مکانات کے کھنڈر بھی جو جاپانی لوگوں کا نشانہ بن چکے ہیں۔ مگر جو چیز میں نے شنگھائی میں سب سے زیادہ اہم پائی اس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ وہ ایک نئی روح ہے جو ہر چینی میں پائی جاتی ہے۔ خواہ وہ فاقہ زدہ مزدور ہو یا حسین ناچنے والی۔ امیر تاجر ہو یا اخبار بیچنے والی بڑھیا۔ یہ وہ آزادی کی روح ہے جو آج جاپانی جنگی جہازوں، گولوں اور بموں کا مقابلہ کر رہی ہے۔ اس وقت جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں دور سے گولہ باری کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے بے قاعدہ چینی سپاہیوں کا کوئی دستہ جاپانی فوج پر حملہ کر رہا ہے۔ ان بے قاعدہ سپاہیوں کے حالات میں نے سنے ہیں، نہ ان کے پاس پیسہ ہے، نہ سامان، نہ وردیاں اور نہ کافی ہتھیار، نہ موٹریں، نہ گھوڑے، پھر بھی ایک سال سے وہ برابر جاپان کی زبردست فوجوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ جب تک چین کے عوام میں یہ ہمت اور وطن پرستی کا جذبہ ہے، چین کبھی فتح نہ ہوگا خواہ تمام ملک پر جاپانی قبضہ کیوں نہ کر لیں۔

کل میں جاپان کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ جاپان جو اپنی نفاست اور رنگینی کے ساتھ اپنی بربریت اور ظلم کی وجہ سے تمام دنیا کے لیے ایک معمہ بنا ہوا ہے۔

O

دوسرا حصہ

جاپان کا معمہ

جاپانی سلطنت:

13 جولائی کی صبح، چھ بجے سو کر اٹھا۔ سامان موٹر میں رکھ کر جہاز پر سوار ہونے کے لیے روانہ ہو گیا۔ شنگھائی پر ہلکا ہلکا کہرا چھایا ہوا تھا۔ گارڈن برج GARDEN BRIDGE پر موٹر روکی گئی ایک انگریز اور ایک سکھ سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ یہاں بین الاقوامی علاقہ ختم ہو جاتا ہے۔ پل کی دوسری طرف موٹر دوبارہ روکی گئی، یہاں پانچ چھ جاپانی سپاہی پہرہ پر تھے۔ انھوں نے بڑے غور سے موٹر کا معائنہ کیا۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ میں ایک جاپانی جہاز پر سوار ہونے کے لیے جا رہا ہوں مجھے زیادہ تنگ نہیں کیا۔ جس وقت میری موٹر کا معائنہ ہو رہا تھا چند چینی مزدوروں کا ایک گروہ آیا جس میں دو عورتیں بھی تھیں۔ ان بیچاروں کو جامہ تلاشی دینی پڑی اور میں نے دیکھا کہ تلاشی لیتے وقت جاپانی سپاہیوں نے ان غریب عورتوں کی عزت کا کوئی خیال نہ رکھا۔

اب ہم جاپانی سلطنت میں پہنچ گئے۔ موٹر ویران سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی جا رہی تھی۔ دونوں طرف کھنڈر ہی کھنڈر تھے۔ بڑے بڑے عالی شان مکان، ہوٹل، دکانیں، تھیٹر اور سینما سب غیر آباد پڑے تھے۔ اکثر عمارتیں گولہ باری سے چھلنی ہو گئی تھیں، سڑک پر جا بجا ملبہ پڑا ہوا

تھا۔ اکثر دیواروں پر سیاہی مائل سرخ خون کے ہولناک دھبے اس کشت و خون کا پتہ دے رہے تھے جو جاپانی قبضہ ہونے پر اس علاقہ میں ہوا تھا۔ انسانی آبادی کا دور دور پتہ نہ تھا۔ دو چار کھنڈروں پر جاپانی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ چند گدھ ہوا میں منڈلا رہے تھے۔ یہ تھا جاپان کی عظیم الشان سلطنت کا پہلا منظر جو میں نے دیکھا۔ خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ علاقہ دراصل بین الاقوامی مقبوضہ تھا مگر جب جاپانیوں نے اس پر زبردستی قبضہ کرلیا تو انگریزوں، امریکنوں اور فرانسیسیوں نے چوں بھی نہ کی اور اس علاقہ کی تمام چینی آبادی کو جاپانیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

لوٹ کا مال:

جہاز پر جاپانی فوجیوں کا زبردست مجمع تھا، ساحل پر بھی کم از کم پانچ سو سپاہی موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ اسی جہاز سے ان سپاہیوں کی راکھ جاپان بھیجی جا رہی ہے جو چین کی لڑائی میں کام آئے ہیں، چند بڑے افسر بھی چھٹی پر وطن جا رہے ہیں، میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ معمولی معمولی جاپانی سپاہیوں کے پاس نہایت قیمتی کیمرے اور گھڑیاں ہیں۔ جاپانی فوج میں سپاہیوں کو شاید پانچ روپے ماہوار بھی تنخواہ نہیں ملتی۔ پھر ان کے پاس اتنا شاندار سامان کہاں سے آیا؟ تب مجھے وہ دوکانیں یاد آئیں جو ابھی میں نے کھنڈروں کی حالت میں پڑی دیکھی تھیں، جب فوجیں اپنے وطن کی حفاظت کے لیے نہیں بلکہ فقط قتل و خون اور سلطنت بڑھانے کے لیے لڑتی ہیں تو لوٹ کا مال سپاہیوں کا دل بڑھانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

اپنے کیبن میں سامان رکھنے کے بعد ڈک پر آیا اور شہر کی جانب نگاہ کی تو دور تک کھنڈر ہی کھنڈر نظر آئے۔ کارخانوں کی چمنیاں خاموش تھیں۔ اکثر کے اوپر کا حصہ گولوں سے ٹوٹ گیا تھا۔ جب میں نے تباہی کے اس منظر کے بعد ان جاپانی سپاہیوں اور افسروں کو دیکھا جو جہاز کو گھیرے ہوئے تھے تو ایسا معلوم ہوا گویا تاریخ کے صفحات پر سبب اور نتیجہ میری آنکھوں کے سامنے لکھے جا رہے ہیں۔

دنیا کے مالک:

جاپانیوں کے خلاف اس وقت میرے جو کچھ بھی جذبات ہوں ان کی وقت کی پابندی کا

قائل ہونا پڑا۔ جہاز کی روانگی کا وقت ساڑھے نو بجے مقرر اور ٹھیک اسی وقت ہم نے لنگر اٹھایا۔ جہاز آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اکثر جاپانی سپاہی جو ساحل پر کھڑے تھے بڑی حسرت سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ دو ایک تو شاید رو رہے تھے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ قتل و غارت کرنے والے فوجیوں میں بھی انسانیت کا جذبہ بالکل فنا نہیں ہو جاتا۔ یہ بیچارے شاید اپنی بیوی بچوں، دوستوں اور عزیزوں کا خیال کر رہے تھے جو وطن میں ان کا انتظار کر رہے ہوں گے یہ دیکھ کر میرے دل میں جو کچھ نفرت ان فوجیوں کے لیے تھی وہ دور ہوگئی۔ یہ لوگ تو اپنے افسروں اور حاکموں کے ہاتھ میں کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں۔ ان سے تو نفرت کے بجائے ہمدردی ہونی چاہیے۔ مگر ہاں وہ نظام قابل ملامت ہے، جو لاکھوں انسانوں کو ایک دوسرے کو قتل کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس نظام کے نمائندے وہ جاپانی افسر ہیں جو اس جہاز کی ڈک پر اکڑ اکڑ کر ٹہل رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے گویا دنیا کے مالک یہی ہیں۔

انقلابی لٹریچر:

میرے کیبن میں دو اور مسافر ہیں۔ ایک تو شنگھائی کے برطانوی قونصل خانے کا ایک نوجوان افسر ہے جو چھٹی پر جاپان میر کے لیے جا رہا ہے، دوسرے ایک مرنجاں مرنج فرانسیسی ہے جو شنگھائی میں شراب کی تجارت کرتا ہے۔ جہاز روانہ ہوتے ہی جاپانی پولیس افسر نے ہمارے سامان کی تلاشی لی، ہر چیز کی مفصل فہرست بنائی گئی۔ میں نے پہلے ہی احتیاط کر رکھی تھی کہ کوئی اخبار، کتاب یا کاغذ ایسا ساتھ نہ لاؤں جس پر جاپانیوں کو اعتراض ہو، شنگھائی میں جتنا مواد جاپانیوں کے خلاف مجھے ملا تھا وہ میں نے ڈاک سے اپنے نام نیویارک بھیج دیا تھا تاکہ وہاں پہنچنے پر مجھے مل جائے۔ آخری دن چند اخبار کہیں سے مل گئے تھے جن میں چین کی موجودہ حالت کے متعلق ضروری اطلاعات تھیں، ان اخباروں میں میں نے اپنے جوتے لپیٹ رکھے تھے، اس لیے کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی، کتابوں کی مفصل پڑتال کی گئی، جواہر لال نہرو کی چند کتابوں کے متعلق پوچھا گیا کہ یہ کس مضمون پر ہیں۔ میں نے کہا، ادب لطیف۔ میں تو آسانی سے چھوٹ گیا مگر ہمارے فرانسیسی دوست کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا، جب اس کی کتابوں میں

انقلاب فرانس پر ایک کتاب نکل آئی، کتاب تو فرانسیسی میں تھی مگر انقلاب کا لفظ لکھا دیکھ کر جاپانی افسر کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ انقلابی لٹریچر کے شبہ میں تمام کتابیں ضبط کر لی گئیں، لطف یہ کہ سوائے انقلاب فرانس کی اس تاریخ کی باقی تمام کتابیں شراب بنانے کے متعلق ہیں یا شرابوں کی فہرستیں ہیں، فرانسیسی تاجر نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کی ایک نہ سنی گئی اور تمام کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ میرے کیمرے کو بند کر کے اس پر مہر لگا دی گئی اور تاکید ہوئی کہ راستے بھر اس کو باہر نہ نکالا جائے، جاپانی افسروں کو خطرہ ہے کہ ان کے قلعوں اور جنگی جہازوں وغیرہ کی تصویریں لے کر کہیں چینیوں یا دوسری قوموں کے پاس نہ پہنچا دی جائیں۔

انسان یا ہندوستانی؟:

سامان کی تلاشی کے بعد ہم سب کو پاسپورٹ افسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہاں ہر مسافر کو اپنا نام، باپ کا نام، ماں کا نام، قومیت، نسل، جاپان آنے کی غرض یہ سب لکھوانا پڑا۔ میں نے نسل کے خانے میں 'انسان' لکھا، مگر پاسپورٹ افسر نے اس کو اپنی ہتک سمجھا اور اپنے ہاتھ سے 'ہندوستانی' لکھ دیا۔ ہر مسافر سے یہ بھی پوچھا گیا کہ چین اور جاپان کی جنگ کے متعلق کیا رائے ہے، مجھ سے پہلے ایک یورپین خاتون کا نمبر تھا۔ اس نے تیزی سے جواب دیا، کیا تم واقعی میری رائے پوچھنا چاہتے ہو؟ تو سنو میری ہمدردی سو فی صدی چینیوں کے ساتھ ہے۔" پاسپورٹ افسر اتنا پریشان ہوا کہ اس کے بعد اس نے یہ سوال کسی سے نہ پوچھا اور مجھے اپنی رائے ظاہر کرنے کی ضرورت نہ پیش آئی۔

بڑا صاحب:

علاوہ اس نوجوان کے جو میرے کیبن میں ہے اس جہاز پر ایک اور برطانوی قونصل خانے کا افسر بھی ہے، یہ کچھ عرصہ ہندوستان کی کسی چھاؤنی میں رہ چکا ہے اور کرنل کا درجہ رکھتا ہے، اس کے مزاج میں وہی رعونت اور غرور ہے جو برطانوی افسر ہندوستان میں اختیار کر لیتے ہیں۔ جب اس کے سامان کی تلاشی لی گئی اور اس کو پاسپورٹ افسر کے سامنے پیش ہونے کو کہا گیا تو وہ غصہ سے لال پیلا ہو گیا، معلوم ہوتا تھا کہ تمام سلطنت برطانیہ کی ہتک ہو گئی ہے مگر جاپانی فوجی افسر خود اپنے آپ کو بڑا صاحب سمجھتے ہیں۔ اس لیے انگریز بہادر کو مجبوری اپنا سامان کھول کر دکھانا پڑا مگر

گھنٹوں بڑبڑاتا رہا کہ یہ بین الاقوامی قانون کے خلاف ہے۔ برطانوی قونصل خانے کی ہتک ہے۔ میں ٹوکیو جا کر شکایت کروں گا۔

چین کے دوست:

اس جہاز پر یہ دیکھ کر دل چسپی ہوتی ہے کہ جاپانی سرکاری اور فوجی افسر بھی اب اسی انداز میں گفتگو کرتے ہیں جس طرح انگریز۔ یہ بھی اپنی سلطنت کے حق منوانے کے لیے وہی دلیلیں پیش کرتے ہیں جو انگریز ہمیشہ پیش کرتے آئے ہیں۔ ایک جاپانی افسر مجھ سے باتوں کے دوران میں کہنے لگا: "یہ چینی بالکل جنگلی اور وحشی ہیں، ذرا تمیز نہیں ہے۔ انگریزوں اور روسیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں، اب ہم ان کو مہذب بنا کر مشرق میں امن و امان قائم کریں گے۔ جب سلطنت کا نشہ انسان کے دماغ پر چھا جاتا ہے تو پھر عقل اور تمیز رخصت ہو جاتی ہیں۔ آج جاپانی یہ بھول گئے کہ ان کا تمدن اور تہذیب، ان کی معاشرت، ان کی زبان اور رسم الخط ان کا آرٹ اور لٹریچر سب کچھ چین سے مانگا ہوا ہے۔ چینیوں نے کبھی آج تک جاپان پر دھاوا نہیں کیا، جاپانیوں کے حقوق کو نہیں دبایا۔ آج جاپانی فوجیں چین کی سرزمین پر قتل و غارت کر رہی ہیں، وہاں ان کی موجودگی ہی جاپان کا قصور ثابت کرنے کے لیے کافی ہے، جب میں نے اس کی رائے سے اختلاف کیا تو جاپانی افسر کہنے لگا، مگر انگریزوں، امریکنوں اور فرانسیسیوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ چین کی سرزمین پر رہیں اور ملک کی تجارت میں ان کا حصہ ہو؟ جاپان ان کو ہٹا کر اپنے حقوق حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بحث خواہ مخواہ لمبی ہوتی جا رہی تھی مگر میں نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ ایک بے انصافی دوسری بے انصافی کے لیے کوئی دلیل نہیں ہو سکتی، گفتگو کا رخ بدل کر جاپانی افسر کہنے لگا۔ "مگر تم غلط سمجھتے ہو کہ ہم چینیوں کے دشمن ہیں،، ہم تو ان کے سب سے بڑے دوست اور سرپرست ہیں، مثلاً اس جہاز پر اور باقی تمام جہازوں پر تم دیکھو گے کہ باورچی خانے میں چینی ہی ملازم ہیں اور کپڑے دھونے کا کام بھی فقط چینی ہی کرتے ہیں۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا انگریزوں کا کہنا کہ ہندوستان کی حکومت میں ہندوستانی برابر کے حصے دار ہیں کیونکہ وائسرائے کے تمام کلرک اور چپراسی ہندوستانی ہیں۔

جاسوس:

قصے کہانیوں، ناولوں اور خصوصاً فلموں میں جاسوس عورتوں کی کارگزاری کے متعلق بہت کچھ پڑھا اور دیکھا تھا، مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ایک دن واقعی ایک چالاک جاسوس عورت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ دوپہر کے کھانے اور شام کی چائے پر میں اور فرانسیسی سوداگر ایک ہی میز پر بیٹھے تھے۔ دونوں دفعہ ایک نوجوان روسی عورت بھی ہمارے پاس بیٹھی اور کھانے کے دوران میں مختلف باتیں کرتی رہی، شنگھائی میں ہزاروں کی تعداد میں وہ روسی آباد ہیں جو مزدوروں کی حکومت قائم ہونے کے بعد اپنے ملک سے بھاگ آئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ مختلف قوموں کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا۔ اس لیے میں اس عورت سے باتوں میں بہت محتاط رہا۔ وہ پہلے ہندوستان کے متعلق پوچھتی رہی.........انگریزوں کے خلاف تحریک کا کیا رنگ ہے، جاپانیوں کے متعلق ہندوستانیوں کی کیا رائے ہے؟'' وغیرہ۔ اس کے بعد ہم سے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ کس کام سے؟ کہاں ٹھہرو گے؟ جب ہم نے اس کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہی ہے تو اس نے فقط یہ کہا کہ شنگھائی میں گرمی کی وجہ سے جاپان سیر کے لیے جا رہی ہے۔ میں نے کہا کیا تم جاپانی زبان جانتی ہو؟ کہنے لگی نہیں مگر تھوڑی دیر بعد ہم نے اس کو پاسپورٹ افسر سے جاپانی میں باتیں کرتے ہوئے سنا۔ تب تو ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ جاسوس ہے، رات کے کھانے پر وہ دوسری میز پر بیٹھی۔

پروپیگنڈا:

رات کے کھانے کے بعد کھانے کے کمرے ہی میں چند جاپانی فلم دکھائے گئے جو زیادہ تر جنگ کے متعلق تھے۔ ظاہر ہے کہ فقط جاپانیوں کی فتح کے مناظر دکھائے گئے تھے۔ مگر میں نے یہ عجیب بات دیکھی کہ ان فلموں کو دیکھ کر جاپانی مسافروں نے بھی کسی خاص دل چسپی اور جوش کا اظہار نہیں کیا۔ رہے غیر جاپانی مسافر تو وہ قتل و غارت کی اس فلمی داستان جو جاپانی پروپیگنڈے کی غرض سے تیار کی گئی تھی دیکھنے کے لیے تیار نہ تھے اور ہم لوگ ایک ایک دو دو کر کے کمرے سے باہر ڈک پر آ گئے، چاند نکلا ہوا تھا اور سمندر کی رو پہلی لہریں نہایت خوش گوار سماں پیدا کر رہی

تھیں۔ اتنے میں ایک زبردست جاپانی جنگی جہاز چین کی طرف جاتا ہوا ہمارے قریب سے گزرا اور فضا پر ایک مہیب سایہ چھا گیا۔

ناگاساکی:

14 جولائی۔ صبح آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ہم نہایت سرسبز اور خوب صورت جزیروں کے پاس سے گزر رہے ہیں۔ جاپان درجنوں جزیروں کا مجموعہ ہے اور اب ہم دراصل ملک کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں، دس بجے کے قریب ہم ناگاساکی بندرگاہ پر پہنچے۔ یہ چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جس کی اہمیت فقط یہ ہے کہ ریلوے لائن یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ جاپان کے ایک کنارے واقع ہونے سے اس کو فوجی اہمیت بھی حاصل ہے اور اسی لیے ہم لوگوں کو سخت تاکید کر دی گئی ہے کہ ہرگز کوئی تصویر نہ لی جائے۔ چند عورتیں جن کے پاس کیمرے تھے ان سے نہایت بدتمیزی سے کیمرے چھین لیے گئے، جب جہاز ٹھہرا تو ہم نے دیکھا کہ ساحل پر مرد اور عورت والینٹروں کی ایک قطار کھڑی ہے، معلوم ہوا کہ یہ لوگ ان فوجیوں کی راکھ کا استقبال کرنے کے لیے آئے تھے جو ہمارے جہاز پر آئی ہے، جس وقت یہ متبرک ڈبہ اتارا جا رہا تھا تو ہمیں حکم دیا گیا کہ تم منہ موڑ لو اور ساحل کی طرف مت دیکھو کیونکہ تمہاری نگاہوں سے ان پاک روحوں کی توہین ہوتی ہے۔ تنگ نظر قوم پرستی کے اس مظاہرہ کے ساتھ جاپان کی سرزمین نے ہمارا استقبال کیا۔

ناگاساکی سے میں کوبے کے لیے ریل میں سوار ہوا۔ زیادہ تر وہی لوگ تھے جو جہاز میں ہمراہ تھے۔ دو بوڑھی مشنری انگریز عورتیں میرے قریب بیٹھی تھیں۔ ان سے جاپان کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ ریل چاول کے کھیتوں کے بیچ میں سے گزر رہی تھی۔ یہاں میں نے دیکھا کہ جاپانی کسانوں کی بھی تقریباً وہی حالت ہے جو ہندوستان میں ہے۔ ملک میں چوپایوں کی کمی ہے۔ اس لیے مرد اور عورتیں اپنے ہاتھوں سے ہل چلاتے ہیں، گاؤں کے قریب سے گزرے تو دیکھا کہ ان کے بوسیدہ جھونپڑوں سے مفلسی ٹپکتی ہے۔ جاپان میں بھی ہندوستان کی طرح زمینداری راج ہے، کسانوں کو پیٹ بھرنے اور تن ڈھکنے کے لیے بھی میسر نہیں آتا۔ کیا یہ غریب کسان (میں سوچتا رہا) واقعی چاہتے ہیں کہ چین کو فتح کرنے کے لیے لاکھوں جاپانی اپنی جان دے دیں! راستے بھر

فوجیوں سے بھری ہوئی ریلیں ناگاساکی کی طرف جاتی ہوئی ملیں، معلوم ہوتا ہے جن پانچ سو سپاہیوں کی راکھ ہمارے جہاز میں آئی ہے ان کی جگہ لینے کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ راکھ جس ڈبے میں ہے وہ ریل کے الگ ایک درجے میں رکھا ہوا ہے اور چار شنتو پجاری اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ ہر اسٹیشن پر سینکڑوں مرد اور عورتیں اس کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ بعض عورتوں کو دیکھا کہ چپکے چپکے رو رہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بھائی یا شوہر یا لڑکے لڑائی میں کام آئے ہیں۔

جاپان کا نقشہ:

چلتی ہوئی ریل میں سے بھی انسان کتنا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جاپان کا قدرتی نقشہ آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ میلوں تک چاول کے کھیت لہلہا رہے ہیں۔ ان میں محنت سے جھکے ہوئے کسان...... مرد اور عورت...... میلے سیاہ کپڑوں میں...... کام کر رہے ہیں۔ ہل چلا رہے ہیں، پانی دے رہے ہیں، دور افق پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، دل کش جاپان، رنگین پھولوں کا ملک، مگر ریل کے کنارے کوئی پھول نہیں اگتے۔ انجنوں کے زہریلے دھویں نے سب کو فنا کر دیا ہے۔ اب ریل ایک شہر میں سے گزر رہی ہے۔ بڑے بڑے کارخانے، سیاہ بدہیئت عمارتیں، چمنیوں میں سے دھوئیں کے بادل نکل رہے ہیں۔ ایسے ماحول میں کہیں پھول اگ سکتے ہیں؟ مگر اس کا مجھے کوئی افسوس نہیں۔ رئیسوں اور شاعروں کی تفریح کے لیے پھولوں کے باغ بنانے سے بہتر ہے کہ مزدوروں کی حالت بہتر کرنے کے لیے کارخانے چلائے جائیں، یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ گاؤں اور قصبوں اور شہروں میں ہر جگہ بجلی کے تار لگے ہوئے ہیں ریلوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہر اسٹیشن پر ہزاروں کی تعداد میں اخبار بکتے ہیں۔ یہ ترقی قابل تعریف ہے...... مگر پھر بھی شنگھائی کے ان کھنڈروں اور ہزاروں بیواؤں اور یتیموں کا خیال کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ ترقی کے لیے کیا یہ سب بھی ضروری ہے؟

حسین منظر:

شام کے سات بجے کے قریب ہم موجی کے مقام پر پہنچتے ہیں۔ یہاں ایک جزیرہ ختم ہو جاتا ہے، ریل سمندر کے کنارے لگ جاتی ہے اور یہاں سے ہم ایک جہاز میں سوار ہو کر

دوسرے جزیرے میں پہنچ گئے۔ دونوں جزیروں کے درمیان سمندر فقط دو ڈھائی میل چوڑا ہے۔ سورج پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا اور کنارے کی روشنیوں کا عکس سمندر میں عجب پر کیف منظر پیش کر رہا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جیسے جاپانی مصوری کے نمونوں میں اکثر دیکھے جاتے ہیں۔ میں اس خوب صورت منظر کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

دوسری طرف ہم جس مقام پر اترے اس کا نام شمونی ہے۔ یہاں ریل تیار تھی، اس میں از حد بھیڑ۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح میں سوار ہو ہی گیا۔ رات بھر بیٹھے بیٹھے کتاب پڑھ کر گزاری۔

کوبے:

15 جولائی— صبح 6 بجے ریل 'کوبے' کے شاندار اسٹیشن پر پہنچی۔ قلی سے سامان اٹھوا کر میں باہر آیا۔ تمام قلی یورپین لباس پہنتے ہیں اور سامان بھی سر پر نہیں اٹھاتے، ہاتھوں میں اٹھاتے ہیں یا کندھے پر لادتے ہیں اور اگر بھاری ہو تو ٹھیلے پر لے جاتے ہیں۔ باہر ٹیکسیوں کی ایک قطار کھڑی تھی۔ میں انڈیا لاج جانا چاہتا تھا مگر اپنا مطلب ٹیکسی والوں کو نہ سمجھا سکا کیونکہ وہ انگریزی بہت کم جانتے تھے، ایک ٹیکسی والا مجھ کو لے کر چلا اور انڈیا لاج کی تلاش شروع کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ایک اور دقت یہ تھی کہ آدھی سے زیادہ سڑکیں بند ملیں۔ میں نے شنگھائی میں پڑھا تھا کہ کوبے میں سیلاب آیا ہے۔ مگر مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ اتنا سخت نقصان ہوا ہے۔ ہزاروں مکان تباہ نظر آئے۔ سڑکوں پر ہزاروں من ملبہ، درخت، پتھروں اور اینٹوں کے ڈھیر پڑے ہوئے ہیں۔ پانی کا یہ ریلا پہاڑ کی چوٹی کی طرف سے آیا تھا جو کوبے کی پشت پر ہے اور اس لیے ہزاروں بھاری پتھروں اور درختوں کو بھی اپنے ساتھ بہا لایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدھے کے قریب شہر برباد ہو گیا۔ سینکڑوں جانیں گئیں۔ ہزاروں بے گھر ہو گئے۔ کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ شہر میں معلوم ہوتا ہے ہوائی جہازوں سے گولہ باری ہوئی ہے، مگر جاپانیوں کی طرح چینی اتنے وحشی نہیں ہیں کہ وہ نہتے شہریوں پر بم برسائیں۔ چینی ہوائی جہاز فقط ایک مرتبہ جاپان کے شہروں پر منڈلائے ہیں اور اس دفعہ انھوں نے بجائے بم اور گولے پھینکنے کے جاپانی زبان میں لکھے ہوئے اشتہار برسائے۔ ان اشتہاروں میں جاپانی عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ اس موجودہ جنگ کو بند

کریں کیونکہ اس کی وجہ سے اُن کا بھی نقصان ہے۔ 'کوبے' کی یہ حالت دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ چینی ہوابازوں نے انسانیت کا ثبوت دیا مگر قدرت نے جاپانیوں کو معاف نہیں کیا۔

انڈیالاج:

انڈیالاج کا پتہ نہ ملنے کی وجہ سے مجھے اورینٹل ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا اچھا شاندار ہوٹل ہے، بالکل یورپین طرز پر۔ مہنگا بھی بہت نہیں اسی درجے کے ہندوستانی ہوٹلوں سے بہت سستا ہے۔ نہادھوکر پھر باہر گھومنے نکلا۔ امریکن ایکسپریس کے نمائندے سے ملا اور اس سے انڈیالاج کا پتہ معلوم کیا۔ ٹیکسی لے کر چلا اور سڑکوں پر ملبہ پڑے ہونے کی وجہ سے دور دور کا چکر لگا کر آخر کار انڈیالاج پہنچا۔ یہاں لاج کے سکریٹری اور جاپان میں مقیم ہندوستانیوں کے لیڈر مسٹر سہائے سے ملاقات ہوئی۔ بہت خلیق اور مہمان نواز آدمی ہیں۔ انھوں نے فوراً حکم دیا کہ اپنا سامان ہوٹل سے لے آؤ مگر چونکہ کرایہ تو دن بھر کا دینا پڑے گا اس لیے میں نے اگلی صبح کو آنے کا وعدہ کیا۔ انڈیالاج 'کوبے' میں ہندوستانیوں کا مرکز ہے...... یہاں تقریباً ایک درجن ہندوستانی طالب علم رہتے ہیں، جن میں سے زیادہ تر کارخانوں میں صنعتی کام سیکھ رہے ہیں۔ یہاں چند ہندوستانی اخبار آتے ہیں۔ ہندوستانی گراموفون ریکارڈوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے اور ہندوستانی کھانا ملتا ہے۔ مسٹر اور مسز سہائے کی نگرانی میں سب طالب علم نہایت آرام سے رہتے ہیں اور خرچ بھی ہندوستان کے کالجوں کے ہوسٹلوں سے کچھ زیادہ نہیں ہے، مسٹر سہائے کا نام میں نے ہندوستان میں سنا اور پڑھا تھا۔ وہ ان سینکڑوں قوم پرست ہندوستانیوں میں سے ہیں جو جلاوطنی میں دن کاٹ رہے ہیں۔ اگر چہ کانگریسی وزارتیں قائم ہونے کے بعد قوی امید ہے کہ جلد از جلد ہم ان کو واپس ہندوستان بلانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

تباہی:

مقامی انگریزی اخبار پڑھنے سے 'کوبے' کی تباہی کا پورا اندازہ ہوا۔ سرکاری بیان کے رو سے سیلاب کی وجہ سے 542 جانیں تلف ہوئیں۔ 12669 اشخاص زخمی ہوئے، 2844 مکان بہہ گئے، 3108 مکان گر پڑے۔ 6042 مکانوں کے بعض حصے گرے۔ 126355 مکانوں میں پانی

داخل ہو گیا۔ کل نقصان کئی کروڑ روپے کا ہوا۔ یہ اعداد فقط 'کوبے' شہر کے ہیں۔ آس پاس کے قصبوں اور دیہات میں جو نقصان ہوا اس کا ابھی تک کوئی اندازہ نہیں کر سکا۔ اس سیلاب ہی کی وجہ سے جاپانی حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے ملک میں 1940 کے بین الاقوامی کھیلوں کے مقابلے نہیں منعقد کریں گے۔ مگر جاپان کے باہر اس سیلاب کی اہمیت کو واضح نہیں کیا گیا کیونکہ جاپانی یہ نہیں چاہتے کہ غیر ملک والوں کو ان کی مصیبت کا پتہ چلے، شنگھائی کے اخباروں میں میں نے جو پڑھا تھا اس سے معلوم ہوتا تھا بہت معمولی نقصان ہوا ہے۔

سنیما:

شام کو انڈیا لاج کے چند دوستوں کے ساتھ سنیما دیکھنے گیا۔ پہلے ایک امریکن فلم دکھایا گیا۔ جس میں جاپانی زبان کے مکالے لکھے ہوئے آتے تھے، ساتھ ساتھ ایک آدمی جاپانی میں چلا چلا کر کہانی سمجھاتا رہتا ہے۔ جیسے خاموش فلموں کے زمانے میں ہندوستان میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد ایک جاپانی فلم دکھایا گیا۔ جس کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہمارے ہندوستانی فلم کم از کم جاپانی فلموں سے تو ہزار درجہ بہتر ہیں۔

تاکارازوکا:

16 جولائی۔ صبح اٹھتے ہی سامان باندھ کر ہوٹل چھوڑ کر انڈیا لاج آ گیا۔ یہاں خوب آؤ بھگت ہوئی، ناشتہ کے بعد ایک طالب علم پانڈے کے ہمراہ تاکارازوکا TAKARAZUKA کے لیے روانہ ہوا۔ یہ جاپان میں سب سے زیادہ مشہور تفریح کا مقام ہے، کوبے سے تقریباً پندرہ بیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ اتنا ہی فاصلہ یہاں سے 'اوساکا' کا ہے۔ اس طرح اس تفریح گاہ کو دو بڑے شہروں کے درمیان رکھا گیا ہے۔ تاکہ دونوں جگہ سے لوگ آ سکیں۔ پُر فضا مقام ہے، دور تک باغ اور پارک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے بیچ میں ایک عالیشان عمارت ہے۔ جس میں اوپیرا، تھیٹر، سنیما، ہوٹل، رسٹورنٹ، ناچ گھر، دکانیں، جوا کھیلنے کے کمرے، سب ہی کچھ ہے، یہ ترکیب مجھے پسند آئی کہ ان تمام تفریح گاہوں کو شہر سے دور ایک پُر فضا مقام پر جمع کیا گیا ہے۔ آخر سنیما اور تھیٹروں کو شہروں کے گنجان گلی کوچوں میں کیوں بنایا جائے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ

یہاں کافی بھیڑ تھی باوجود شہر سے اتنا فاصلہ ہونے کے اور باوجود ملک کی اقتصادی حالت روز بروز بدتر ہونے کے ہزارہا لوگ اوپیرا دیکھنے آئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے جاپانی کھیل تماشوں کے بہت شوقین ہیں۔

اوپیرا:

دو بجے کے قریب اوپیرا شروع ہوا۔ ہال نہایت عالیشان ہے۔ تقریباً ڈھائی ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ تمام ہال میں صرف ایک درجہ ہے اور جو پہلے آئے وہ جہاں چاہے بیٹھ سکتا ہے۔ اسٹیج بہت بڑا اور موجودہ طرز کا ہے۔ جس کو ضرورت کے وقت گھمایا بھی جاسکتا ہے۔ پردہ اٹھا اور تماشہ شروع ہوا۔ امریکن گانے اور ناچ کے ڈرامے MUSICAL COMEDY REVIEW کا ہو بہو چربہ تھا ایکٹنگ معمولی درجہ کی تھی مگر اسٹیج کا انتظام، روشنی کی تبدیلی، موسیقی کا اتار چڑھاؤ وغیرہ کی داد دینا پڑتی ہے اور دو خصوصیات قابل ذکر تھیں۔ اول تو تمام ڈرامے میں لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کے کردار لڑکیاں ہی کر رہی تھیں۔ اس اوپیرا میں چار سو نوجوان لڑکیاں ملازم ہیں جو اداکاری اور ناچ کی تعلیم پاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ڈرامے کے بعض سین سینما کے پردے پر دکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً جب یہ دکھانا منظور تھا کہ ایک لڑکا گھر سے نکل کر موٹر میں بیٹھا ہوا جا رہا تھا۔ اسی طرح چلتی ہوئی ریل جہاز، ہوائی جہاز وغیرہ کے سین بھی اسی طرح دکھائے گئے۔ اس ترکیب سے اسٹیج اپنی حدود کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ تماشہ مجموعی حیثیت سے کافی دلچسپ تھا مگر اس میں کوئی جاپانی خصوصیات نہیں تھیں۔ لباس، ناچ، گانا، غرض ہر چیز میں امریکن تمدن کی نقل تھی۔

جاپان اور ہندوستان:

تاکارازوکا سے شام کو واپس ہوا۔ انڈیا لاج میں رات کے کھانے پر سب ہندوستانی طالب علم موجود تھے۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان میں سے چند لڑکے جاپان کی ظاہری ترقی سے اس قدر مرعوب ہوگئے ہیں کہ وہ چین میں جاپان کی موجودہ کارروائیوں کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔ وہ تمام دلیلیں پیش کرتے ہیں جو جاپانی حکومت کے پروپیگنڈے میں سننے میں آتی ہیں۔ اگر انگریز تمام دنیا میں سلطنت قائم کر سکتے ہیں تو جاپانیوں کو

بھی حق حاصل ہے کہ چین پر قبضہ کرلیں۔ چین سوویت روس کے زیر اثر ہے اس لیے جاپان اس کو کمیونزم سے بچائے گا۔ جاپان کا بڑھتا ہوا اقتدار انگریزوں کی طاقت کو کم کرے گا اور ہندوستان آزاد ہو سکے گا۔'' وغیرہ وغیرہ۔ ہم ہندوستانیوں میں یہ بڑی کمزوری ہے کہ جس کسی آزاد ملک میں جاتے ہیں وہاں کے حالات سے اس قدر مرعوب ہو جاتے ہیں کہ اچھے برے میں بھی تمیز نہیں کر سکتے، جو کوئی جرمنی ہو آیا ہے وہ ہٹلر کے گیت گاتا آتا ہے۔ اگر کوئی اٹلی گیا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ مسولینی کی فاشزم ہی میں ہندوستان کی نجات ہے۔ اسی طرح جو ہندوستانی جاپان میں ہیں وہ یہاں کے کارخانے اور صنعتی ترقی، فوجوں کی پریڈ اور تنگ نظر قوم پرستی کے جوشیلے مظاہرے دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ بس دنیا کا بہترین ملک جاپان ہے اور جو کچھ جاپانی کرتے ہیں ٹھیک کرتے ہیں، اس کے علاوہ جاپانی (اور جرمن اور اٹالین بھی) ہماری انگریز دشمنی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جاپان ایشیائی قوموں کی آزادی کا محافظ ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ جو ملک چین کو ہڑپ کرنے کے لیے بے چین ہے وہ ہندوستان کو کب معاف کرے گا۔

والینٹر:

17 جولائی۔ آج صبح انڈیا لاج کے سب لوگ مسٹر سہائے کی سرکردگی میں جاپانی والینٹروں کے ساتھ شہر کا ملبہ صاف کرنے گئے۔ مجھے یہ بات بہت پسند آئی، دوسرے ملکوں میں ہماری حیثیت مہمان کی ہے۔ اگر وہاں کے لوگوں پر کوئی مصیبت پڑے تو ہمارا فرض ہے کہ ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کریں، کوبے میں سیلاب آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ گزر چکا ہے، مگر اب تک باوجود پولیس اور میونسپلٹی کی پوری کوششوں کے آدھے شہر کا ملبہ بھی صاف نہیں ہوا۔ درختوں، اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر ہر جگہ سڑکوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہزاروں شہریوں نے (جن میں بڑی تعداد اسکول اور کالج کے طالب علموں کی ہے) اپنی خدمات اس کام کے لیے پیش کردی ہیں اور والینٹروں کی حیثیت سے وہ اپنا تمام خالی وقت اس کام میں صرف کرتے ہیں۔ جس جگہ ہندوستانی والینٹروں نے کام شروع کیا وہاں مسٹر سہائے نے ہمارا قومی جھنڈا لگا دیا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ فرض شناسی میں ہندوستانی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح انھوں نے جھنڈے کی شان دوبالا کر دی۔

یہ دیکھ کر بھی مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ہندوستانی والینٹروں کے اس گروہ میں ہندو، مسلمان، سکھ سب شامل ہیں۔ 'کوبے' کے تمام ہندوستانی جن میں زیادہ تر تاجر ہیں، آپس میں بڑے اتحاد اور اتفاق کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی زندگی فرقہ پرستی کی وبا سے بالکل محفوظ ہے۔

کیوتو:

دوپہر کے قریب میں ریل سے 'کیوتو' گیا جو کسی زمانہ میں جاپان کی راجدھانی تھی۔ یہ کوبے سے تقریباً ایک گھنٹے کے فاصلے پر ہے، یہ پہلا موقع ہے کہ میں کسی ایسے شہر میں تنہا گھوما، جہاں کی زبان سے میں بالکل ناواقف ہوں مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح کام چل جاتا ہے، اسٹیشن کے قریب سیاحوں کے آرام کے لیے ایک دفتر TOURIST BUREAU ہے وہاں ایک نوجوان انگریزی جانتا تھا، اس سے کیوتو کا ایک نقشہ لیا اور اس پر مشہور مقامات پر نشان لگائے، اس کے بعد میں پیدل چل کھڑا ہوا۔ یہ شہر ہمارے متھرا یا بنارس کی طرح ہے، قدم قدم پر پرانے محل اور مندر ہیں۔ ایک مندر کے سامنے بہت بڑی گھنٹی لٹکی دیکھی جس کا وزن دو ڈھائی سو من سے کم نہ ہوگا۔ اس کو بجانے کے لیے ایک بہت بڑا شہتیر لگا ہوا ہے، جس کو ہلانے کے لیے کم از کم دو آدمی چاہئیں، یہ گھنٹی بدھ مت کے مشہور مندر کیومیزو کے دروازے پر لگی ہے۔ مندر کافی اونچائی پر واقع ہے۔ ہزاروں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا، وہاں سے تمام شہر نظر آتا ہے۔ کیوتو پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے اور اتنی بلندی سے شہر کی عمارتیں بالکل گڑیا کے گھر معلوم ہوتی ہیں، اس مندر کے علاوہ اور کئی مندر دیکھے۔ پرانا شاہی محل بھی دیکھا، ڈیڑھ سو سال پہلے تک جاپان کے بادشاہ یہاں ہی رہتے تھے اور اب بھی ٹوکیو میں تاج پوشی ہونے کے بعد اس محل میں تاجپوشی لازمی ہے۔ مندروں، محلوں اور کھنڈروں میں مجھے کوئی خاص دل چسپی نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ہر جگہ میں نے دیکھا کہ کس حد تک جاپان چین کا قرضدار ہے۔ عمارتوں کی وضع قطع، آرائش، بت سازی، غرض ہر چیز چینی تمدن کی نقل ہے اور آج وہ چینیوں کو وحشی اور جاہل کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ میں نے یہ بھی دیکھا کہ کوئی مندر یا محل یا پرانی عمارت شکستہ حالت میں نہیں

ہے۔ حکومت کی طرف سے ان کی مرمت اور دیکھ بھال برابر ہوتی رہتی ہے۔ اپنی قوم کی پرانی روایات کو تازہ رکھنا قابل تعریف ہے مگر افسوس یہ ہے کہ ان مندروں اور محلوں کو قائم رکھ کر جاپانی عوام کے دلوں میں تنگ نظر قوم پرستی (بلکہ نسل پرستی) اور غرور کے جذبات پیدا کیے جا رہے ہیں!

نارا:

18 جولائی— سویرے اٹھ کر مسز سہائے اور پانڈے کے ہمراہ نارا گیا۔ یہ بھی پرانا اور مشہور شہر ہے اور پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، علاوہ پرانے مندروں کے یہاں کی سب سے مشہور خصوصیت یہ ہے کہ تمام شہر میں تین ہزار کے قریب بارہ سنگھے آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں، یہ بارہ سنگھے ایک مندر سے تعلق رکھتے ہیں اور اس لیے متبرک سمجھے جاتے ہیں، کوئی ان کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔ سیاح اور جاتری ان کو بسکٹ کھلاتے رہتے ہیں۔

نارا کے باغات اور پارک قابل ذکر ہیں، ایک خوب صورت پارک میں تو وائی جی کا مندر ہے، جہاں مہاتما گوتم بدھ کا تمام دنیا میں سب سے بڑا کانسی کا بت رکھا ہوا ہے۔ اس بت کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ فقط چہرہ کی بلندی سولہ فٹ ہے اور دہانے کی چوڑائی ساڑھے تین فٹ ہے۔ یہ بت 749 میں جاپان کے بادشاہ شومو کے حکم سے تیار کیا گیا تھا اس کی تیاری میں تقریباً پانچ سوٹن کانسا خرچ ہوا اور دو سال اس کو ڈھالنے میں لگے۔

جاپان کا مانچسٹر:

نارا سے ہم سب اوساکا گئے، اس شہر کو جاپان کا مانچسٹر کہنا چاہیے۔ میلوں تک کارخانوں کی چمنیاں ہی چمنیاں نظر آتی ہیں۔ زیادہ تر کپڑا یہاں ہی تیار ہوتا ہے۔ شہر مغربی انداز پر بنا ہوا ہے۔ اور کیوتو اور نارا دیکھنے کے بعد بالکل ہی مختلف ماحول معلوم ہوتا ہے، کارخانوں کی چمنیوں کے دھویں سے عمارتیں سیاہ پڑ گئی ہیں۔ ریلیں اور مال کے جہاز برابر آتے جاتے رہتے ہیں، ٹرام اور موٹروں کے شور میں بات کرنا مشکل ہے، غرض موجودہ صنعتی دور کی تمام خصوصیات اوساکا میں موجود ہیں۔

اوساکا منے چی:

شہر میں گھومنے کے بعد ہم اخبار 'اوساکا منے چی' کا دفتر دیکھنے گئے، یہ نہ صرف جاپان کا بلکہ شاید تمام ایشیا کا سب سے بڑا اخبار ہے، جاپانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ جاپانی میں تقریباً بیس لاکھ روزانہ اشاعت ہے اور انگریزی میں کوئی بیس ہزار۔ اسی اخبار کا ایک ایڈیشن ٹوکیو سے' توکیو نچی نچی' کے نام سے بھی شائع ہوتا ہے۔ ایڈیٹر صاحب کی مہربانی سے میں نے دفتر اور پریس کا ہر حصہ غور سے دیکھا اور اتنا زبردست انتظام دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کل ملا کر پانچ ہزار کے قریب ملازم ہیں، اخبار کا اپنا وائرلیس اسٹیشن، اپنا تار گھر اور اپنے ہوائی جہاز ہیں۔ اسی اخبار کی طرف سے خبروں کے فلم بھی تیار ہوتے ہیں اور اندھوں کے لیے ایک ہفتہ وار رسالہ بریل کے حروف میں شائع ہوتا ہے۔ جب تک ہمارے ملک میں بھی جبری اور مفت تعلیم نہ ہوگی ہمارے اخباروں کی اتنی شان نہیں ہو سکتی۔

کوبے کی مسجد:

شام کو' کوبے' واپس آکر یہاں کی مسجد دیکھنے گیا۔ ایک تنگ گلی میں چھوٹی سی مگر خوشنما عمارت ہے۔ نیچے ایک ہال ہے اور اوپر لائبریری، مدرسہ وغیرہ کے لیے کمرے ہیں۔ مُلّا صاحب معلوم ہوا ٹوکیو گئے ہوئے ہیں۔ ان کے نائب سے ملاقات ہوئی، پانڈے کے ذریعہ ان سے جاپانی زبان میں بات چیت کی، یہ مسجد جاپانی حکومت کے خرچ سے بنی ہے اور قانوناً اس کی حیثیت حکومت کی ملکیت کی ہے۔ اس کی بنا کی وجہ یہ ہے کہ روس میں انقلاب کے بعد بہت سے تاتاری ترک زمیندار وغیرہ مزدوروں اور کسانوں کا ملک چھوڑ کر جاپان میں آباد ہو گئے ہیں، موجودہ حالات میں جاپانی حکومت ان سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ چین کے مسلمانوں میں پروپیگنڈہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جاپانی مسلم دوستی کا ثبوت دیں۔ اس لیے کوبے اور ٹوکیو میں مسجد بنا کر ان کی تصویریں چینی مسلمان علاقوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جاپان مسلمانوں کا سچا ہمدرد اور دوست ہے۔ مگر مسولینی کے' محافظ اسلام' کے ڈھونگ کی طرح یہ سب سامراجی چالیں ہیں جن سے دنیا کے

مسلمان اچھی طرح آگاہ ہو چکے ہیں۔

رات کے پونے گیارہ بجے کی ریل سے ٹوکیو کے لیے روانہ ہو گیا۔ انڈیا لاج کے دوست اسٹیشن پر پہنچانے آئے۔ کوبے میں چند روز کا قیام ان کی مہمان نوازی اور اخلاق کی وجہ سے یادر ہے گا۔

فوجی مایا:

اس دفعہ میں سونے کی گاڑی SLEEPING CAR میں سفر کر رہا ہوں۔ سیکنڈ کلاس ٹکٹ کے علاوہ تقریباً ڈھائی روپے زائد دینے سے ایک پوری سیٹ سونے کے لیے مل جاتی ہے۔ بستر ریلوے کمپنی کی طرف سے مہیا کیا جاتا ہے۔ نہ صرف بستر بلکہ پہننے کے لیے سوتی کمونو (جاپانی وضع کا لبادہ یا ڈریسنگ گاؤن) اور تنکوں کے بنے ہوئے سلیپر بھی۔ رات کو نہایت آرام سے سویا۔

19 جولائی۔ صبح سویرے آنکھ کھلی تو کھڑکی میں سے دور فاصلہ پر فوجی یاما پہاڑ نظر آیا جو سورج کی پہلی کرنوں میں چمک رہا تھا۔ یہ جاپان کا سب سے اونچا اور مقدس پہاڑ ہے، مگر ہمارے ہندوستان کے پہاڑوں کے مقابلے میں کچھ بھی اونچا نہیں مگر جاپانیوں کے قومی غرور کی یہ حالت ہے کہ وہ اپنے ملک کی ہر چیز کو دنیا بھر میں بہترین اور سب سے بڑی سمجھتے ہیں۔ ایک مسافر جو میرے قریب بیٹھا ہوا تھا کہنے لگا۔ ''کیا تمھارے ملک میں بھی پہاڑ ہوتے ہیں؟ میں نے کہا 'ہاں' پھر کہنے لگا۔ ''مگر اتنے اونچے اور اتنے خوب صورت نہیں ہو سکتے۔ جتنا ہمارا فوجی یاما''

ٹوکیو:

تقریباً ساڑھے نو بجے ٹوکیو پہنچا۔ کافی بڑا شہر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی دس میل پہلے سے آبادی شروع ہو گئی تھی۔ اسٹیشن بھی شاندار ہے، میں نے ریلوے ہوٹل میں ایک کمرہ لیا۔ اچھا بڑا ہوٹل ہے اور کمرہ بھی کافی آرام دہ ہے۔ نہا دھو کر کھانا کھایا اور ٹیکسی لے کر پروفیسر برلاس کے مکان گیا جو ٹوکیو کی یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہیں، راستے میں ٹوکیو کی گنجان آبادی کا اندازہ ہوا۔ شہر کا زیادہ تر حصہ مغربی انداز میں ہے۔ بمبئی کی طرح چھ سات منزل کی شاندار عمارتیں ہیں، بڑی بڑی دوکانیں، سنیما، تھیٹر وغیرہ۔ پروفیسر برلاس کا مکان شہر کے کنارے پر ہے جہاں چھوٹے چھوٹے بنگلے نما مکان ہیں۔ پروفیسر برلاس اور ان کی بیگم صاحبہ بڑے تپاک سے ملے

اوران کے گھر میں مسافرت کا احساس جاتا رہا۔ دونوں نے بڑی خاطر کی۔ کئی دنوں کے بعد اچھا ہندوستانی کھانا نصیب ہوا۔ اب معلوم نہیں کب ملے۔ اس لیے میں نے بھی خوب ڈٹ کر کھایا۔

پروفیسر برلاس کئی سال سے ٹوکیو یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں، اپنے علم اور اخلاق کی وجہ سے بہت ہر دل عزیز ہیں، جاپان کے قیام کے دوران میں انھوں نے اس ملک کے متعلق کافی واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ کتابوں کا ایک بیش قیمت ذخیرہ جمع کیا ہے۔

بیگم برلاس بھی ادبی دلچسپی رکھتی ہیں اور اردو کے زنانہ رسالوں میں مدت سے میں ان کے مضامین پڑھتا رہا ہوں۔ دیر تک پروفیسر اور بیگم برلاس سے جاپان کے حالات کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

زبانِ یارِ من:

شام کے قریب ایک ہمسایہ لڑکی بیگم برلاس سے ملنے آئی۔ میرا بھی اس سے تعارف کرایا گیا۔ مگر نہ وہ انگریزی جانتی ہے اور نہ اردو، اس لیے پروفیسر صاحب اور بیگم صاحبہ کے ذریعہ سے اس سے باتیں ہوتی رہیں، وہ مصوری سیکھتی ہے، میں نے کہا کہ میری دستخطوں کی کتاب AUTOGRAPH BOOK میں کوئی تصویر بنادو، اس نے پانچ منٹ میں قلم سے ایک جاپانی لڑکی کا خاکہ بنادیا، پھر وہ دوڑ کر اپنے گھر گئی اور اپنی دستخطوں کی کتاب لے آئی اور مجھ سے فرمائش کی کہ میں کچھ لکھ دوں، میں نے حسب حال لکھ دیا۔'' زبان یارمن ترکی وترکی نمی دانم۔'' جب بیگم برلاس نے اس کا مطلب اس کو سمجھایا تو وہ دیر تک ہنستی رہی۔

زیارت گاہیں:

20 جولائی— برلاس صاحب کا لڑکا مسعود آج صبح ہوٹل آگیا اور اس کے ساتھ میں ٹوکیو کی سیر کو روانہ ہو گیا۔ موٹر لے کر تمام شہر کو چھان مارا۔ دہلی، اجمیر اور بنارس کی طرح ٹوکیو میں بھی لاتعداد زیارت گاہیں ہیں۔ پرانے مندر، بادشاہوں اور شہیدوں کے مقبرے، تعجب کی بات یہ ہے کہ میں نے ان زیارت گاہوں میں ایک مقبرہ بھی کسی ولی، مہاتما، فلسفی، شاعر یا ادیب کا نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا ہے جاپان میں فقط جاں نثار سپاہیوں کی یادگاریں قائم کی جاتی ہیں۔ ایک مقبرہ

دیکھا، جہاں سینتالیس سپاہیوں کی خاک دفن ہے، یہ سپاہی ایک نوابؒ کے ملازم تھے، کسی وجہ سے نواب پر عتابِ شاہی نازل ہوا اور اس کی بے عزتی کی گئی۔ وفادار سپاہیوں سے اپنے مالک کی تحقیر نہ برداشت ہو سکی اور انھوں نے خودکشی کر لی۔ اب ان کی پرستش کی جاتی ہے۔

گنج شہیداں:

ان زیارت گاہوں میں سب سے مشہور' یاساکونی جنجا' ہے جس کو' گنج شہیداں' سمجھنا چاہیے، اس عمارت میں ہزاروں سورما اور شہید دفن ہیں، ٹوکیو کے اسکولوں بلکہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے طالب علموں کو بھی اس جگہ کی زیارت کے لیے وقتاً فوقتاً جانا پڑتا ہے، جب سے چین کی موجودہ جنگ شروع ہوئی ہے اس مقام کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے، ہر جاپانی بچے اور نوجوان کو یہاں لاکر یہ سبق دیا جاتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ان شہیدوں کی طرح اپنے ملک اور بادشاہ کی خاطر جان دے دے۔ جب میں نے اس زیارت گاہ کے صحن میں پہنچ کر احترام کے خیال سے ٹوپی اتاری تو مجھ پر بھی اس مقدس ماحول کا کافی اثر ہوا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ مجھ میں بھی ان' شہیدوں' کی تقلید میں جان دینے کا جذبہ پیدا ہوتا، میں تمام وقت یہ سوچتا رہا کہ کب تک انسان وطن پرستی کے نام پر خون بہاتا رہے گا۔ یہ ہزاروں شہید جن کی روحوں کے مسکن میں میں کھڑا تھا جاپان کی حفاظت کرتے ہوئے، جاپان کی سرزمین پر نہیں قتل ہوئے بلکہ منچوریا اور چین پر پے در پے حملوں کے دوران مارے گئے۔ ان میں کوئی شک نہیں کہ اپنے خیال کے مطابق وہ اپنے ملک کی خدمت کر رہے تھے، اس لیے ان کی روحوں سے مجھے ہمدردی تھی مگر ان کے قاتل چینی سپاہی نہیں بلکہ وہ جاپانی سرمایہ دار اور سیاست داں تھے جو اپنی ذاتی اغراض کے لیے ہزاروں جاپانیوں اور لاکھوں چینیوں کا خون بہا رہے ہیں۔

اس مقام پر میری ملاقات ایک نوجوان شنتو راہب سے ہوگئی جو اسی زیارت گاہ سے متعلق ہے۔ وہ انگریزی بخوبی بول سکتا تھا، مجھ سے دیر تک ہندوستان کے متعلق باتیں کرتا رہا، گفتگو کے دوران میں معلوم ہوا کہ وہ ٹوکیو یونی ورسٹی کا گریجویٹ ہے مگر کسی دوسری نوکری کے بجائے اس نے راہب بننا پسند کیا تھا۔

شنتو:

یہ راہب شنتو مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ جاپان کا سرکاری مذہب شنتو ہی ہے، گو بدھ مت کے پیرو بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں، دراصل شنتو ایک مذہب سے بھی بڑھ کر حیثیت رکھتا ہے اور ہر جاپانی کے لیے (خواہ وہ بدھ ہو یا عیسائی) لازمی ہے کہ وہ شنتو میں عقیدہ رکھتا ہو شنتو کی پوری تفصیل کے لیے تو کئی کتابیں چاہیے اور میں باوجود کوشش کے خود بھی اس عجیب وغریب مذہب کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکا۔ مگر شنتو کی بنیاد جاپانی بادشاہوں اور اپنے آباواجداد کی روحوں کی پرستش پر ہے، اس مذہب کے پیروں کا عقیدہ ہے کہ تمام جاپانی قوم سورج دیوتا سے پیدا ہوئی ہے اسی لیے وہ اپنی قوم کو دنیا کی اور تمام قوموں سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ جاپانیوں کا بادشاہ سورج دیوتا کا جانشین ہے۔ اس لیے (شنتو کے بموجب) اس کو تمام دنیا پر حکومت کرنے کا حق ہے۔ علاوہ بادشاہ کے وہ چاند، تاروں، ہوا، آسمان وغیرہ کی پرستش کرتے ہیں کیونکہ یہ مظاہر قدرت بھی سورج سے پیدا ہوئے ہیں اور آباء واجداد کی حیثیت رکھتے ہیں، اس طرح شنتو کے بموجب ہزاروں دیوتا ہیں ہر خاندان کے آباواجداد بھی دیوتاؤں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی پرستش کی جاتی ہے مگر آج کل شنتو سے ایک سیاسی فائدہ اٹھایا جارہا ہے، جاپانیوں کو یہ یقین دلا دیا گیا ہے کہ سورج دیوتا کی اولاد ہونے کی حیثیت سے ان کے بادشاہ اور خود جاپانی قوم کا حق بلکہ فرض ہے کہ تمام دنیا پر حکومت کرے، چین پر حملہ کی غرض بھی یہی بتائی جاتی ہے کہ سورج دیوتا کی سلطنت کی توسیع ہو، بادشاہ کی تابعداری ہر جاپانی پر فرض ہے، دراصل بادشاہ بیچارہ تو برائے نام ہے۔ اس کے وزیر اور دوسرے حالی موالی اس کے نام سے جو احکامات جاری کرتے ہیں ان کو بجالانا ہر جاپانی اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود بڑھتے ہوئے افلاس اور ہزاروں جانوں کے نقصان کے جاپانی قوم اب تک موجودہ جنگ سے پوری طرح بیزار نہیں ہوئی، مگر پھر بھی مذہبی عقیدہ ہمیشہ کے لیے بھوک اور موت پر غالب نہیں آسکتا۔ جوں جوں چین کی جنگ کی وجہ سے ملک میں مفلسی بڑھتی جائے گی شنتو کے متوالے بھی اپنے عقائد بدلنے پر مجبور ہوں گے۔

دوسرے مذاہب:

شنتو کے علاوہ جاپان میں بدھ مت کے پیرو بھی کافی تعداد میں موجود ہیں، بدھ مت ہندوستان سے چین ہوتا ہوا جاپان پہنچا اور اس ملک کے تمدن اور معاشرت پر اس کا زبردست اثر ہے۔ اسی مذہب کی بدولت جاپانی زبان میں کافی الفاظ سنسکرت کے پائے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے عیسائی مشنریوں کو جاپان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی، عیسائیوں پر نہایت ظلم ہوتا تھا مگر اب ان کو مذہبی آزادی ہے۔ اس شرط پر کہ وہ شنتو عقائد کے خلاف پرچار نہ کریں، میں نے ایک عیسائی مشنری سے پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ایک شخص عیسائی بھی ہے اور شنتو کا بھی پیرو ہے، اس نے کہا۔ 'شنتو جاپانیوں کا قومی مذہب ہے، ہم اس کے عقیدوں سے الجھے بغیر حضرت عیسیٰ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔' حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے پروپیگنڈے کی بدولت شنتو کا اثر جاپان میں اتنا مضبوط ہے کہ کوئی دوسرا مذہب اس کی مخالفت کر ہی نہیں سکتا جاپانی عیسائی بھی نام ہی کے ہوتے ہیں، بادشاہ اور آباء واجداد کی پرستش برابر کرتے ہیں۔

مسلمان:

چند سال سے ہندوستان کے بعض اخباروں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ جاپان اسلام کی طرف رجوع ہو رہا ہے اور جاپانی بڑی تعداد میں مسلمان ہو رہے ہیں، میں نے جاپان میں آکر دیکھا کہ اس بیان میں کوئی حقیقت نہیں ہے، روس سے بھاگے ہوئے چند تاتاری ضرور آباد ہیں جو جاپانی حکومت کے آلۂ کار ہیں، حکومت نے دنیا کے مسلمانوں اور خصوصاً چین کے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی خاطر کوبے اور ٹوکیو میں چند مسجدیں بنادی ہیں جو درحقیقت مسجدیں نہیں کہلائی جاسکتیں کیونکہ قانوناً وہ جاپانی حکومت کی ملکیت ہیں، مسجد مسلمان عوام کی مشترکہ ملکیت ہوتی ہے۔ جب تک ایک غیر اسلامی حکومت کا قبضہ اس پر ہے اس کو مسجد نہیں کہا جاسکتا، جاپانیوں نے پروپیگنڈے کے ذریعہ چین کے مسلمانوں کو اپنی طرف کرنے کی بہت کوشش کی اور کر رہے ہیں مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی چین کے مسلمان صحیح معنی میں قوم پرست ہیں اور اپنے ملک کے ساتھ غداری کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

کل اور آج:

جاپان کی عجیب وغریب خصوصیات کا ثبوت پوری طرح سے ٹوکیو میں ملتا ہے، قدامت پرستی اور جدت پسندی، 'یاسوکوئی شنجا' جیسی زیارت گاہیں توہم پرستی کا سبق دیتی ہیں اور ہزاروں سال پرانی رسموں اور عقیدوں کو زندہ رکھتی ہیں، وہاں سے باہر نکل کر ٹوکیو کے بازاروں میں گھومو تو معلوم ہوتا ہے یورپ یا امریکہ کا ایک ٹکڑا ہے، زمیں دوز ریلیں، ٹرام، موٹریں، آسمان میں منڈلاتے ہوئے ہوائی جہاز، تقریباً ہر شخص مغربی لباس میں، عظیم الشان عمارتیں، مغربی انداز کی زبردست دکانیں، ہوٹل اور ریستوران، بینک اور سینما اور پھر بازاروں سے ہو کر کسی جاپانی کے مکان میں جائیے تو بالکل مختلف ماحول، چٹائیاں اور نیچی نیچی تپائیاں، نہ میز نہ کرسی، باہر سے آکر سب جاپانی مغربی لباس اتار کر اپنا کمونو پہن لیتے ہیں۔ دکانوں، بسوں، ٹراموں، بینکوں، ہوٹلوں میں نوجوان لڑکیاں فراک پہنے کام کرتی ہیں، مگر جاپانی گھرانوں میں عورت کی حیثیت وہی ہے جو اب سے چار صدی پہلے تھی۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مغربی اور مشرقی معاشرت کا مجموعہ جاپان کا زبردست کارنامہ ہے، ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر جاپان نے یورپ کی تقلید میں ریلیں، تار گھر ہوائی جہاز تو بنا لیے مگر اپنی قدیم توہم پرستی نہ چھوڑی۔ عورتوں اور کسانوں کو سیاسی آزادی نہ دی، جمہوریت، اشتراکیت اور ذہنی آزادی بیسویں صدی کی نمایاں خصوصیات ہیں، مگر جاپان میں ان کی نشوونما ممنوع ہے۔ جاپان کے سرمایہ داروں نے کارخانے کھول کر کروڑوں روپیہ جمع کر لیا ہے مگر مزدوروں کو اپنی انجمنیں بنانے کی اجازت نہیں ہے، چین پر قبضہ کرنے کی خاطر جاپان کے حکمرانوں نے ایک زبردست فوج تیار کر لی ہے، سائنس کی مدد سے جتنے مہلک ہتھیار یورپ میں تیار ہوئے ہیں، وہ فراہم کر لیے ہیں۔ جنگی جہاز، بم پھینکنے والے ہوائی جہاز، توپیں، مشین گنیں، بندوقیں، آبدوز کشتیاں، زہریلی گیس، ان سب چیزوں کو وہ چین میں استعمال کر رہے ہیں، مغرب سے موت اور ہلاکت کا نہ صرف یہ سامان جاپان نے حاصل کر لیا بلکہ فاشیست کے زہریلے جراثیم بھی۔ ساتھ ہی دقیانوسی توہمات سے فائدہ اٹھا کر مذہب کے نام پر انھوں نے عوام کو یقین دلا دیا کہ ان

کے ملک کی شان اسی میں ہے کہ چین پر قبضہ کرلیا جائے خواہ اس کوشش میں لاکھوں جانیں کیوں نہ ضائع ہو جائیں۔

معمہ:

ایک زمانہ تھا کہ جاپان کے لوگ آرٹ کے دلدادہ اور خوش نما چیزوں کے عاشق سمجھے جاتے تھے۔ جاپانی گھرانوں میں اب بھی پھولوں کو اس سلیقہ سے سجایا جاتا ہے کہ بے اختیار ان کے احساس حسن کی داد دینی پڑتی ہے۔ جاپانیوں کا اخلاق اور مہمان نوازی ضرب المثل ہیں، مگر یہی قوم آج چین میں وہ ظلم ڈھا رہی ہے جس کا بیان بھی دشوار ہے، سینکڑوں چینی شہر ویران پڑے ہوئے ہیں، ہزاروں چینی قتل ہو گئے، بے شمار زخمی ہیں، لاکھوں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے، ان گناہوں کا بار اسی قوم پر ہے جو اپنی نفاست مزاجی کے لیے مشہور ہے، چینی شہروں پر ان ہی ہاتھوں نے بم پھینک کر ہلاکت پھیلائی ہے جو پھولوں کی سجاوٹ کے لیے مشہور ہیں۔ یہ ہے جاپان کا معمہ، یہ ہے قوم پرستی کا خوفناک پہلو۔

اسی معمہ پر غور کرتا ہوا اور یہ امید کرتا ہوا کہ ہندوستان کی قوم پرستی کبھی اس حد تک نہ بڑھے میں یوکوہاما، کی بندرگاہ سے امریکہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

O

نئی دُنیا

(الف)

یوکو ہاما سے ہالی وُڈ!

ہنکاؤ وامارُو:

21 جولائی— ٹوکیو سے بیس میل کے فاصلہ پر جاپان کی سب سے بڑی بندرگاہ یوکو ہامہ ہے۔ یہاں سے میں جاپانی جہاز 'ہنکاؤ وامارُو' میں امریکہ کے لیے سوار ہوا۔ اچھا بڑا جہاز ہے، میں سیکنڈ کلاس میں سفر کر رہا ہوں جو کافی آرام دہ ہے، مسافر زیادہ نہیں۔ بہت سے کیبن خالی پڑے ہوئے ہیں، میں اپنے کیبن میں اکیلا ہوں اس لیے اپنے سامان کو جس طرح چاہوں پھیلا سکتا ہوں، تقریباً چار بجے جہاز روانہ ہوا اور آہستہ آہستہ بندرگاہ کی کھاڑیوں سے نکل کر کھلے سمندر کی طرف چلا، سورج غروب ہونے تک افق پر جاپان ایک میلے دھبے کی طرح نظر آنے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ دھبہ بھی نظر سے اوجھل، ہوگیا اب ہم بحر الکاہل PACIFIC OCEAN میں ہیں اور ہر لحہ نئی دنیا یعنی امریکہ کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔

وندے ماترم:

20 جولائی—28 جولائی— ہر جہاز پر کافی دلچسپ ہم سفر ملتے ہیں میرے قریب ہی ایک

کیبن میں سیالکوٹ کا ایک نوجوان تاجر ہے جو کھیل کا سامان اور کچھ ہندوستانی مصنوعات (مثلاً کشمیر کے نمدے اور ریشم کا سامان، مراد آبادی برتن) فروخت کرنے کی غرض سے دنیا کا سفر کر رہا ہے، آسٹریلیا نیوزی لینڈ، فلپائن اور جاپان کے بعد اب امریکہ جا رہا ہے، اس سفر میں اسے کافی کامیابی ہوئی ہے۔ اس سے باتیں کرنے سے معلوم ہوا کہ اگر ہندوستانی تاجر اور کارخانہ دار ہمت اور دوراندیشی سے کام لیں تو دوسرے ممالک میں ہندوستانی مال کی کافی کھپت ہو سکتی ہے۔ اس نوجوان کے پاس ایک گراموفون اور ہندوستانی گانوں کے کئی ریکارڈ ہیں جن کو ہم دن بھر بجایا کرتے ہیں، دوسرے ہم سفر بھی اب سہگل، کے سی ڈے، کانن بالا، اوما شاشی موتی لال، سیتا دیوی، دیویکا رانی اور رتنا پربھا کی آواز سے مانوس ہو گئے ہیں، میں اپنے ساتھ 'وندے ماترم' کے قومی ترانے کا ایک ریکارڈ لے کر چلا ہوں۔ ایک دن سیلون میں جہاں سب مسافر جمع تھے، میں نے یہ ریکارڈ لگا دیا چند انگریزوں کو بہت پسند آیا مگر جب میں نے بتایا کہ اس گانے کی کیا اہمیت ہے تو وہ کافی کھسیانے ہوئے۔

صاحب لوگ:

یہ انگریز شنگھائی میں پولیس افسر ہیں، چھٹی لے کر امریکہ ہوتے ہوئے انگلستان جا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ چند کینیڈین ہیں اور یہ بھی شنگھائی کی پولیس میں ملازم ہیں۔ ان لوگوں کا ایک علیحدہ گروہ ہے۔ دوسرے مسافروں سے بہت کم بات کرتے ہیں۔ دن رات یا تاش کھیلتے ہیں یا سراغ رسانی کے ناول پڑھتے ہیں۔ حالانکہ کئی سال شنگھائی میں رہ چکے ہیں، مگر چین کے موجودہ حالات سے نہ ہمدردی ہے اور نہ کوئی دلچسپی۔

دو دلیر امریکن:

برخلاف اس گروہ کے چند امریکن جو چین سے آ رہے ہیں اپنی قوم پرستوں سے بہت ہمدردی رکھتے ہیں۔ ایک موٹروں کے تاجر نے (جو چین میں دس سال رہا ہے) مجھ سے کہا کہ جاپان کبھی چین پر قبضہ نہ کر سکے گا کیونکہ اب چینی متفق اور متحد ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا خیال ہے کہ چین کا رقبہ اتنا بڑا ہے کہ باوجود اتنی زبردست فوجی طاقت کے جاپان اس ملک پر کبھی حکومت نہیں کر سکتا۔

ہم سفر امریکنوں میں سب سے دل چسپ دو نو جوان طالب علم ہیں، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ یہ دونوں ایک سال ہوئے چھ اور امریکن طالب علموں کے ساتھ چین کی لنگنام یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے گئے تھے۔ (اس علمی تبادلہ کی اسکیم کے ماتحت لنگنام یونی ورسٹی کے آٹھ چینی طالب علم امریکن یونی ورسٹیوں میں تعلیم کے لیے بھیجے گئے تھے) جنگ شروع ہونے پر باقی چھ امریکن تو واپس چلے گئے، مگر ان دونوں نے پورا سال لنگنام ہی میں گذارا اور اپنے چینی رفیقوں کے ساتھ جنگ کی مصیبتوں اور خطروں میں شریک رہے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ چینی نوجوانوں میں اپنے وطن کی حفاظت کے لیے کتنا جوش ہے اور کتنی دلیری سے وہ جاپانی حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ جس زمانے میں یہ دونوں وہاں تھے لنگنام پر کئی بار جاپانی ہوائی جہازوں نے بم برسائے مگر پھر بھی یونی ورسٹی کا کام برابر جاری رہا، چیانگ کائی شیک کا حکم ہے کہ جنگ کے دوران میں جہاں تک ممکن ہو کوئی کالج یا اسکول بند نہ ہو کیونکہ جس قدر زیادہ تعلیم چین میں پھیلے گی جاپان کی فتح اسی قدر مشکل ہو جائے گی۔

ان سب امریکنوں سے مل کر از حد خوشی ہوتی ہے، برخلاف انگریزوں کے جو اپنے آپ کو لیے دیے رہتے ہیں اور کبھی دوسری قوم کے لوگوں سے کھل مل کر بات نہیں کرتے امریکن فطرتاً خوش خلق اور بے تکلف واقع ہوئے ہیں۔

ایک نوجوان جاپانی:

ہمارے درجے میں ایک نوجوان جاپانی بھی ہے، جو تعلیم کی غرض سے امریکہ جا رہا ہے، اس سے باتیں کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ جاپانیوں میں بھی کس حد تک سامراج (شہنشاہیت پرستی) کا جذبہ ترقی کر گیا ہے۔ یہ لڑکا مجھ سے کہنے لگا۔ 'تم ہندوستانی ہم جاپانیوں کی فوجی مدد سے انگریزوں کو کیوں نہیں باہر نکال دیتے؟' میں نے جواب دیا'' اس لیے کہ کہیں انگریزوں کے بجائے تم لوگ نہ گلے پڑ جاؤ'' امریکن طالب علموں اور اس لڑکے میں برابر بحث ہوتی رہتی ہے۔ ایک دن لاجواب ہو کر اُسے کہنا پڑا'' میں مانتا ہوں کہ یہ جنگ نہ شروع ہوتی تو اچھا تھا، مگر اب جب کہ شروع ہوگئی ہے تو میرا فرض ہے کہ ہر طرح سے کوشش کروں کہ جاپان کی فتح ہو،

ورنہ ہماری قوم اور ہمارے شہنشاہ کی بڑی ہتک ہوگی۔'' میرا خیال ہے کہ زیادہ تر جاپانیوں کا جنگ کی بابت یہی عقیدہ ہے۔ وہ اس ہولناک قتل عام کو پسند نہیں کرتے۔ مگر بچپن سے ان کو اسکول اور مندر دونوں جگہ یہی تعلیم دی گئی ہے کہ ملک اور شہنشاہ کی عظمت کے لیے جو قربانی بھی کی جائے کم ہے۔

روسی تاجر:

دراصل یہ جنگ جاپانی قوم اور شہنشاہ کی عظمت کے لیے نہیں بلکہ جاپانی سرمایہ داروں کے منافع کے لیے لڑی جارہی ہے۔ ہمارے درجے میں ایک روسی تاجر ہے، انقلاب کے بعد یہ شخص اپنے ملک سے بھاگ کر منچوریا میں آبسا تھا۔ جہاں وہ کھالوں اور سَمّور کی تجارت کرتا تھا مگر (اس نے مجھے بتایا) جب سے جاپانیوں کا قبضہ منچوریا پر ہوا ہے، ہر قسم کی تجارت اور صنعت کا ٹھیکہ جاپانی سرمایہ داروں کو دے دیا گیا ہے۔ جو کروڑوں روپے کما رہے ہیں۔ غیر جاپانی دکانداروں کو مختلف ذرائع سے تنگ کر کے ملک چھوڑنے پر مجبور کیا جارہا ہے، یہ روسی تاجر بھی اسی لیے اب امریکہ میں قسمت آزمائی کرنے جارہا ہے۔ اگر اس شخص نے اپنے ملک کے انقلاب میں کسانوں اور مزدوروں کا ساتھ دیا ہوتا تو آج یوں مارا مارا نہ پھرتا۔

سردی:

جاپان سے روانہ ہونے کے اگلے دن ہی سے سردی سخت ہوگئی ہے۔ ہر کیبن میں گرم ہوا آنے کا انتظام ہے، اس لیے وہاں تو آرام رہتا ہے مگر جب ڈک پر آنا ہوتا ہے تو گرم کوٹ اور مفلر وغیرہ پہننا ہوتا ہے۔ ایسی سردی تو لاہور وغیرہ میں بھی نہیں ہوتی، جوں جوں ہم شمال کی طرف جارہے ہیں سردی بڑھتی جارہی ہے، سمندر پر چاروں طرف کہرا چھایا ہوا ہے۔ چند گز پر بھی کچھ نظر نہیں آتا، جہاز کی مہیب سیٹی بار بار سنائی دیتی ہے۔ سمندر میں کافی تلاطم ہے بعض لوگوں کو متلی کی شکایت ہوری ہے، شام کی چائے کے وقت تو کوئی کھانے کے کمرے میں آتا نہیں، اپنے اپنے کیبن میں سر لپیٹے پڑے رہتے ہیں۔

بڑی بی:

ہمارے درجے میں بس دو مسافر ہیں جن کو متلی کی شکایت نہیں ہوئی۔ اور جو ہر کھانے کے

وقت موجود رہتے ہیں، ایک میں اور ایک انگریز عیسائی مشنری عورت، کھانے کے وقت ہم مختلف میزوں پر بیٹھتے ہیں۔ مگر چائے کے لیے کوئی جگہ مقرر نہیں۔ ایک بڑی میز پر سب کے لیے سامان رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک شام کو میں چائے پینے جیسے ہی پہنچا۔ ان بڑی بی نے مجھ پر حملہ کیا۔ ''اے نوجوان!'' حضرت عیسیٰ کی اس پجارن نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے کبھی اپنی روح کو دوزخ کی آگ سے بچانے کی بابت بھی سوچا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''پیٹ کی آگ بجھانے سے فرصت ملے تو روح اور دوزخ کے متعلق سوچوں۔'' بڑی بی نے کیک کے ایک بڑے ٹکڑے کو منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ انسان کی روحانی بھوک روٹی کے ٹکڑوں سے نہیں بھر سکتی۔'' میں نے کہا۔ ''جی ہاں، روٹی کے علاوہ دوسری انسانی ضروریات بھی ہیں۔'' اس کے بعد مجھے عیسائیت کی فضیلت پر ایک لمبا لکچر سننا پڑا۔ میں نے کہا کہ عیسائی قوموں کی حرکتوں کو دیکھتے ہوئے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں ہٹلر اور مسولینی اور چیمبرلین سے بہتر عیسائی ہوں۔ بڑی بی بولیں ''سیاست کو اس بحث میں کیا دخل؟'' میں نے کہا ''کیوں نہیں۔ آپ کے ملک میں تو مذہبی کتابیں اور مذہب کے احکامات پارلیمنٹ کی رائے سے بدلے جاسکتے ہیں اور پادریوں کو سرکاری خزانے سے تنخواہیں ملتی ہیں۔'' غرض کسی طرح ان بڑی بی سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا۔ میں نے آخر کار متلی کا بہانہ کر کے گلو خلاصی پائی اور وہاں سے بھاگا۔ اگلے دن چار بجے، میں چائے کے لیے نہیں گیا تو جاپانی اسٹیوورڈ (ملازم) میرے کیبن میں مسکراتا ہوا آیا۔

''آج تم بھی لیٹ گئے؟'' اس نے کہا۔ ''کیا متلی ہو رہی ہے۔''

میں نے کہا ''نہیں، مگر یہ بتاؤ کہ تم میرے دوست ہو؟ میری جان بچاؤ گے؟''

''ہاں۔ ہاں۔ اس نے یقین دلایا'' کیا بات ہے؟''

''تو چپکے سے مجھے یہیں چائے دے جاؤ اور وہ مشنری عورت پوچھے تو کہہ دینا کہ میری حالت بہت خراب ہے، میں چائے پینے نہیں آؤں گا۔''

اڑتالیس گھنٹے کا دن:

آج 26 جولائی ہے، کل بھی 26 جولائی تھی، دوسرے الفاظ میں یہ دن اڑتالیس گھنٹے کا

ہوا۔ یہ کیوں؟ اس کو سمجھنے کے لیے آپ کو اسکول میں پڑھا ہوا جغرافیہ کا سبق پھر یاد کرنا پڑے گا۔ یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ مغرب سے مشرق کی طرف بحرالکاہل کو عبور کرنے میں ایک دن اس طرح مفت ملتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ عمر بھر افسوس کرتے رہتے ہیں کہ دن میں فقط چوبیس گھنٹے ہی کیوں ہوتے ہیں، ہر شخص کہتا ہے، کاش دن چوبیس گھنٹوں کے بجائے بتیس یا اڑتالیس گھنٹوں کا ہوتا۔ پھر ہمیں سب کام کرنے کا موقع ملتا۔ اطمینان سے لکھ پڑھ سکتے۔ دوستوں سے گپ کر سکتے، جی بھر کے سو سکتے۔ یہ بھاگ دوڑ اور عدیم الفرصتی جو بیسویں صدی کی زندگی کی مستقل لعنت ہے، اس سے چھٹکارا پاتے۔ مگر اس اڑتالیس گھنٹے کے دن کا تجربہ کم از کم میرے لیے تو بالکل ناکامیاب ثابت ہوا۔ 25 جولائی کو میں نے سوچا تھا کہ اگلا دن دو دونوں کے برابر ہوگا اس لیے خوب کام کروں گا۔ کئی مضمون ختم کروں گا۔ ایک کتاب پڑھ ڈالوں گا، کئی درجن خط لکھوں گا، اسی خوشی میں 25 تاریخ کو کچھ کام نہ کیا۔ دن بھر گپ شپ میں یا سو کر گذارا۔ تاش کا کھیل برج BRIDGE سیکھنے کی ناکام کوشش کی۔ جب پہلی چھبیس تاریخ کی صبح ہوئی تو کتنا اطمینان تھا۔ آج تو کوئی بھاگ دوڑ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔'' میں نے سوچا اور دن کا زیادہ تر حصہ ڈک پر کھڑے کھڑے گذارا۔ سمندر پر کہرا چھایا ہوا تھا۔ سردی بھی خوب تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ہوا سیدھی قطب شمالی سے آرہی ہے، مگر پھر بھی کیبن کی گھٹن سے تو بہتر تھا۔ سمندری پرندے SEA DULIS جہاز کے ساتھ ساتھ اڑ رہے تھے اور باورچی خانہ سے جو بچا ہوا کھانا وغیرہ سمندر میں پھینکا جاتا تھا اس پر فوراً جھپٹا مارتے تھے۔ ان میں سے کوئی ہمت کر کے جہاز کے مستول یا چمنی پر بھی بیٹھ جاتا تھا۔ شام کو چائے کے بعد کچھ دیر ڈک پر ٹینس کھیلتے رہے۔ یہ کھیل بجائے گیند اور بلّوں کے فقط سخت ربڑ کے ایک چھلے سے کھیلا جاتا ہے۔ بظاہر تو بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایک گھنٹے میں تھکان سے آدمی شل ہو جاتا ہے۔ اتنا تھکنے کے بعد کام کرنا تو ناممکن تھا۔ کھانا کھاتے ہی سو گیا۔ اطمینان تھا کہ اگلے دن پھر چھبیس تاریخ ہے، مگر اگلے دن پھر وہی قصہ رہا، صبح اٹھا تو اس احساس کے ساتھ کہ پچھلا دن بیکار گذار کر اتنا سنہری موقع گنوایا۔ کچھ دیر کتاب پڑھی اور دو تین خط لکھے پھر سو گیا۔ شام کو کہرا ذرا ہلکا ہو گیا۔ ڈک پر گھومنے کا لطف تھا۔ اس لیے کام کون کرتا ہے؟ اب

رات کے کھانے کے بعد یہ سطریں لکھنے بیٹھا ہوں مگر کھانا ڈٹ کر کھایا ہے۔ جہاز ہلکے ہلکے ہل رہا ہے۔ جیسے کوئی لوریاں دے کر سلا رہا ہو!............

کینیڈا:

31 جولائی— آج صبح اٹھتے ہی سب مسافر ڈک پر آ گئے۔ کیونکہ رات سے جہاز ساحل کے برابر برابر چل رہا ہے۔ یہ ہے کینیڈا، یہ ہے امریکہ، یہ ہے نئی دنیا، کہرا اب دور ہو گیا۔ گو سردی بدستور ہے۔ دور تک ساحل کو دیکھ سکتے ہیں۔ نہایت خوشگوار منظر ہے، سمندر کے کنارے نیچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ جو چیڑ کے درختوں سے لدی ہوئی ہیں۔ کینیڈین مسافر از حد خوش ہیں کہ ان کے وطن کی سرزمین نظر آ رہی ہے۔

شام کو جہاز کے کپتان نے سب مسافروں کو چائے کی دعوت دی۔ فرسٹ کلاس کے کھانے کے کمرے میں، اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام سفر میں اس جہاز میں ہمیں ہر قسم کا آرام ملا۔ جاپانی فوجیوں کے خلاف میرے جذبات جو بھی ہوں، جاپانی جہازوں کے انتظام کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

رات کو آٹھ بجے کے قریب جہاز ساحل سے میل بھر پر ٹھہر گیا۔ یہاں کینیڈا اور امریکن حکومتوں کے افسر موٹر کشتیوں میں آئے اور جہاز پر سوار ہو گئے، جہاز پھر روانہ ہو گیا۔ ہمارے پاسپورٹوں کی جانچ ہوئی۔ مجھے امریکہ میں داخل ہونے کی اجازت اس شرط پر ملی کہ میں تین مہینے سے زیادہ نہ ٹھہروں گا۔ امریکن حکومت نہیں چاہتی کہ دوسرے ملکوں کے لوگ ان کے ملک میں آ کر مستقل طور پر مقیم ہوں اور ان کی قومی دولت میں حصہ بٹائیں۔

وینکوور:

یکم اگست— دوپہر کے قریب ہم نے وینکوور کی بندرگاہ میں لنگر ڈالا۔ یہ کینیڈا کے مغربی ساحل پر اچھا بڑا شہر ہے۔ کینیڈا والے مسافر سب یہاں اتر گئے۔ نوجوان ہندوستانی تاجر بھی یہاں اتر گیا کیونکہ وہ پہلے کینیڈا کے تجارتی مقامات کا دورہ کرے گا۔ میں اور امریکن طالب علم دونوں شہر کی سیر کو گئے۔ تیرہ دن کے بعد زمین پر چلنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ جہاز کے انجنوں کی

مستقل آواز کانوں میں اب تک بسی ہوئی ہے اور شہر کی رونق اور بھیڑ اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ ڈاک خانے جا کر خط روانہ کیے کیونکہ اگر یہی خط اگلے دن سی ایٹل میں ڈالے جائیں گے تو ٹکٹ کا خرچا پڑے گا۔ کینیڈا اور ہندوستان دونوں سلطنت برطانیہ میں ہیں اور اس لیے ان کے درمیان ہوائی ڈاک رعایتی نرخوں پر جاتی ہے۔ برطانوی سلطنت میں ہونے کا یہ پہلا (اور آخری) فائدہ مجھے نظر آیا ہے۔

وینکوور اچھا بارونق شہر ہے۔ آبادی کوئی دو تین لاکھ ہوگی۔ اس کے آس پاس چیڑ کے جنگلات ہیں اور ان کی لکڑی اسی بندرگاہ سے باہر بھیجی جاتی ہے، وینکوور کی خوش حالی اور کاروبار کا دارومدار ان جنگلات ہی پر ہے، شہر میں بہت سے لوگ موٹے موٹے جوتے اور گنوارو کپڑے پہنے ہوئے بھی نظر آئے، یہ لوگ جنگلوں میں لکڑی چیرنے کا کام کرتے ہیں اور کبھی کبھی شہر کی سیر کرنے آتے ہیں۔ یہاں عام طور سے انگریزی بولی جاتی ہے۔ مگر کینیڈا کے بعض مشرقی حصوں میں فرانسیسی رائج ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ملک پہلے فرانسیسیوں کے قبضہ میں تھا۔ جن سے انگریزی فوجوں نے کیوبک کی تاریخی لڑائی میں جیتا تھا۔ فرانسیسی باشندوں کی اولاد کی زبان اور معاشرت اب بھی ایک حد تک فرانسیسی ہے اور ان میں اور انگریز نسل کے باشندوں میں اکثر معاملات پر اکثر اختلاف رہتا ہے۔ پھر بھی کسی نے یہ آج تک نہیں کہا کہ کینیڈا خود مختاری کے قابل نہیں ہے۔

سی ایٹل:

3 اگست — وینکوور سے شام کو روانہ ہو کر اگلے دن صبح سویرے ہمارا جہاز اپنی آخری بندرگاہ سی ایٹل پہنچ گیا۔ صبح جب آنکھ کھلی تو سامان اتارنے والی مشینوں کی گھڑ گھڑاہٹ سنائی دی۔ ناشتہ کے بعد جہاز سے اترے، ابھی اترنے کے لیے زینہ پر قدم ہی رکھا تھا کہ ایک اخبار کے رپورٹر سے ملاقات ہوئی پہلا امریکن جس سے امریکہ میں ملا کافی دلچسپ آدمی تھا۔ کوئی پچاس برس کی عمر تھی، دبلا پتلا اور کمزور مگر بلا کا پھرتیلا اور زندہ دل، جب اسے معلوم ہوا کہ میں بھی ایک اخبار نویس ہوں تو بڑا خوش ہوا۔ نیچے اتر کر کسٹم کے معائنہ میں میری بہت مدد کی۔ یہاں سب مسافروں کا سامان کھول کر ہر چیز کی جانچ کی گئی۔ میرے پاس بھلا کیا تھا جس پر محصول

لگتا۔ چند کپڑے، کتابیں، اخبار، ٹائپ رائٹر اور کیمرہ۔ کسٹم کے افسروں نے امریکن اور غیر امریکن کسی کی رعایت نہیں کی۔ ہر چیز نکال نکال کر دیکھی مگر نہایت تمیز اور خوش اخلاقی سے، بجائے رعب داب سے بات کرنے کے وہ سب مسافروں اور اخباروں کے رپورٹروں فوٹو گرافروں سے نہایت بے تکلفی سے ہنسی مذاق کرتے رہے۔ مجھے ان کا یہ طرز عمل بہت پسند آیا۔

چونکہ دونوں امریکن طالب علم اسی ٹرین سے سفر کر رہے ہیں جس سے میں اس لیے ہم تینوں ساتھ ہی بندرگاہ سے اسٹیشن آئے۔ یہاں سے میں نے اپنے دو سوٹ کیس بک کرا کر سیدھے نیویارک روانہ کر دیے۔ اور فقط ایک سوٹ کیس اور ٹائپ رائٹر اپنے ساتھ رہنے دیا تاکہ سفر میں خود اٹھا سکوں، امریکہ میں مزدوری مہنگی ہے، ریل میں سامان رکھنے کے لیے حمال کو کم از کم 25 سینٹ (یعنی تقریباً دس آنہ) دینا پڑتے ہیں اس لیے میں نے طے کیا کہ میں خود ہی اپنا سامان اٹھاؤں گا۔

امریکن ایکسپریس کمپنی کے دفتر جانے کے لیے پھر شہر گیا، سی ایٹل امریکہ کے شہروں میں ایک معمولی شہر ہے، مگر ایک ہندوستانی کے لیے تو یہ بھی کافی شاندار معلوم ہوتا ہے۔ دس بارہ منزلوں تک کی عمارتیں، موٹروں کی کثرت، قیمتی سامان سے بھری ہوئی دکانیں یہ دنیا کا سب سے زیادہ امیر ملک ہے۔ مگر اس سرمایہ داری نظام میں غربت ہر جگہ ہے۔ سی ایٹل میں بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ وہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بعض دیا سلائی کی ڈبیاں یا جوتوں کے فیتے بیچ کر بھیک مانگ رہے تھے، اسٹیشن کے قریب ہی پچھلی جنگ میں زخمی ہوئے دو سپاہی بیساکھیوں کے سہارے کھڑے زبان حال سے بھیک مانگ رہے تھے۔ مگر میں تو حسن اور جمال کے مرکز ہالی ووڈ جا رہا ہوں، مجھے اپاہج فقیروں سے کیا غرض؟ ہالی ووڈ کے خواب دیکھتا ہوا میں سہ پہر کی ٹرین سے لاس اینجلز کی طرف روانہ ہو گیا۔

ملک خدا تنگ نیست:

سی ایٹل امریکہ کے شمال مشرقی ساحل پر ہے، یہاں سے لاس اینجلز تک جو جنوب مشرقی ساحل پر ہے، 40 گھنٹے کا راستہ ہے، جیسے کراچی سے رنگون۔ لاس اینجلز سے میں تمام ملک کو پار کر کے

نیویارک جاؤں گا جو مشرقی ساحل پر ہے، یہ راستہ ریل سے ساڑھے چار دن کا ہے جیسے کولمبو سے کابل، اس سے ریاستہائے متحدہ امریکہ UNITED STATE OF AMERICA کے رقبہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

سی ایٹل سے روانہ ہوتے وقت میں نے دیکھا کہ ریل کے ہر انجن پر ایک بڑی گھنٹی لگی رہتی ہے، جب ریل چلتی ہے تو یہ گھنٹی بجتی رہتی ہے، یہ اس زمانے کی یادگار ہے جب گایوں اور بھیڑوں کے گلے تمام ملک میں گھوما کرتے تھے اوران کو ریل کی لائن سے ہٹانے کے لیے اس گھنٹی کی ضرورت ہوتی تھی، اب یہ گلے یوں ہی واہی تباہی نہیں پھرتے بلکہ (ریل کی کھڑکی سے میں نے دیکھا) میلوں لمبے چوڑے باڑوں میں رکھے جاتے ہیں، جہاں گھوڑے سوار رکھوالے ان کی حفاظت کرتے ہیں، یہ گلوں کے رکھوالے COW BOYS دنیا بھر میں اپنی بہادری اور شہسواری کے لیے مشہور ہیں اور ان کے متعلق ہزاروں فلم بنائے گئے ہیں جو ہندوستان کے قصبوں تک میں مقبول ہیں۔

سی ایٹل سے لاس اینجلز تک میں نے دیکھا کہ یہ ملک قدرتی دولت سے کس قدر مالا مال ہے، چیڑ اور دوسرے درختوں کے جنگل، غلوں کے کھیت، لاکھوں مویشی، معدنیات کی کانیں، پانی سے بجلی پیدا کرنے کے بڑے بڑے کارخانے، غرض کیا نہیں ہے؟ سینکڑوں میل تک قابل کاشت زمین بیکار پڑی ہے، بعض اوقات سو سو میل تک ایک جھونپڑا بھی نظر نہیں آتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسو سال میں امریکنوں نے اپنے ملک کو صنعتی اور اقتصادی اعتبار سے کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ مگر اب بھی یہاں کروڑوں کی آبادی کی گنجائش ہے۔ پھر بھی انھوں نے ایسے قانون بنا رکھے ہیں جن کی وجہ سے کوئی غیر ملکی یہاں آکر آباد ہو ہی نہیں سکتا، یہ سوچ کر کہ یورپ کے چھوٹے چھوٹے ملکوں میں آبادی کی زیادتی کی وجہ سے ہر روز جنگ اور انقلاب کا خدشہ رہتا ہے اوران کے پاس اپنی زائد آبادی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، یہ سوچ کر لاکھوں یہودی جو جرمنی اور آسٹریا سے نکال دیے گئے ہیں، در بدر مارے مارے پھر رہے ہیں...... یہ سب سوچ کر امریکن حکومت کی تنگ نظری پر افسوس ہوتا ہے۔

مگر اس میں حکومت کا بھی اتنا قصور نہیں ہے جتنا سرمایہ داری کے نظام کا ہے۔ امریکہ میں

اتنا غلّہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ آبادی دگنی بھی ہو جائے تب بھی کافی ہوسکتا ہے لیکن غلّے کی تجارت جن سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے، وہ غلّے کا نرخ گرانے کے بجائے لاکھوں من گیہوں اور مکئی اور کافی ریل کے اور کارخانوں کے انجنوں میں ایندھن کے طور پر جلاتے ہیں تا کہ بازار بھاؤ چڑھا رہے۔ کیلی فورنیا کے صوبے میں لاکھوں من پھل پیدا ہوتے ہیں، مالک پیداوار کا کافی حصہ زمین پر پڑا پڑا سڑنے دیتے ہیں، مگر اپنے منافع کی خاطر بھاؤ کم نہیں کرتے، غضب خدا کا کہ اس ملک میں جہاں دنیا بھر سے زیادہ سنترے پیدا ہوتے ہیں ایک سنترے کی قیمت پانچ آنہ ہے، کوئی تعجب نہیں کہ باوجود قدرت کی فیاضی کے امریکہ جیسے امیر ملک میں بھی ہزاروں آدمی بھوکے مرتے ہیں اور بیکار ہیں، حکومت اپنے بیکاروں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر فیصلہ کر دیتی ہے کہ غیر ملکیوں کا داخلہ بند کر دیا جائے مگر افلاس اور بیکاری کی جڑ کو نہیں کاٹتی۔

میری سات بیویاں:

ہمارے ریل کے درجے میں جتنے بھی امریکن مرد اور عورت ہیں سب مجھ سے بہت اخلاق اور تپاک سے پیش آتے ہیں، میں دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ انگریزوں کی بہ نسبت کتنے زیادہ ہنس مکھ اور دلچسپ ہیں، بالکل جیسے ہندوستان میں ریل کے مسافر ایک دوسرے سے فوراً گھل مل جاتے ہیں یہاں بھی اسی طرح بے تکلفی برتتے ہیں، مجھے ایک ہندوستانی سمجھ کر سب تعجب سے دیکھتے ہیں کیونکہ ان میں سے اکثر نے کبھی ہندوستانی کو نہیں دیکھا۔ ایک آٹھ دس سال کا لڑکا جو میرے قریب ہی بیٹھا ہے بہت تیز ہے، دن بھر سوال پوچھتا ہے۔

''تم کہاں سے آئے ہو؟''

''ہندوستان سے۔''

''کیا تم مہاراجا ہو؟''

''نہیں۔''

''پھر کیا تم سوامی ہو؟''

''نہیں میں تو اخبار نویس ہوں۔''

''اچھا تو تمھارے ملک میں اخبار بھی ہوتے ہیں؟''

''ہاں نہ صرف اخبار بلکہ ہر چیز ریل، موٹر، تار، ٹیلی فون، ریڈیو۔''

''کیا تم ہاتھی پر چڑھتے ہو؟''

''نہیں ٹرام پر۔''

''اور تمہاری کتنی بیویاں ہیں؟''

''ایک بھی نہیں۔ ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔''

''عجیب بات ہے، میں تو سمجھتا تھا کہ بارہ برس کی عمر میں سب ہندوستانیوں کی شادی ہو جاتی ہے اور ان کی سات سات بیویاں ہوتی ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ کہ.....'' اس لڑکے سے باتیں کر کے معلوم ہوا کہ ہندوستانیوں کے متعلق دوسرے ملکوں میں کتنی غلط فہمیاں ہیں، عام طور سے لوگ ہمیں نیم مہذب اور وحشی سمجھتے ہیں۔ جو تھوڑے بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں اور ہندوستان کے مذاہب اور فلسفے کی قدر کرتے ہیں وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص ایک مہاراجا یا سوامی ہے۔ کوئی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ ہم اُن کی ہی طرح سے معمولی انسان ہیں۔ نہ بہت اچھے نہ بہت برے، نہ سب وحشی ہیں نہ سب روحانی پیشوا۔

میں نے اس لڑکے سے پوچھا کہ آخر اس کو ہندوستان کے متعلق یہ سب معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں۔ اس نے کہا' مدر انڈیا' جیسی اور فلم ''ڈرم'' جیسے ہمارے حکمرانوں نے اچھا انتظام کر رکھا ہے کہ ہم غلاموں کے ساتھ دنیا کی ہمدردی بھی نہ ہو۔

دیوالہ:

سی ایٹل سے روانہ ہونے کے اگلے دن میرے امریکن دوست تو اپنے شہر میں اتر گئے، یوکوہاما سے یہاں تک ساتھ سفر کرنے کے بعد ہم لوگ اتنے بے تکلف ہو گئے تھے جیسے سالوں کی دوستی ہو، ٹوم بولسٹر اور ایلن بوتھ دونوں نوجوان امریکہ کے بہترین نمائندے ہیں اور ان سے میں نے امریکہ کے سیاسی اور معاشرتی مسائل کے متعلق بہت کچھ سیکھا، ویسے بھی ان کے ساتھ ہونے سے اب تک میں نے یہ نہ محسوس کیا تھا کہ میں اپنے وطن سے اتنی دور ایک اجنبی ملک میں

سفر کر رہا ہوں۔ ان کے اترنے کے بعد چند گھنٹے تک طبیعت گھبرائی، مگر 'سفر ہے شرط' مسافر نواز بتیرے' دوسرے ہمدرد مسافروں سے باتوں میں لگ کر وقت دلچسپی سے کٹتا رہا۔ (چند ماہ بعد ٹوم اور امین خط سے یہ معلوم کر کے نہایت خوشی ہوئی کہ ان کی شادی ہو گئی ہے۔)

دوپہر کو میں کھانے کے درجے DINNING CAR میں گیا اور کفایت شعاری کے خیال سے فقط ایک کٹلس پر اکتفا کی بل آیا تو قیمت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ایک ڈالر یعنی تقریباً تین روپے امریکہ اور ہندوستان کے اقتصادی معیار میں اگر یہی نسبت ہے تو میرا بہت جلد دیوالہ نکل جائے گا۔

لاس اینجلز:

3 اگست — آج صبح سے ریل مقابلتاً آباد علاقہ سے گزر رہی ہے مگر یہ زمین اتنی سرسبز نہیں ہے بلکہ راجپوتانہ کی طرح سے بنجر اور ریتیلی ہے۔ ریل کی لائن کے کنارے کنارے موٹر کی بہت اچھی سڑک ہے۔ جس پر ہر دس دس پندرہ پندرہ میل کے فاصلہ سے پٹرول اسٹیشن اور ہوٹل وغیرہ بنے ہوئے ہیں، دس بجے کے قریب ہم لاس اینجلز کے گرد ونواح میں آ گئے، اب ریل کے دونوں طرف سنتروں اور لیمون کے باغ ہیں، جو میلوں تک چلے گئے ہیں، کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے سفید بنگلے بھی نظر آتے ہیں بارہ بجے لاس اینجلز کے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔

اسٹیشن سے میں ٹیکسی کر کے یہاں وائی۔ایم۔سی۔اے Y.M.C.A آ گیا ہوں اور آٹھویں منزل پر ایک مختصر سا کمرہ ایک ڈالر روزانہ پر لے لیا ہے۔ لاس اینجلز امریکہ کے سب سے بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔ ہالی ووڈ قریب ہونے سے اس کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ عمارتیں بیس بیس منزل تک کی ہیں، تقریباً ہر شخص کے پاس موٹر نظر آتی ہے، میرے کمرے کی کھڑکی سے تین بڑی عمارتیں نظر آتی ہیں ایک گرجا ہے جس پر بجلی کے الفاظ میں لکھا ہے CHRIST AAVES (حضرت عیسیٰ نجات دہندہ ہیں) اس کے قریب ہی ایک سنیما ہے جس پر لال اور نیلی روشنی کے الفاظ میں ایک فلم کا اشتہار ہے اور ان دونوں عمارتوں سے بہت بڑی ایک تیسری عمارت ہے۔ یہ ایک بینک ہے، اقبال مرحوم نے سچ کہا ہے

گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات!

ہالی ڈوڈ:

ہالی ووڈ کا نام کس نے نہیں سنا؟ یہ دنیا کا سب سے بڑا فلمی مرکز ہے، یہاں کے بنائے ہوئے فلم تمام دنیا کے لاکھوں سنیماؤں میں دکھائے جاتے ہیں، یہاں دنیا کی حسین ترین عورتیں رہتی ہیں، یہاں فلم اسٹاروں کو امریکہ کے پریسی ڈینٹ اور ہندوستان کے وائسرائے سے زیادہ تنخواہیں ملتی ہیں۔ ہندوستان یا چین انگلستان یا ڈنمارک، ایران یا آسٹریلیا، ہر ملک میں ہالی ووڈ کے شیدائی ملیں گے۔

ہالی ووڈ کیا ہے، یہی معلوم کرنے تو میں یہاں آیا ہوں۔ مگر سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہالی ووڈ کیا نہیں ہے

ہالی ووڈ ایک شہر نہیں ہے، امریکہ کے نقشے میں اس نام کا کوئی قصبہ بھی نہیں ہے، نہ اس نام کا کوئی ڈاکخانہ ہے، نہ ریلوے اسٹیشن، اگر لاس انجلز سے ٹیکسی میں سوار ہو کر ڈرائیور سے کہیں، ''ہالی ووڈ'' چلو تو وہ آپ کے منہ کو تکے گا۔ پھر ہالی ووڈ کہاں ہے اور کیا ہے؟

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہالی ووڈ لاس انجلز شہر کے گرد و نواح میں ہے، مگر پھر بھی یقین کے ساتھ کسی ایک مقام کو یہ نام نہیں دیا جا سکتا۔

آیئے پھر ہالی ووڈ کی تاریخ کا مطالعہ کریں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ گو آج اس نام کا کوئی شہر نہیں ہے، مگر اب سے پچاس سال پہلے لاس انجلز سے پانچ سات میل پر ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، جس کا نام ہالی ووڈ تھا۔ اسی زمانے میں سنیما کی ایجاد ہوئی تھی۔ امریکہ کے مغربی ساحل پر سال کے بارہ مہینے خوشگوار موسم رہتا ہے اور سورج ہمیشہ نکلا رہتا ہے، اس زمانے میں فلم ہمیشہ کھلے میدان میں سورج کی روشنی میں بنائے جاتے تھے، اسٹوڈیو اور بجلی کے 'مصنوعی سورج' ابھی تک ایجاد نہ ہوئے تھے، اس لیے فلم بنانے والے سب مغربی ساحل پر چلے آئے، لاس انجلز ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس کے آس پاس زمین سستی تھی۔ سنیما نے اپنا ڈیرہ یہیں ڈال دیا۔

لاس انجلز کے قریب چند ہزار کی آبادی کا قصبہ ہالی ووڈ تھا۔ اس وقت اس کی اپنی میونسپلٹی تھی مگر کوئی چالیس سال ہوئے اس میونسپلٹی کو لاس انجلز کے ساتھ ملا دیا گیا اور ہالی ووڈ کا نام

سرکاری نقشوں پر سے غائب ہوگیا تھا اور اب بھی جب مختلف اسٹوڈیو ایک دوسرے سے پندرہ پندرہ بیس بیس میل کے فاصلہ پر واقع ہیں وہ سب ہالی ووڈ میں واقع سمجھے جاتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اب سے چالیس پچاس سال پہلے ہالی ووڈ کا قصبہ اپنی آبادی کی مذہبیت کی وجہ سے مشہور تھا۔ پنشن یافتہ سرکاری افسر' شرفا' اور چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار یہاں آباد تھے، سب اتوار کو گرجا جانے والے عزت اور' آبرو' کے ٹھیکہ دار اور تمام جدتوں کے سخت مخالف۔ جب انھوں نے دیکھا کہ سنیما کمپنیوں کے ایکٹر اور ایکٹرسیں ان کے قصبے میں آکر رہنے لگے ہیں تو انھوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ ریزولیشن پاس کیے، سنیما والوں کا 'حقہ پانی' بند کیا اور ان کو مکان کرایہ پر دینے سے انکار کرتے رہے، وہ سنیما کو شیطان کا دھندا سمجھتے تھے۔ ایک بڑے میاں نے اپنے مکان کے پاس کسی کمپنی کے ایکٹروں کو فلم بناتے ہوئے جو دیکھا تو اتنے بگڑے کہ بندوق لاکر فائر کر دیا۔ خیریت ہوئی کہ کوئی مرا نہیں، مگر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ہالی ووڈ والے اس زمانے میں سنیما کے کتنے مخالف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب ہالی ووڈ کے بنے ہوئے فلم دنیا بھر کے شہروں میں دکھائے جانے لگے تب بھی خود اس شہر میں کوئی سنیما نہ تھا۔ مگر اقتصادی حالات مذہبی عقیدوں اور سماجی تعصب سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوئے۔ دس پندرہ سال ہی میں سنیما نے ہالی ووڈ کی دنیا بدل دی۔ فلموں کی مقبولیت جوں جوں بڑھتی گئی، ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تنخواہیں بڑھیں اور امیر آدمیوں کے لیے کس گھر کے دروازے بند رہ سکتے ہیں، ہالی ووڈ کے باشندوں نے فلم کمپنیوں کے ہاتھوں اپنی زمینیں منہ مانگے داموں پر بیچیں، اپنے مکان بڑی بڑی قیمتوں پر ایکٹروں کو بیچے یا کرائے پر دیے اور بہت جلد یہ مختصر سا قصبہ ایک خوشحال شہر بن گیا۔ آبادی اتنی بڑھ گئی کہ ایک طرف ہالی ووڈ بڑھتے بڑھتے لاس انجلز کے شہر سے مل گیا اور دوسری طرف دور تک ریگستان میں اسٹوڈیو اور ریگستان بنتے چلے گئے، آج جب کہ فلمی صنعت نے اتنی ترقی کر لی ہے اور دنیا کے ہر کونے سے روپیہ کھنچ کر ہالی ووڈ کی طرف آرہا ہے، اس مقام نے بین الاقوامی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ آج ہالی ووڈ کسی شہر یا قصبہ یا مقام کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ماحول کا نام ہے۔ جس کے ساتھ سینکڑوں رومان انگیز روایات وابستہ ہیں۔

جادو خانے:

ایک ہفتہ کے قیام میں میں نے ہالی ووڈ کی کئی کمپنیوں کے اسٹوڈیو دیکھے جن میں وارنر براورس WARNER BROTHERS اور آر۔ کے۔ او۔ ریڈیو R.K.O.RADIO خاص طور سے قابل ذکر ہیں، وارنر برادرس شاید تمام ہالی ووڈ میں سب سے بڑی کمپنی ہے، یہاں سال بھر میں دو سو سے زائد فلم تیار ہوتے ہیں، یعنی ایک کمپنی اتنے فلم بناتی ہے جتنے ہندوستان کی تمام کمپنیاں مل کر بھی سال بھر میں نہیں بناتیں۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہالی ووڈ کی فلم کمپنیاں ہماری کمپنیوں سے کتنی زیادہ ترقی یافتہ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہالی ووڈ کے فلم نہ صرف امریکہ کے ہزاروں سنیماؤں میں دکھائے جاتے ہیں بلکہ دنیا کے تقریباً ہر ملک میں بھیجے جاتے ہیں۔ ہندوستان ہی سے تقریباً ایک کروڑ روپیہ ہر سال ہالی ووڈ آتا ہے، ایک فلم پر ایک دو کروڑ کی آمدنی ہالی ووڈ میں معمولی بات ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کے بہترین اداکاروں، ڈائریکٹروں، فوٹو گرافروں، کہانی لکھنے والوں اور مکالمہ نویسوں کو ملازم رکھ سکتے ہیں۔ بہترین کیمرے اور مشینیں استعمال کر سکتے ہیں، دنیا کے تمام اخباروں میں اشتہار دے سکتے ہیں، کوئی تعجب نہیں کہ ان کے فلم ہمارے فلموں سے بہتر ہوتے ہیں، برخلاف اس کے ہندوستانی فلم فقط ہندوستان کے ہزار بارہ سو سنیماؤں ہی میں دکھائے جا سکتے ہیں، سنیما کے ٹکٹوں کی قیمت بھی ہندوستان جیسے غریب ملک میں بہت کم ہے، ایک فلم پر زیادہ سے زیادہ آمدنی دو تین لاکھ ہو سکتی ہے، حالانکہ معمولی فلموں پر تو ایک لاکھ بنانا بھی مشکل ہوتا ہے، ایسی حالت میں کمال تو یہ ہے کہ اچھے یا برے ہم سوڈیڑھ سو فلم ہر سال بنا ہی لیتے ہیں۔

ہالی ووڈ کی کمپنیوں کے سرمائے اور غیر محدود وسائل کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے فلموں کے لیے ہر قسم کے مناظر چند گھنٹوں میں تیار کر سکتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے بغداد کا بازار، قدیم روم کا گرجا، موجودہ نیویارک کی ایک سڑک، پیرس کا ایفل ٹاور، آگرہ کا تاج محل یا بنارس کے گھاٹ۔ کیلو پٹرا کا محل، یا افریقہ کا جنگل، جس منظر کی ضرورت ہو وہ اسٹوڈیو کے اندر تیار ہو سکتا ہے، ایسی عمارتیں فقط فلمی ضرورت کے لیے کافی ہوتی ہیں، یعنی بس دیکھنے ہی دیکھنے کی

ہوتی ہیں، مثلاً آپ اسٹوڈیو میں گھومتے گھومتے دفعتاً ایک زبردست محل دیکھیں گے معلوم ہوگا صدیوں پرانا ہے، پتھر زمانے کی گردش سے گھس گئے ہیں وزنی مجسمے نصب ہیں۔لوہے یا تانبے کے دروازے، قیمتی پردے لٹکے ہوئے ہیں، لیکن اگر آپ ان دروازوں کو کھولیں گے تو پہلے آپ کو معلوم ہوگا کہ دروازے لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور ان پر ایسا رنگ کیا گیا ہے کہ لوہے کے معلوم ہوں، دوسرے یہ کہ دروازے کے پیچھے کچھ نہیں ہے فقط لکڑی کے شہتیر اور بلّیاں ہیں جن کے سہارے اس 'محل' کا ڈھانچہ کھڑا ہوا ہے۔

نہ صرف اسٹوڈیو میں اس قسم کی عمارتیں چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ چند روز میں تیار ہوسکتی ہیں بلکہ ہر قسم کے لباس، فرنیچر، برتن، ہتھیار، آلات موسیقی یہ چیزیں بھی ذخیرہ میں رہتی ہیں تاکہ بوقت ضرورت کام آئیں۔ یہ تو خیر معمولی باتیں ہیں، ہالی ووڈ کے انجینئروں اور فلمی 'جادوگروں' کا کمال تو دیکھنے میں آتا ہے جب کسی فلم کے لیے خاص قسم کے مناظر کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً سمندر کے طوفان میں ایک جہاز کو ڈوبنا ہے یا ایسی زبردست آندھی دکھانی ہے جس میں مکان اڑ گئے ہوں یا ایسا زلزلہ جس میں شہر کے شہر تباہ ہوگئے ہوں یا ہوائی جہازوں کی لڑائی، جب ان مناظر کو سنیما کے پردے پر دیکھتے ہیں تو خیال بھی نہیں گزرتا کہ یہ سب مصنوعی ہیں اور اسٹوڈیو میں بنائے گئے ہیں، یہ سب مناظر سنیما کی شعبدہ بازی کے کارنامے ہیں ان کی تیاری میں لاکھوں روپے خرچ ہوتے ہیں اور ہفتوں کی تیاری درکار ہوتی ہے اوران کو دیکھ کر پرانے جادوگروں کے کرتب بچوں کے کھیل معلوم ہوتے ہیں۔'

گنگادین:

میں نے ہالی ووڈ کی سیر میں ایک ہفتہ بڑی ہنسی خوشی سے کاٹا جن لوگوں سے بھی ملاوہ نہایت اخلاق سے پیش آئے، آر۔کے۔او۔ریڈیو R.K.O.RADIO کے اسٹوڈیو میں میری کافی آؤ بھگت ہوئی۔ اسٹوڈیو کا ہر شعبہ مجھے دکھایا گیا۔مگر یہ دیکھ کر مجھے نہایت تکلیف ہوئی کہ اس اسٹوڈیو میں ایک ایسا فلم بنایا جارہا ہے جس میں میری قوم کی تذلیل کی گئی ہے، اس فلم کا نام 'گنگادین' ہے، اس کی کہانی انگلستان کے مشہور شاعر رڈیارڈ کپلنگ کی ایک نظم پر مبنی ہے، رڈیارڈ کپلنگ

برطانوی شہنشاہیت کا زبردست مبلغ تھا۔ اس کی تمام کہانیوں اور نظموں کا منصد برطانوی حکومت کا پروپیگنڈا ہے۔ 'گنگا دین' ایک فوجی بھشتی کی 'کارگذاری' اور 'وفاداری' کا قصہ ہے۔ جس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح لڑاکو اور 'وحشی' ہندوستانی دغا بازی سے ایک انگریز پلٹن پر حملہ کرتے ہیں اور انگریز سپاہی کس دلیری اور شجاعت سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں، گنگا دین اس پلٹن کا بھشتی ہے۔ وہ اپنے انگریز آقاؤں کی خاطر اپنی جان دے کر پلٹن کو بچا لیتا ہے۔ اس کہانی کا مقصد ہندوستانیوں کو یہ سکھانا ہے کہ ان کو بھی گنگا دین کی طرح وفادار رہنا چاہیے اور تمام دنیا کو یہ جتانا ہے کہ سوائے گنگا دین جیسے چند وفادار ملازموں کے سب ہندوستانی ظالم اور وحشی ہوتے ہیں، میں نے چند ذرائع سے 'گنگا دین' فلم کا پورا منظر نامہ یا سینیر یو SCENARIO حاصل کر کے پڑھا۔ تمام فلم میں شاید ہی کوئی سین ایسا ہو جس میں کسی نہ کسی طرح ہندوستانیوں کی تذلیل نہ کی گئی ہو اور ہندوستانی زندگی کی اتنی غلط تصویر بھی میں نے نہیں دیکھی پٹھانوں کو دکھایا گیا ہے کہ وہ دھوتی باندھتے ہیں اور کالی کی پوجا کرتے ہیں، درۂ خیبر کے آس پاس ہاتھی گھومتے ہیں، مندروں میں قتل اور لوٹ کے لیے سازشیں ہوتی ہیں۔ غرض ہر طرح سے یہ فلم قابل ملامت ہے۔

آخر ہم ہندوستانیوں نے امریکنوں کا کیا بگاڑا ہے کہ وہ اس قسم کے فلم بنا کر تمام دنیا میں ہماری ذلت کرنا چاہتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ عام طور سے امریکن ہندوستانیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں مگر ہماری معاشرت ہمارے رسم و رواج اور سیاسی صورت حال سے بالکل ناواقف ہیں، جب کبھی ہالی ووڈ میں کوئی فلم ہندوستان کے متعلق بنتا ہے تو برطانوی حکومت کی طرف سے چند انگریز فوجی افسر مشورہ کے لیے بھیجے جاتے ہیں، چونکہ امریکن ڈائریکٹر وغیرہ ہندوستان سے بالکل ناواقف ہیں اس لیے وہ انگریز مشیروں کی رائے پر عمل کرتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہی ہے، برطانوی شہنشاہیت نہایت چالاکی سے ہالی ووڈ کے ذریعہ اپنا کام نکال رہی ہے۔

ایک غلام ملک کی یہ طاقت تو کہاں کہ ایسے فلموں کا بننا بند کرادے یا دوسرے ملکوں میں دکھانے نہ دے، مگر ہندوستان جا کر مجھے کوشش کرنی چاہیے کہ کم از کم ایسے ذلیل فلم کی نمائش ہندوستان میں نہ ہو (یہ فلم جب ہندوستان آیا تو تمام صوبوں کی حکومتوں نے اس کو پاس کرنے سے انکار کر دیا، سوائے بنگال کی حکومت کے)

ہندوستانی:

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستانی اپنے ملک سے نکلتے ہوئے گھبراتے ہیں، مگر کون سا ملک ہے جہاں ہندوستانی تارکِ وطن نہیں ملتے؟ امریکہ کے مغربی ساحل خصوصاً کیلی فورنیا کے صوبے میں سینکڑوں ہندوستانی آباد ہیں، ان میں سے زیادہ تر کھیتی باڑی کا کام کرتے ہیں، بعض نے تو پیسہ جمع کر کے زمین خرید لی ہے اور مستقل طور پر یہیں آباد ہوگئے ہیں، یہ لوگ اب سے بیس پچیس برس پہلے یہاں قسمت آزمائی کے لیے آئے تھے۔ اس زمانے میں امریکہ کی حکومت کی طرف سے غیر ملکیوں پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ مگر ان ہندوستانیوں نے یہ غلطی کی تھی کہ اپنے بال بچوں کو ہندوستان ہی میں چھوڑ کر آئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب نئے قانون کی رو سے غیر ملکیوں کا داخلہ بند کر دیا گیا تو یہ لوگ اپنے گھر والوں کو امریکہ نہ بلا سکے۔ بوڑھے ہو کر بہت سے تو ہندوستان واپس چلے گئے اور باقی بھی کبھی نہ کبھی واپس چلے آئیں گے۔ ان میں زیادہ تر بالکل ان پڑھ تھے۔ اس لیے امریکہ میں زبان اور معاشرت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے انھوں نے کافی تکلیفیں اٹھائیں اس لیے ان کی ہمت کی اور بھی داد دینی پڑتی ہے۔

ان کاشتکاروں کے علاوہ پڑھے لکھے ہندوستانیوں کی بھی تھوڑی سی تعداد یہاں ہے۔ یہ وہ خاندان ہیں جو تجارت کے لیے آئے تھے اور یہیں آباد ہوگئے، سین فرانسسکو میں ایک ہندوستانی لیڈی ڈاکٹر ہیں اور لاس اینجلز میں طالب علموں کے علاوہ چند ہندوستانی ہیں جو کبھی کبھی ہندوستانی یا مشرقی فلموں میں کام کر کے پیٹ پالتے ہیں۔

سید حسین:

لاس اینجلز میں سید حسین سے بھی ملا جو کسی زمانے میں ہمارے اخبار 'بمبئی کرانیکل' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور مشہور قوم پرست لیڈر تھے۔ کوئی پندرہ سال سے وہ امریکہ میں مقیم ہیں اور اپنے مضامین اور لیکچروں کی وجہ سے انھوں نے کافی نام پیدا کیا ہے۔ اب وہ لاس اینجلز کی یونی ورسٹی میں ہندوستانی تاریخ اور تمدن کے پروفیسر ہیں اور تعلیمی حلقوں میں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، پچھلے سال وہ چند ماہ کے دورہ کے لیے ہندوستان گئے تھے جب بمبئی میں میں اُن سے ملا تھا لاس اینجلز

میں میرے مختصر قیام کے دوران میں سید حسین سے مجھے کافی مدد ملی اور کئی دعوتیں کھانے میں آئیں۔

ایک اور ہندوستانی رام بگائی سے بھی اتفاقیہ ملاقات ہوئی اور نہایت مفید ثابت ہوئی، رام بگائی کے مرحوم والد تجارت کی غرض سے بیس سال پہلے پنجاب سے امریکہ آئے تھے، جب رام کی عمر بیس برس کی تھی، اب وہ اپنی والدہ کی ساتھ رہتا ہے اور یونیورسٹی میں فلم سازی کی تعلیم حاصل کررہا ہے، نہایت تیز اور ہمدردنوجوان ہے، ہر ہندوستانی مسافر کی از حد خاطر مدارات کرتا ہے اور کئی ہندوستانی اخباروں اور رسالوں کے لیے فلموں کے متعلق مضمون لکھتا ہے۔ بگائی اور اس کی والدہ نے پوری ہندوستانی مہمان نوازی برتی اور اصرار کیا کہ میں دونوں وقت کھانا ان کے ساتھ کھاؤں۔ کھانا اور ہندوستانی وضع کا پکا ہوا، بھلا کون انکار کرسکتا ہے۔

رام بگائی اور اس کے چند عزیزوں سے مل کر جو سین فران سسکو سے آئے ہوئے تھے، مجھے اندازہ ہوا کہ دوسرے ملکوں میں جو ہندوستانی پڑے ہوئے ہیں ان کو اپنے وطن اور ہم وطنوں سے کتنی محبت ہے۔

امریکہ کا گاندھی:

لاس اینجلز کے قریب ہی ایک مقام پاسا ڈینا ہے، جہاں میں دنیا کے مشہور سوشلسٹ مصنف اپٹن سنکلیر سے ملا۔ اپنی سادگی، رحم دلی اور خدمت خلق کے جذبے کے اعتبار سے وہ امریکہ کا مہاتما گاندھی کہلانے کا مستحق ہے، ادبی قابلیت تو اپٹن سنکلیر کی مانی ہوئی ہے، ساٹھ برس کی عمر میں پوری ساٹھ کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے ہر ایک میں (خواہ وہ ناول ہو، معاشیات پر کتاب ہو یا نظم) اس نے ظلم، جہالت، بے انصافی اور سرمایہ داری کے خلاف جہاد کیا ہے، یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں بکتی ہیں اور درجنوں زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ ہندوستان کی شاید ہی کوئی زبان ہو، جس میں اپٹن سنکلیر کی کتابیں شائع نہ ہوئی ہوں۔

عام امریکنوں کی طرح اپٹن سنکلیر ہندوستان کے حالات سے ناواقف نہیں ہے، کتابوں اور اخباروں کے ذریعہ اس نے ہر مسئلہ پر خود کو باخبر رکھا ہے، تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد اپٹن سنکلیر نے مجھ سے کہا، ''تم قومی کانگریس کے ممبر تو ضرور ہوں گے مگر یہ بتاؤ کہ گاندھی کے زیادہ قائل ہو

یا جواہر لال کے؟ اس کے بعد ہندوستان میں سوشلزم کے مستقبل کے متعلق دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔
تین گھنٹے کی یادگار گفتگو کے بعد جب میں رخصت ہوا تو سنکلیر نے مہربانی سے مجھے اپنی چند کتابیں تحفے میں دیں۔ ان کے بدلے میں مَیں نے جواہر لال کی اپنی لکھی ہوئی سوانح عمری نذر کی اور اس طرح دنیا کی دو مشہور ہستیوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرا دیا۔

ہالی ووڈ سے خطاب:

لاس انجلز سے روانہ ہونے سے قبل میں نے ہالی ووڈ کے مشہور ریڈیو اسٹیشن K.M.P.C سے ایک تقریر براڈ کاسٹ کی جو فلمی حلقوں میں کافی دلچسپی سے سنی گئی۔ اس تقریر میں ہالی ووڈ کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے بتایا کہ ہالی ووڈ کے فلم کس طرح شوق سے ہندوستان میں دیکھے جاتے ہیں، پھر میں نے ان فلمی ستاروں کو الگ الگ نام لے کر مخاطب کیا جو خاص طور سے ہندوستان میں مقبول ہیں، مثلاً پال مونی، گریٹا گاربو، شرلی ٹمپل، بیٹی ڈیوس وغیرہ، آخر میں میں نے سخت الفاظ میں شکایت کی کہ ہالی ووڈ میں جتنے فلم ہندوستان کے متعلق تیار ہوتے ہیں ان میں ہمارے ملک اور قوم کی تذلیل کی جاتی ہے۔
امریکہ میں ریڈیو اسٹیشن حکومت کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ مختلف پرائیویٹ کمپنیوں کے ہیں۔ ان کے پروگراموں میں آدھا وقت اشتہاروں کی نذر ہوتا ہے بیچ بیچ میں عام دلچسپی کے پروگرام (گانے، تقریریں، خبریں وغیرہ) رکھے جاتے ہیں ریڈیو پر اشتہار براڈ کاسٹ کرانا کافی مہنگا ہوتا ہے۔ پانچ منٹ کے لیے کئی کئی ہزار ڈالر دینا پڑتے ہیں۔ اسی روپے سے وہ اپنا خرچ نکالتے ہیں، حکومت سے کوئی واسطہ نہیں، امریکہ میں ریڈیو اس قدر مقبول ہے کہ خود لاس انجلز شہر میں (جس کی آبادی بمبئی کے برابر ہے) اٹھارہ ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ نیویارک میں پچیس تیس ہیں۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی ایک دو ریڈیو اسٹیشن ہیں۔
عام دلچسپی کے پروگراموں اور اشتہاروں کو عجیب طرح سے ملایا جاتا ہے مثلاً میری تقریر ختم ہوتے ہی اناؤنسر نے کہا ''ابھی ابھی آپ نے خواجہ احمد عباس کی تقریر سنی ہے، جو ہالی ووڈ کی سیر کو ہندوستان سے آئے ہیں، اگر آپ ہندوستان کا سفر کرنا چاہتے ہیں تو فلاں سفر ایجنسی سے

آپ کو سب ضروری اطلاعات مل سکتی ہیں اور ہاں اگر آپ کو ہندوستانی مصنوعات کے سامان سے دلچسپی ہے تو یہ آپ کو فلاں دوکان پر ملے گا............''

پیالہ میں تماشا:

لاس اینجلز کے آس پاس جو مشہور مقامات ہیں ان میں ایک تفریح گاہ جس کو HOLYWOOD BOWL (ہالی وڈ کا پیالہ) کہتے ہیں۔ 'پیالہ' کیوں؟ اس لیے کہ اس مقام پر کئی پہاڑیوں کے بیچ میں جو وادی ہے وہ بالکل پیالے کی شکل میں ہے۔ ان پہاڑیوں کی ڈھلوان پر پتھر کاٹ کاٹ کر سیڑھیاں بنائی گئی ہیں جن پر پچیس تیس ہزار آدمی بیٹھ سکتے ہیں، وادی کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑا اسٹیج بنایا گیا ہے جس پر ایک وقت میں کئی سو ACTOR کام کر سکتے ہیں، لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اسٹیج کی آوازیں وادی کے ہر ہر کونے تک پہنچائی جا سکتی ہیں، صاف موسم میں رات کو تماشہ ہوتا ہے، اسٹیج پر کوئی پردہ نہیں ہے، اس کے بجائے جب ڈرامے کا ایکٹ ختم ہو جاتا ہے تو اندھیرا کر دیا جاتا ہے اس 'پیالے' میں فقط بہترین ایکٹر اور گانے والے اسٹیج پر آ سکتے ہیں۔

رات کے آٹھ بجے تماشہ شروع ہوا، عجیب سماں تھا، اوپر آسمان پر جگمگاتے ہوئے تارے، ٹھنڈی ہوا۔ پہاڑیوں کی سیڑھیاں، تیس ہزار انسانوں سے پٹی ہوئی، فضا میں ہلکا ہلکا شور، جیسے کروڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں اور پھر یکا یک روشنیوں کا گل ہو جانا۔ مکمل اندھیرا، چاروں طرف خاموشی، جیسے تیس ہزار انسانوں نے سانس روک لیا ہو اور پھر دور، بہت دور...... وادی کے بیچ میں دفعتاً روشنی، سب کی نگاہیں ایک ہی روشن نقطے پر جمی ہوئی، موسیقی ایک جھنکار کے ساتھ فضا پر چھا گئی، تماشہ شروع ہو گیا۔

جس جگہ میں بیٹھا: واقع تھا وہاں سے اسٹیج کم از کم تین فرلانگ نیچے ہوگا۔ ایکٹر بالکل گڑیوں کی طرح نظر آتے تھے، مگر آواز لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اتنی صاف آتی تھی کہ مکالمے اور گانے لفظ بلفظ سنے جا سکتے تھے، اپنی عمر میں بہت سے تماشے دیکھے، مگر ایسا حیرت انگیز اور دلفریب تماشہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

ہالی ووڈ کے دو رُخ:

1- ہالی وڈ کی داستان بہت لمبی ہوتی جا رہی ہے قصہ مختصر یہ کہ جہاں لاکھوں روپے ماہوار

تنخواہ پانے والے فلمی ستارے اور ان کے شاندار مکان دیکھے، وہاں وہ تنگ اور تاریک مکان بھی دیکھے، جہاں فلمی شہرت کے طلب گار اس امید میں رہتے ہیں کہ چھوٹے پارٹ کرتے کرتے وہ بھی کسی دن گریٹا گاربو اور جون کرافورڈ کی طرح مشہور اور امیر ہو جائیں گے۔

2- جہاں اسٹوڈیوز میں صنعت اور سائنس کے حیرت انگریز کارنامے دیکھے اور قابل ڈائریکٹروں، اداکاروں اور لکھنے والوں سے ملا، وہاں یہ بھی دیکھا کہ کس طرح کروڑوں روپیہ اس صنعت میں بیکار صرف ہوتا ہے، کس طرح نا قابل اداکاروں کو پبلسٹی اور اشتہار بازی کے زور سے مقبول بنایا جاتا ہے۔ کس طرح خودغرض فلم ساز اپنی ذاتی پسند اور ناپسندیدگی پر قابلیت اور لیاقت کو قربان کرتے ہیں۔

3- جہاں ایسے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھا جو عیش و عشرت میں زندگی کھوتے ہیں، وہاں ان کو بھی دیکھا جو مذاق سلیم اور دل میں درد رکھتے ہیں، شہرت کے آسمان پر پہنچنے کے بعد بھی اپنے دماغوں کا توازن قائم رکھتے ہیں اور دنیا سے ہمیشہ کے لیے مفلسی، بیماری اور بے انصافی دور کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، اسپین اور چین کے لیے چندہ جمع کرتے ہیں، بیکاروں کی خاطر تماشے کر کے روپیہ جمع کرتے ہیں، اسٹوڈیو کے چھوٹے درجے کے کام کرنے والوں کی تنخواہیں بڑھ جانے کے لیے اسٹرائیک کرتے ہیں۔

4- وہ ہوٹل اور ریسٹورینٹ بھی دیکھے، جہاں گھنٹے میں لوگ ہزاروں روپے کھانے پینے میں صرف کر دیتے ہیں اور دنیا کا وہ عجیب ترین ریسٹورینٹ بھی دیکھا جہاں باہر موٹے موٹے الفاظ میں لکھا ہوا ہے کہ "کھانا کھانے کے بعد اگر آپ کا جی چاہے تو ایک پیسہ بھی ادا نہ کیجیے۔" (دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہزار میں دو خریدار اس اعلان سے فائدہ اٹھاتے ہیں)

۵ اس اشتہار بازی کے مرکز میں نہ صرف سنیما اور تھیٹر اور صابن اور سگریٹ کے اشتہار دیکھے بلکہ قبرستانوں اور گورکنوں کے بھی اشتہار دیکھے۔ ہمارے پربہار اور پرفضا قبرستان میں اپنے عزیزوں کو دفن کیجیے۔

○

(ب)

نیویارک، پوکیپ سی اور بوسٹن

مغرب سے مشرق:

11 اگست — لاس اینجلز امریکہ کے مغربی ساحل پر ہے، تین ہزار میل سے زیادہ فاصلہ ہے، چار دن کا سفر ہے مگر ٹرین کافی آرام دہ ہے، رات کو سونے کے لیے الگ الگ درجے ہیں مگر ان کے لیے زائد کرایہ دینا پڑتا ہے۔ معمولی درجوں میں نشستیں کرسیوں کی طرح ہیں، اسپرنگ کے گدے لگے ہوئے کیونکہ بھیڑ نہیں ہے، اس لیے ہر مسافر کے پاس دو دو کرسیاں ہیں، رات کو کنڈکٹر (ریل کا ملازم) ہر مسافر کو ایک ایک تکیہ دے جاتا ہے، اس لیے یہاں بھی ٹانگیں سکیڑ کر انسان سو ہی سکتا ہے۔ میں لاس اینجلز اسٹیشن سے رات کو نو بجے سوار ہوا۔ دس بجے سب درجوں کی روشنیاں دھیمی کر دی گئیں اور سب مسافر سو گئے۔

شرلی ٹمپل:

12 اگست — ریل کے تمام درجے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ باہر جتنی بھی گرمی یا سردی ہو اندر ٹمپریچر ایک ہی رہتا ہے، ایک اسٹیشن پر میں چند منٹ کے لیے باہر نکلا تو لو کی گرمی سے جھلس گیا، شاید ملتان میں بھی اگست کے مہینے میں اتنی شدت کی گرمی نہ ہوتی ہوگی، ہم لوگ ہندوستان میں یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ ایک ٹھنڈا ملک ہے۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اس موسم میں

یہاں بھی خوب گرمی ہوتی ہے۔

دن بھر، میں ایک چار پانچ برس کی بچی سے باتیں کرتا رہا، جو میرے قریب کی نشست پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی شکل فلم اسٹار شرلی ٹمپل سے بہت ملتی جلتی ہے، ویسے ہی گھنگریالے بال، ویسی ہی معصوم ہنسی۔ میں اس کو شرلی ٹمپل کہہ کر دیر تک چھیڑتا رہا۔ پھر یہ بچی میری انگریزی کی غلطیاں درست کرتی رہی، امریکہ میں انگریزی بولی جاتی ہے، مگر ایک خاص لہجہ کے ساتھ مثلاً انگریز کہتے ہیں گلاس اور امریکن کہتے ہیں گلیس۔

زراعت:

13 اگست ــ ایک دن اپنے درجے کے تمام مسافروں سے دوستی ہوگئی ہے، سب کو ایک ہندوستانی کو دیکھ کر بہت تعجب ہوا، ہندوستان کے متعلق سوال پوچھتے رہے، مغربی امریکہ میں جو ہندوستانی آباد ہیں ان کے متعلق ان امریکنوں کی رائے اچھی معلوم ہوتی ہے، ایک لڑکی جو کسی اسکول میں استانی ہے، کہتی ہے کہ اس کے قصبے میں ایک ہندوستانی ڈاکٹر بیس سال سے رہتا ہے اور سب امریکن اس سے علاج کراتے ہیں، ہندوستان کی اولاد بھی کہاں کہاں پھیلی ہوئی ہے۔

اس درجے میں جتنے لوگ ہیں، ان میں سے کوئی بھی نیو یارک نہیں جا رہا ہے، سب راستے میں اتر جائیں گے، زیادہ تر تو وہ ہیں جنھوں نے کبھی اپنے ملک کا سب سے بڑا شہر دیکھا ہی نہیں، وہ مجھے بڑا خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ میں نیو یارک جا رہا ہوں۔

کل تمام دن ہم غیر آباد اور بنجر علاقے سے گزر رہے تھے، مگر آج زرخیز علاقے سے گزر رہے ہیں، دونوں طرف گیہوں اور مکئی کے کھیت پھیلے ہوئے ہیں، مگر ہمارے ہندوستان کی طرح چھوٹی چھوٹی کیاریوں جیسے کھیت نہیں بلکہ کئی کئی میل لمبے چوڑے کھیت ہیں جن میں گھوڑے بڑے بڑے ہل کھینچتے ہیں یا ٹریکٹر (موٹر کے ہل) سے کام لیا جاتا ہے۔ فی بیگہ یہاں ہندوستان سے دگنی اور تگنی پیداوار ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں سائنس کی برکت سے زراعت نئے نئے طریقوں سے کی جاتی ہے، درجنوں تو اخبار نکلتے ہیں، جن میں صرف کاشتکاروں کے کام کی خبریں اور مضمون ہوتے ہیں۔

شکاگو:

14 اگست۔۔۔ صبح نو بجے شکاگو پہنچ گئے۔ یہاں ریل بدلنی تھی، دوسری ٹرین کے چلنے میں دیر تھی، میں جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ کر شہر کی سیر کو گیا، لاس اینجلز سے کہیں بڑا شہر ہے، بیس پچیس منزلوں کی عمارتیں، موٹروں کی کثرت، بھیڑ اور شور امریکن فلموں کی بدولت شکاگو کے بدمعاش ہندوستان تک میں مشہور ہیں، دنیا بھر سے زیادہ جرائم اس شہر میں ہوتے ہیں، شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہو، جب ایک قتل نہ ہو، ڈاکے تو معمولی چیز ہیں، امریکہ کے ڈاکو بھی موجودہ ایجادات سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نیز موٹروں اور ریوالوروں، رائفلوں، بموں، ان سب چیزوں کو استعمال کرتے ہیں، شکاگو اس قدر بدنام ہے کہ یہاں نو وارد کو ہر شخص ڈاکو یا بدمعاش ہی نظر آتا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ ننانوے فی صدی لوگ تو بیچارے شہری بے گناہ ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں برائی کی شہرت زیادہ ہوتی ہے اور اچھی باتوں کی نہیں ہوتی، شکاگو کے ڈاکو دور دور مشہور ہیں۔ ان کے متعلق فلم بنائے جاتے ہیں دوسرے ملکوں میں (ہندوستان میں بھی) مجرم ان کے طریقوں کی نقل کرتے ہیں مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ شکاگو اعلیٰ تعلیم خصوصاً سائنس کی تعلیم کا زبردست مرکز ہے۔ دنیا بھر میں جتنی ایجادیں ہوتی ہیں اور سائنس کے مختلف شعبوں کو ترقی ملتی ہے ان میں شکاگو کے پروفیسروں اور سائنسدانوں کا کافی حصہ ہوتا ہے۔

بارہ بجے کے قریب شکاگو سے ریل چلی، اب ہم آباد علاقے سے گزر رہے ہیں ہر پچاس ساٹھ میل پر اچھے بڑے شہر ملتے ہیں، تمام ملک میں یہ سب سے قدیم شہر ہیں، کیونکہ یورپ سے آکر لوگ یہاں ہی آباد ہوئے تھے۔

نیویارک:

15 اگست۔۔۔ صبح سویرے آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ریل سرنگوں میں سے گزر رہی ہے، پہاڑ کی سرنگیں نہیں بلکہ شہر کے نیچے نیچے، ریل کی لائنوں کا جال پھیلا ہوا ہے، کہیں کہیں ریل زمین کی سطح پر آجاتی ہے اور شہر کا حصہ نظر آتا ہے۔ دھواں، کارخانے، چمنیاں، کالے کالے مکان ریل کے دھوئیں سے کالے ہو گئے ہیں، سرنگیں، گیس اور بجلی کے کارخانے، غربت زدہ آبادی، مزدوروں

کے غول کے غول کارخانوں کی طرف جاتے ہوئے، یہ ہے نیویارک کا پہلا منظر جو میں نے دیکھا۔ ہر شہر میں داخل ہونے کے کئی راستے ہوتے ہیں، مثلاً بمبئی میں اگر سمندر کے راستے سے داخل ہوں تو دور سے تاج محل ہوٹل اور فورٹ کی شاندار عمارتیں نظر آئیں گی، مگر جب ریل سے آتے ہیں تو سب سے پہلے دادر اور پریل کے مزدوروں کے گندے اور اندھیرے مکان نظر آتے ہیں، اسی طرح میں نیویارک میں غلط راستے سے داخل ہوا۔ اگر سمندر کے راستہ سے آتا تو میلوں دور سے آزادی کا شاندار بت نظر آتا۔ شہر کی آسمان سے باتیں کرنے والی عمارتیں نظر آتیں، بندرگاہ میں بڑے بڑے جہاز کھڑے ہوئے دکھائی دیتے۔ مگر جس راستے سے میں آیا، میں نے نیویارک کا تاریک پہلو پہلی نظر میں دیکھ لیا۔ شاید کسی شہر کو دیکھنے کا یہی بہتر طریقہ ہے۔

انٹرنیشنل ہاؤس:

اسٹیشن سے ٹیکسی لے کر میں انٹرنیشنل ہاؤس INTERNATIONAL HOUSE آیا، یہ غیر ملکی طالب علموں کا بورڈنگ ہاؤس ہے۔ یہاں چینی، جاپانی، ہندوستانی، جرمن، فرانسیسی، غرض ہر قوم کے طالب علم رہتے ہیں میں تمام دنیا کے نوجوانوں کی کانفرنس WORLD YOUTH CONFERENCE میں شرکت کرنے آیا ہوں۔ اس کا دفتر بھی فی الحال یہاں ہی ہے، دنیا کے کونے کونے سے سیکڑوں ڈیلیگیٹ آئے ہوئے ہیں، آج سب یہاں ٹھہریں گے اور کل یہاں سے یوکیپ سی جائیں گے جہاں واسر کالج میں کانفرنس کے اجلاس ہوں گے۔

انٹرنیشنل ہاؤس میں دوسرے ہندوستانی ڈیلیگیٹوں سے ملاقات ہوئی جو یورپ سے سیدھے بحر اوقیانوس کے راستے آئے ہیں۔ ہمارے لیڈر بمبئی کے مشہور کانگریس سوشلسٹ یوسف مہر علی ہیں جو ہندوستان سے اسی کانفرنس کی غرض سے آئے ہیں۔ ان کے علاوہ میاں افتخارالدین ہیں جو پنجاب کے نوجوان کانگریسی لیڈر ہیں۔ ان دونوں کو میں مدت سے جانتا ہوں۔ مس رینو رائے اور آرون بوس کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں، وہاں سے آئے ہیں۔ باسو پیرس یونی ورسٹی میں تعلیم پاتے ہیں، دن بھر سب ڈیلیگیٹ ایک دوسرے سے ملتے رہے اور مختلف کمیٹیوں کے جلسے ہوتے رہے۔ میں اور میاں افتخار موقع پا کر شہر کی سیر کو چل دیے۔

اسٹرائیک:

سب سے پہلی چیز جو ہم نے نیویارک میں دیکھی وہ ایک موزے بنیانوں کے کارخانے کا اسٹرائیک تھا۔ مالک نے مزدوروں کی تنخواہ کم کر دی تھی۔ مزدوروں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ کارخانے کے دروازے پر چند نوجوان مزدور پکٹنگ کر رہے تھے اور غدار مزدوروں کو اندر جا کر کام کرنے سے روک رہے تھے۔ ایک لڑکے سے ہم دیر تک باتیں کرتے رہے، اس نے بتایا کہ کس طرح کارخانوں کے مالک مزدوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ مگر پچھلے ایک دو سال سے نیویارک میں ٹریڈ یونین یعنی مزدوروں کی انجمنوں کا زور ہے۔ مزدوروں کی ہر جماعت منظم ہے اور مالکوں کے جبر و استبداد کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس مزدور لڑکے سے باتیں کر کے ہم حیران رہ گئے اپٹن سنکلیر کے بعد یہ پہلا امریکن ملا جو ہندوستان کے متعلق صحیح واقفیت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں سوشلزم کے بڑھتے ہوئے اثر کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اس نے کہا، ''امید ہے کہ ایک دن امریکہ اور ہندوستان دنیا میں دو زبردست سوشلسٹ حکومتیں ہوں گی۔''

شہر میں گھومنے پر ہم نے دیکھا کہ اس قسم کے اسٹرائیک کئی اور کارخانوں اور دوکانوں میں ہو رہے تھے۔ نیویارک کی بڑی بڑی دوکانیں بھی کارخانوں سے کم نہیں، بعض دوکانیں جہاں ہر قسم کا سامان ملتا ہے اور جن کو DEPARTMENT STORES کہتے ہیں اتنی بڑی ہیں کہ ایک وقت میں ایک دوکان میں آٹھ دس ہزار خریدار موجود رہتے ہیں، دو دو تین تین ہزار ملازم رہتے ہیں، اپٹن سنکلیر نے مجھے بتایا تھا کہ امریکہ میں سرمایہ داری اس درجہ پر پہنچ گئی ہے جہاں بڑے بڑے سرمایہ دار چھوٹے سرمایہ داروں کو بھی نہیں پنپنے دیتے، چھوٹی دوکانیں چھوٹے کارخانے، چھوٹے اخبار، سب بند ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ بڑے بڑے کاروبار ترقی کر رہے ہیں یعنی دولت سمٹ سمٹ کر چند لوگوں کے ہاتھ میں جمع ہوتی جا رہی ہے۔

104 منزلیں:

میں نے بمبئی میں سات منزل کی عمارتیں دیکھی تھیں، کلکتہ میں نو دس منزل تک کی عمارتیں دیکھی تھیں، شنگھائی میں تیرہ چودہ منزل تک کی عمارتیں دیکھی تھیں، لاس اینجلز میں آ کر بیس منزل

اونچے مکان دیکھے اور شکاگو میں پچیس منزل کی عمارتیں نظر آئیں، مگر یہ سب نیویارک کی سب سے اونچی عمارت EMPIRE STATE BUILDING کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہیں جو 104 منزل کی ہے۔ اس عمارت کو اوپر تک دیکھنے کے لیے کوئی ایک فرلانگ دور کھڑے ہو کر دیکھنا پڑتا ہے۔ پھر بھی خدشہ رہتا ہے کہ ٹوپی نہ گر جائے۔ ایک مینار معلوم ہوتی ہے۔ جس کی چوٹی بادلوں میں تیر رہی ہے۔ ہم لفٹ میں اس کی چوٹی تک گئے، یہ لفٹ بھی نہایت تیز ہوتے ہیں اور کوئی ایک ڈیڑھ منٹ میں اوپر پہنچا دیتے ہیں۔ ایکسپریس ریلوں کی طرح ایکسپریس لفٹ بھی ہوتے ہیں جو راستے میں بہت کم ٹھہرتے ہیں۔ سب سے اوپر کی منزل پر ایک مختصر سا ریسٹورینٹ ہے جہاں ہم نے چائے پی، یہاں سے دور تک پورا نیویارک نظر آتا ہے۔ نیچے سڑکوں پر چلتی ہوئی موٹریں بالکل کھلونے کی طرح معلوم ہوتی ہیں اور دریائے ہڈسن جس کے دہانے پر نیویارک واقع ہے سفید دھجی معلوم ہوتا ہے۔

اس عمارت کے آس پاس چند اور عمارتیں چالیس سے لے کر اسی منزل تک کی ہیں مگر عام طور سے نیویارک کی عمارتیں اتنی اونچی نہیں ہیں اگرچہ دس بارہ منزلیں تقریباً ہر عمارت کی ہوتی ہیں۔

یادگار نظارہ:

رات کو ایک کھیل کے میدان STADIUM میں نوجوانوں کی کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ نیویارک کے ترقی پسند میئر MAYOR لاگوارڈیا نے صدارت کی دنیا کی 56 قوموں کے سات سو نمائندوں کے علاوہ نیویارک کے پچاس ہزار نوجوان تماشہ دیکھنے کے لیے موجود تھے، لاگوارڈیا صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ دنیا کا مستقبل نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بعد ہر براعظم کے ایک نمائندے نے تقریر کی، ایشیاء کی طرف سے چین کا نمائندہ بولا اور یورپ کی طرف سے اسپین کی ایک لڑکی نے تقریر کی، افریقہ کی نمائندگی ایک حبشی کالی بالا نے کی۔ جب تمام نمائندے اپنے اپنے قومی جھنڈے لیے ہوئے میدان کے گرد مارچ کرتے ہوئے گھومے تو سب سے زیادہ تالیاں چینی نمائندوں کے لیے بجیں۔ ان کے بعد اسپین کا نمبر تھا۔ ہندوستانی نمائندے جب اپنا ترنگا جھنڈا لیے ہوئے نکلے تو کافی لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ ایک شخص نے چلا

کرکہا "HOW IS GOOD OLD GANDHI" (مہاتما گاندھی کا کیا حال چال ہے) یہ نوجوانوں کا اتحاد اور اخوت کا ایسا شاندار مظاہرہ تھا کہ ہر وہ شخص جو موجود تھا عمر بھر یاد رکھے گا۔

پوکیپ سی:

16 اگست — نیویارک سے دو پہر کو ایک چھوٹے سے دخانی جہاز میں سوار ہو کر تمام ڈیلی گیٹ پوکیپ سی آ گئے۔ یہ قصبہ نیویارک سے کوئی ساٹھ میل کے فاصلہ پر دریا کے کنارے آباد ہے۔ واسر کالج جہاں ہماری کانفرنس ہو رہی ہے اور جہاں ہم ٹھہرے ہیں، امریکہ کا سب سے مشہور لڑکیوں کا کالج ہے۔ یہاں امیر گھرانوں کی کئی ہزار لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ آج کل کالج میں چھٹیاں ہیں اس لیے بورڈنگ وغیرہ خالی ہیں اور ہم لوگ بڑے ٹھاٹھ سے ٹھہرے ہوئے ہیں، خوش قسمتی سے مجھے تو پورا کمرہ مل گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جو لڑکیاں اس کمرے میں رہتی ہیں وہ بہت سلیقہ والی ہیں۔ کیونکہ کمرہ بہت خوش مذاقی کے ساتھ سجا ہوا ہے۔

جس وقت ہمارا جہاز پوکیپ سی پہنچا تھا تو شہر کے سینکڑوں مرد، عورت اور بچے ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اپنے قصبہ میں تمام دنیا کے نوجوانوں کا اتنا بڑا اگروہ دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ ان کی مہمان نوازی اور دوستانہ رویہ کا ہمارے دلوں پر بڑا اثر ہوا۔ شام کو جب ہم بازار گھومنے گئے تو وہاں بھی ہر دوکاندار اور راہ گیر ہم لوگوں سے نہایت اخلاق سے ملا۔ ایک شراب کی دوکان کے مالک نے تو جوش میں آکر اعلان کر دیا کہ کانفرنس کا جو ڈیلی گیٹ چاہے اس کے ہاں مفت شراب پی سکتا ہے۔ افسوس کہ میں تو اس فیاضی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

مسز روز ولٹ:

رات کے آٹھ بجے ہماری کانفرنس کا پہلا جلسہ کالج کے بڑے ہال میں ہوا۔ امریکہ کے پریذیڈنٹ کی بیوی مسز روز ولٹ بھی موجود تھیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جمہوری حکومت کے پریذیڈنٹ اور کسی سلطنت کے بادشاہ میں کوئی فرق نہیں ان کو مسز روز ولٹ کا طرزِ عمل دیکھنا چاہیے۔ لباس، بات چیت کسی طرح سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ خاتون امریکہ کے حکمراں کی بیوی ہے۔ کوئی ملکہ جب کہیں جاتی ہے تو پولیس اور فوج کا انتظام ہوتا ہے۔ ملکہ چلتی ہے تو شاہانہ وقار کے ساتھ، بات کرتی

ہے تو اس میں بھی رعب اور دبدبہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مسز روز ولٹ اس بے تکلفی سے لوگوں سے مل رہی تھیں اور باتیں کر رہی تھیں کہ بہت سے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ وہ کون ہیں، جب تک صدر نے ان سے تقریر کرنے کی درخواست نہ کی اپنے خاوند کی طرف سے انھوں نے کانفرنس کا خیر مقدم کیا اور نوجوانوں کی امیدوں اور امنگوں کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔

اس جلسہ کے بعد مسز روز ولٹ کی طرف سے ہماری آئس کریم کی دعوت ہوئی۔ ایک خالی بڑے کمرے میں سب ڈیلی گیٹ بھرے ہوئے تھے۔ سات سو آدمیوں کے لیے کرسیوں اور میزوں کا انتظام تو مشکل تھا۔ اس لیے سب کھڑے ہوئے آئس کریم کھا رہے تھے۔ میزبان صاحبہ بھی بے تکلفی سے اسی بھیڑ میں کھڑی ہوئی تھیں، ڈیلیگیٹوں کے ایک گروہ نے مسز روز ولٹ کو گھیر لیا اور باتیں کرنی شروع کر دیں، اس پر انھوں نے فرمایا کہ اس طرح بات کرنا تو مشکل ہے۔ بہتر ہے کہ سب لوگ زمین پر بیٹھ جائیں، یہ کہہ کر امریکہ کے پریذیڈنٹ کی بیوی اطمینان سے لکڑی کے فرش پر بیٹھ گئی (ہمارے ہندوستان میں تو ڈپٹی کمشنر کی بیوی بھی فرش پر بیٹھنے کو اپنی ہتک سمجھتی ہے) دیر تک مسز روز ولٹ سے تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کے خیال میں امریکہ کی اگلی پریذیڈنٹ ایک عورت ہوگی؟'' جس کا جواب مسز روز ولٹ نے ہنس کر دیا۔ ''ابھی تو یہ مشکل نظر آتا ہے۔'' میں نے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ پریذیڈنٹ کی بیوی ہونے کے علاوہ مسز روز ولٹ بذات خود ایک نہایت قابل اور مدبّر عورت ہیں۔ ان کے مضامین روزانہ سیکڑوں اخباروں میں شائع ہوتے ہیں اور ملک کی سیاسی اور سماجی بہبودی کے لیے وہ سیکڑوں پبلک کاموں میں دلچسپی لیتی ہیں اور بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر پریذیڈنٹ روز ولٹ تیسری مرتبہ الیکشن میں کھڑے ہونے سے انکار کر دیں تو پھر مسز روز ولٹ کو نامزد کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے شوہر کا عمدہ کام جاری رکھ سکیں۔

نوجوانوں کی انجمن اقوام:

17 اگست۔ 23 اگست — یہ ہفتہ میری زندگی میں یادگار رہے گا۔

جنیوا میں انجمن اقوام کے جلسے ہوتے ہیں اور تمام ملک کے نمائندے جمع ہوتے ہیں تو

وہاں ہر شخص سیاست دانی کے مرض میں گرفتار ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے کوئی خلوص اور نیک نیتی سے نہیں ملتا۔ ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے سے کسی نہ کسی طرح اپنا کام نکالے۔ اگر جنیوا میں اس خلوص اور نیک نیتی کا چوتھائی حصہ بھی ہوتا جو یوکیپ سی میں نظر آیا تو دنیا میں جنگ اور ظلم اور سامراج کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جاتا۔ ہماری کانفرنس کی سب سے شاندار کامیابی یہ تھی کہ ایسے وقت جب کہ دنیا پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے ہیں، جب بڑی بڑی طاقتیں چھوٹے ملکوں کو ہضم کرنے پر تلی ہوئی ہیں، جب فاشیست کا ہیبت ناک دیو جمہوریت کو ہمیشہ کے لیے فنا کرنے پر تلا ہوا ہے، جب قوموں اور ملکوں کے درمیان نفرت اور فساد کا بیج بویا جا رہا ہے۔ ایسے وقت پر 56 ملکوں اور قوموں کے سات سو نمائندے (لڑکے اور لڑکیاں) امریکہ کے اس قصبے میں باہمی تبادلۂ خیال سے دنیا میں امن قائم کرنے کی غرض سے جمع ہوئے۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے اپنے اپنے ملک واپس جانے سے پہلے ہی دنیا جنگ کی بھٹی میں جھونک دی جائے۔ ممکن ہے کہ چند مہینے میں ان کو ایک دوسرے کے خلاف لڑنے کے لیے مجبور کیا جائے، مگر یہ ممکن نہیں کہ جس امن پسند اسپرٹ کا مظاہرہ یوکیپ سی میں ہوا ہے وہ فنا ہو جائے۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، دنیا اس نتیجہ پر پہنچے گی کہ بین الاقوامی جنگ اور فساد کو ختم کرنے کا وہی طریقہ ہے جو ہماری کانفرنس نے اختیار کیا۔

تعارف:

سات سو نمائندے جو اس کانفرنس میں جمع ہوئے ہیں دنیا کی سینکڑوں نوجوان انجمنوں کی طرف سے بھیجے گئے ہیں، ان میں کالے بھی ہیں اور گورے بھی، امیر بھی ہیں اور غریب بھی، عیسائی، ہندو، مسلمان اور لامذہب بھی کیمونسٹ اور قدامت پسند لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی، ان میں سے ہر ایک 'نوجوانوں' کے کسی نہ کسی گروہ کا نمائندہ ہے۔ ان سب کا ذکر لکھنا تو ناممکن ہے۔ مگر چند دلچسپ شخصیتوں کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

چین کے پچاس نمائندوں میں سب سے نمایاں ہستی یان دنگ منگ ہے اس اٹھارہ سال کی بہادر لڑکی نے اپنے ملک کی خاطر کئی بار اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا ہے۔ سال بھر ہوا جب

شنگھائی کے گردونواح میں چینی فوجیں جاپانی فوجوں کا مقابلہ کررہی تھیں۔ اس لڑکی نے جان پر کھیل کر ایک چینی دستے کے پاس ہتھیار اور پیغام پہنچائے۔

افریقہ سے لمبا تڑنگا شاندار حبشی کالی بالا آیا ہے۔ یوگانڈا کا یہ نمائندہ کولمبیا یونی ورسٹی کا گریجویٹ ہے۔ انگریزی بے تکان بولتا ہے۔ مگر اپنی قوم کے درد سے اس کا دل بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقریر میں اس نے بے دھڑک سفید قوموں کو کھری کھری سنائیں اور کہا کہ وحشی اس کے سیدھے سادھے ہم قوم نہیں ہیں بلکہ وہ سفید رنگ کے لوگ ہیں جو اپنی دولت اور طاقت کی خاطر دوسری کمزور قوموں پر ظلم کرتے ہیں۔

اسپین کے جنگی میدانوں سے دو لڑکیاں میریا بلٹران اور مارگریٹا روبلز آئی ہیں جو اپنے ملک میں فاشیت کے خلاف بندوق لے کر لڑتی بھی ہیں اور ان پڑھ کسانوں اور مزدوروں کو تعلیم بھی دیتی ہیں۔

کینیڈا سے ایک دبلی پتلی لڑکی اسابیل رکر آئی ہے۔ وہ ایک مزدور کی لڑکی ہے، اس کے پاس ریل کا کرایہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ ایک مہینے میں چھ سو میل پیدل چل کر آئی ہے۔

حبش (ابی سینیا) کو مسولینی نے اپنی فوجوں اور زہریلی گیس کی مدد سے فتح کر لیا ہو۔ مگر اس ملک کے قوم پرستوں نے ابھی ہمت نہیں ہاری۔ ان کے نمائندے ڈاکٹر بائن نے ہماری کانفرنس کے سامنے اپنے ملک کی حالت بیان کی اور بتایا کہ کس طرح قوم پرست اب بھی اطالوی فاشیت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

جنوبی افریقہ کے نمائندوں میں ڈاکٹر میکس جوف اور مسز میکس جوف قابل ذکر ہیں، اس کانفرنس کے لیے روانہ ہونے سے ایک دن پہلے ہی ان کی شادی ہوئی تھی۔ گویا یہ ان کا ہنی مون ہے۔ گو وہ خود یورپین نسل سے ہیں مگر سوشلسٹ ہونے کی حیثیت سے ان کی ہمدردی اپنے ملک کے حبشیوں کے ساتھ ہے۔

فلسطین سے دو نمائندے آئے ہیں۔ ایک عرب اور ایک یہودی، کمال یہ ہے کہ دونوں بجائے ایک دوسرے کو الزام دینے کے برطانوی سامراج کو فلسطین کی موجودہ صورت حال کے لیے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔

آسٹریا پر ہٹلر نے قبضہ کرلیا ہے اور یورپ کے حکمرانوں نے چوں نہیں کی، مگر نوجوانوں کی اس کانفرنس نے ہٹلر کی جابرانہ حرکتوں کی نہ صرف زبانی مذمت کی بلکہ ہٹلر کے مخالف آسٹرین لوگوں کے نمائندے کو کانفرنس کی کارروائی میں حصہ لینے کا موقع دیا۔ یہ نوجوان اپنا نام بدل کر اس کانفرنس میں شریک ہوا ہے تاکہ آسٹریا میں نازی اس کے خاندان والوں کو نہ ستائیں۔

انگلستان کے نمائندوں میں ہر سیاسی جماعت کے لوگ ہیں۔ قدامت پسند صرف تین ہیں۔ باقی لبرل مزدور سوشلسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے کئی نے برطانوی سامراج کی کھلم کھلا مخالفت کی اور ہندوستان کے حق آزادی کی تائید کی۔ ایک لڑکی مارگریٹ گیل نے تو کمال کردیا اور بھری کانفرنس میں اپنے ملک کی حکومت کو ہندوستان پر حکومت کرنے کے ناقابل ٹھہرایا۔

یہ نمائندے نہ صرف بڑے بڑے ملکوں سے آئے تھے بلکہ اتنے مختصر ملکوں سے بھی جیسے ہائٹی HAITI دنیا میں بہت سے لوگوں نے تو اس ملک کا نام بھی نہ سنا ہوگا یہ امریکہ کے مشرقی ساحل کے قریب ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ دراصل کولمبس نے جس امریکہ کو دریافت کیا تھا وہ ہائٹی ہی تھا۔ اس ملک کی نمائندہ ایک لڑکی لارا کیڈٹ ہے جس نے کانفرنس کو بتایا کہ کس طرح نازی پروپیگنڈا اس کے ملک میں بھی ہو رہا ہے۔

کانفرنس نے امن، جنگ کی مخالفت، تعلیم، بیکاری وغیرہ کے متعلق بہت سی کارآمد تجویزیں منظور کیں۔ مگر اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اتنے مختلف ملکوں نسلوں اور قوموں کے نمائندوں کو ایک جگہ جمع ہونے اور باہمی تبادلہ خیالات کا موقع دیا۔

اس کانفرنس نے بین الاقوامی دوستی اور رفاقت کا بیج بویا۔ اس اتحاد کی زندہ مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔ مختلف ملکوں کے نمائندوں کی سینکڑوں دوستیوں کے علاوہ کم از کم پانچ نسبتیں اور دو شادیاں اس کانفرنس کی وجہ سے واقع ہوئیں۔

نیگرو:

اس کانفرنس میں بہت سے نیگرو یا حبشی نمائندوں سے ملا۔ سب سے پہلی بات جو میں نے اُن میں دیکھی وہ یہ ہے کہ تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے یہ لوگ سوفی صدی امریکن ہیں۔ بات چیت

طرز رہائش، تعلیم کسی اعتبار سے بھی وہ دوسرے امریکنوں سے مختلف نہیں ہیں۔ ہاں مہمان نوازی اور مسافر دوستی میں وہ امریکنوں سے بھی بڑھ گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ سفید قوموں اور نیگروؤں میں آپس کی شادیوں کے نتائج ایک مخلوط نسل میں نمودار ہوں گے، امریکہ میں ہزاروں آدمی ایسے ہیں جن کا رنگ گندمی یا صاف ہے، مگر بال سیاہ گھنگریالے ہیں۔ مگر کمال یہ ہے کہ یہ سب لوگ اپنے آپ کو نیگرو کہتے ہیں حالانکہ اکثر کوئی ان پر نیگرو ہونے کا شبہ نہیں کر سکتا۔ ایک دن میں نے ایک سفید لڑکی کو بہت سی نیگرو لڑکیوں کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا۔ بعد میں میں نے اس سے کہا۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نیگرو لڑکیوں سے اتنی گھل مل گئی ہو۔ یہ سن کر وہ بہت ہنسی اور جواب دیا۔ مگر میں بھی تو نیگرو ہوں، دیکھتے نہیں ہو کہ میرے بال کتنے سیاہ ہیں۔ یہ سن کر میں دنگ رہ گیا۔ کیونکہ ہمارے ملک میں تو غلامانہ ذہنیت کی یہ حالت ہے کہ اینگلو انڈین تو کجا دیسی عیسائی بھی اپنے آپ کو انگریز سمجھتے ہیں۔ نیگرو قوم کی خودداری قابلِ تعریف ہے۔

سوائے جنوبی ریاستوں کے جہاں نیگروؤں کو تعلیم حاصل کرنے کا پورا موقع نہیں دیا جاتا، نیگرو قوم نے حیرت انگیز تعلیمی ترقی کی ہے۔ شمالی امریکہ میں کثرت سے نیگرو وکیل، بیرسٹر، اخبار نویس، ایکٹر، ڈاکٹر وغیرہ نظر آتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اب بھی ان کی قوم کے زیادہ تر لوگ کم درجہ کی ملازمتوں وغیرہ میں ملتے ہیں۔

جوں جوں امریکن قوم کی تعلیمی اور تمدنی حالت بہتر ہوتی جا رہی ہے کالے اور سفید رنگ کی تمیز بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ شمالی ریاستوں میں قانون کالے گورے میں کوئی تمیز نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص کسی نیگرو پر ظلم یا جبر کرے تو اس کو سزا دی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی جو امتیاز صدیوں تک قائم رکھا گیا ہو وہ چند سال میں نہیں مٹایا جا سکتا۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ نیگرو قوم کی حمایت اور کالے گورے کی تفریق کو مٹانے میں پیش پیش ہیں گو قدامت پسند اب بھی نیگرو قوم کو کم تر سمجھتے ہیں۔

جنوبی ریاستوں میں مجھے جانے کا موقع نہیں ملا، یہ وہ علاقہ ہے جہاں مدت تک غلامی کا رواج تھا اور جب تک ابراہیم لنکن نے ان کو رہا نہیں کیا، سینکڑوں نیگرو غلامی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ ان لوگوں کو افریقہ کے جنگلوں میں مختلف دھوکوں سے پکڑ کر امریکہ لا کر کھیتوں میں کام کرنے کے لیے بیچ دیا جاتا تھا۔ آج قانون کی نگاہ میں نیگرو آزاد ہیں۔ مگر جنوبی علاقہ میں ان پر اب

بھی بہت ظلم کیا جاتا ہے۔ جو امریکن ہندوستانیوں پر چھوت چھات اور ذات پات کا الزام لگاتے ہیں ان کو اپنے ملک کی جنوبی ریاستوں میں جا کر دیکھنا چاہیے کہ کس طرح نیگرو قوم پر ظلم ہو رہا ہے۔

میں نیگرو بن گیا:

مجھے جنوبی علاقہ کے امریکنوں کی اس ذہنیت کو دیکھنے کا ایک عجیب موقع ملا۔ لاس اینجلز سے نیویارک آتے ہوئے میں ایک دن کھانا کھانے کے لیے ڈائننگ کار DINING CAR میں گیا۔ تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ صرف ایک میز پر ایک کرسی خالی تھی۔ دوسری کرسیوں پر ایک موٹی عورت اور اس کے دو بچے بیٹھے تھے۔ ایک بچے نے مجھے دیکھ کر اشارہ کیا کہ یہاں آجاؤ۔ مگر اس سے پہلے کہ میں وہاں بیٹھ جاؤں اس کی ماں نے اس کے کان میں زور سے کہا۔ خبر دار۔ دیکھتا نہیں یہ نیگرو ہے، یہ سن کر میں جھجک گیا۔ اتنے میں ڈائننگ کار کے منیجر نے اس عورت کو آکر سمجھایا کہ میں نیگرو نہیں ہوں بلکہ ہندوستانی ہوں۔ تب وہ عورت مجھ کو مخاطب کر کے بولی۔ اوہ اگر ایسا ہے تو تم بیٹھ سکتے ہو۔ اب مجھے بھی غصہ آگیا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ اگر تمہیں نیگرو کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار ہے تو مجھے تمہاری میز پر بیٹھنے سے انکار ہے۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا، منیجر گھبرا گیا کہ میں شاید ریلوے کمپنی کو شکایت لکھ کر بھیجوں گا کیونکہ قانوناً کسی نیگرو کو بھی ڈائننگ کار میں کھانا کھانے سے نہیں روکا جا سکتا۔ وہ میرے پاس بھاگا آیا اور کہا کہ وہ عورت جنوبی علاقہ کی رہنے والی ہے اور اس لیے نیگرو آدمیوں سے نفرت کرتی ہے۔ مگر اس کو کوئی حق نہیں ہے کہ ایک مسافر کو اس جگہ بیٹھنے سے روک سکے۔ میں نے منیجر کو یقین دلایا کہ میں اس کی شکایت نہ کروں گا مگر پھر میں کھانا کھانے نہ گیا۔

چند منٹ بعد جب سب مسافر کھانا کھا کر واپس آئے تو کئی آدمیوں نے میری حمایت میں اس عورت سے بحث شروع کر دی اور دیر تک تو تو میں میں ہوتی رہی یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ کم از کم چند امریکن مسافر نیگرو قوم کی طرف داری کر رہے تھے۔

بوسٹن:

یوکیپ سی سے ایک دن موٹر کر کے میں افتخار بوس اور باسو بوسٹن گئے جو یہاں سے کوئی ڈیڑھ سو میل ہے۔ راستہ نہایت خوشگوار ہے۔ صاف چوڑی سڑک سرسبز علاقہ میں سے گزرتی

ہوئی جاتی ہے۔ راستہ میں نہایت خوب صورت اور ستھرے گاؤں اور قصبے پڑتے ہیں۔ پرانی وضع کے مکان، اونچے اونچے گرجا، باغ اور پارک، یہ امریکہ کا سب سے بارونق علاقہ ہے۔ بوسٹن ایک تاریخی شہر ہے اور اپنی قدامت اور خاموشی کے لحاظ سے نیویارک سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں موجودہ وضع کی اونچی اونچی عمارتوں کے بجائے پرانی چال کے شاندار رئیسانہ مکان نظر آتے ہیں۔ کسی زمانے میں امریکہ کے سب سے بڑے زمیندار اور تاجر یہاں رہتے تھے۔ مگر یہ زمانہ تیز رفتار زندگی، مشینوں اور کارخانوں کا ہے۔ بوسٹن اس دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے۔ نیویارک اور شکاگو اور لاس اینجلز کے مقابلے میں بوسٹن ایک گاؤں معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کے رہنے والے (دلی اور لکھنؤ کے رئیسوں کی طرح اب بھی) اپنی پرانی شان وشوکت کے خواب دیکھا کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا ان کو پیچھے چھوڑ گئی ہے۔

بوسٹن کے قریب ہی ہارورڈ کی یونی ورسٹی ہے۔ ہم یونی ورسٹی دیکھنے گئے۔ کوئی خاص بات عمارتوں میں نظر نہیں آئی۔ بنارس اور علی گڑھ کی عمارتیں زیادہ شاندار ہیں مگر یہاں کی لائبریری ضرور بہت بڑی ہے، یونی ورسٹی میں چھٹیاں تھیں اس لیے ہم صرف خالی عمارتوں میں گھوم کر آ گئے۔

پھر نیویارک:

23 اگست۔ 30 اگست— نیویارک جیسے شہر کو سرسری نظر سے دیکھنے کے لیے بھی ایک ہفتہ کافی نہیں ہے۔ میں نے یہ سات دن ٹراموں، بسوں، ریلوں اور ٹیکسیوں میں سے نیویارک کی ایک جھلک دیکھنے میں گزارے۔ مشہور اخباروں کے دفتروں میں کافی عرصہ گزارا۔ یہاں دو چار لاکھ کی اشاعت تو معمولی بات ہے۔ نیویارک ٹائمز جو شاید دنیا کا سب سے زبردست اخبار ہے بیس پچیس لاکھ چھپتا ہے۔ اس اخبار کا دفتر اتنا بڑا ہے کہ اس میں ہندوستان کے تمام اخباروں کے دفاتر سما سکتے ہیں۔ اخباروں کے مختلف ایڈیشن دن رات چھپتے رہتے ہیں، ہر دو گھنٹے کے بعد نیا ایڈیشن نئی خبروں کے ساتھ نکل آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بھی غور سے اخبار کو نہیں پڑھتا۔ سب سرخیوں پر سرسری نظر ڈال کر پھینک دیتے ہیں اور دو گھنٹے بعد نیا ایڈیشن خریدتے ہیں۔ اسی لیے عام لوگوں کی واقفیت ٹھوس نہیں بلکہ داجبی ہے۔ عجیب بات ہے، اتنے اخبار شائع ہونے کے

باوجود عام واقفیت میں کوئی حیرت انگیز اضافہ نہیں ہوا اور باوجود اس کے کہ نیویارک میں ہر تیسرے شخص کے پاس موٹر کار ہے لوگوں کو میلوں پیدل چلنا پڑتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ بیس پچیس لاکھ موٹروں کو کھڑا کرنے کے لیے شہر میں کافی جگہ نہیں ہے۔ جہاں کہیں جگہ ہے بھی تو مالک موٹر کھڑا کرنے کا کرایہ لیتے ہیں، دس آنہ سے لے کر تین روپیہ روز تک۔ نیویارک وہ شہر ہے جہاں:

1- اخبار بیچنے والے اخباروں کا گڈا سڑک کے کنارے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور جس راستہ چلنے والے کو ضرورت ہوتی ہے وہ اخبار لیتا ہے اور قیمت ایک ٹین کے پیالے میں ڈال دیتا ہے۔

2- جوتے پر پالش کرانے کے لیے ڈھائی آنے سے پانچ آنے تک دینے ہوتے ہیں۔

3- بعض ہوٹلوں میں ایک وقت کے غسل کی قیمت چھ روپے دینی ہوتی ہے اور ایک قہوہ کی پیالی ایک روپے میں ملتی ہے۔

4- سنیما میں ہر وقت تماشہ ہوتا رہتا ہے۔ فلم ختم ہوتے ہی فوراً دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ روشنی کبھی ہوتی نہیں۔ بیکار لوگ جن کو کہیں سونے کا ٹھکانا نہیں، کسی سنیما میں جا کر سو جاتے ہیں اور صبح کے دو بجے جب تماشہ ختم ہوتا ہے تو نکالے جاتے ہیں۔

5- ٹیکسی والے یا سامان اٹھانے والے مزدور کو دس آنہ (25 سینٹ) انعام دیا جائے تو وہ اپنی ہتک سمجھتا ہے۔

6- ہوٹل یا دوکان یا مکان کے بل کو چیک کہتے ہیں اور کرنسی نوٹ کو بل

7- بعض سڑکوں پر جو شہر کے باہر ہیں، موٹر کو آہستہ رفتار سے چلانا جرم ہے یہ سڑکیں فقط تیز رفتار گاڑیوں کے لیے ہیں۔

8- شہر میں ریلیں زمین کے نیچے نیچے بھی چلتی ہیں اور سڑکوں کے اوپر پلوں پر بھی چلتی ہیں۔

9- بسوں اور ٹراموں میں ٹکٹ نہیں ملتا۔ کرایہ کا سکہ کنڈکٹر کے پاس ایک مشین ہوتی ہے اس میں ڈال دیا جاتا ہے۔

10- دنیا کی ہر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ نیگرو، چینی، جاپانی، جرمن، فرانسیسی پولینڈ کے رہنے والے، آسٹرین، روسی وغیرہ اور ان سب کے اپنی زبانوں میں اخبار نکلتے ہیں۔

11- وال اسٹریٹ WALL STREET جہاں روزانہ اربوں کا کاروبار ہوتا ہے اور جہاں دنیا

کے سب سے بڑے بینک اور منڈیاں ہیں، ایک پتلی سی گلی ہے۔ جہاں دو موٹریں برابر برابر نہیں چل سکتیں۔

امریکہ:

غرض امریکہ وہ ملک ہے جہاں:

1- بڑے بڑے سرمایہ داروں کی آمدنی کا حساب کروڑوں نہیں بلکہ اربوں میں ہوتا ہے۔

2- تقریباً ہر خاندان میں ایک موٹر اور ریڈیو ہے۔

3- معمولی مزدور کو تقریباً دس روپے روزانہ مزدوری ملتی ہے۔

4- معمولی ہوٹلوں میں بھی ناشتہ کی قیمت دس بارہ آنہ اور کھانے کی قیمت ڈھائی تین روپے ہوتی ہے۔ کافی کی پیالی پانچ آنے میں ملتی ہے۔

5- تمام بڑے بڑے اخبار اور ریڈیو اسٹیشن موجودہ پریسی ڈینٹ مسٹر روزولٹ اور اس کی حکومت کے خلاف ہیں۔ کیونکہ وہ بڑے بڑے سرمایہ داروں پر ٹیکسوں کا اضافہ کر کے غریبوں اور بیکاروں کی امداد کرنا چاہتا ہے۔

6- جب کسی نوجوان کو عشق میں ناکامی ہوتی ہے تو وہ اپنی موٹر میں کچھ دیر کے لیے ساٹھ ستر میل کی رفتار سے مارا مارا پھرتا ہے...... اور پھر کسی دوسری لڑکی کو ملاقات کے لیے ٹیلیفون کرتا ہے۔

7- گرمی کے موسم میں عدالت کے جج اور وکیل کوٹ اتار کر اور آستینیں چڑھا کر بیٹھتے ہیں اور نیویارک کا میئر MAYOR کوٹ کندھے پر ڈالے پھرتا ہے۔

6- مکئی کے بھٹے بھون کر نہیں بلکہ ابال کر کھائے جاتے ہیں۔

9- ہر ہندوستانی کو مہاراجا، سوامی، فلسفی یا سپیرا سمجھا جاتا ہے۔

10- زیادہ تر طالب علم اپنے فرصت کے وقت میں مزدوری یا ملازمت کر کے کالج کا خرچ پورا کرتے ہیں۔

11- خود چالو مشینوں میں سکے ڈال کر چاکلیٹ، آئس کریم، پھل، ڈاک کے ٹکٹ اور اسی قسم کی سینکڑوں چیزیں نکالی جا سکتی ہے۔

○

جنگ کے بادل

نورمنڈی:

31 اگست — آج صبح نیویارک سے نورمنڈی جہاز میں روانہ ہوا۔ مسافروں میں کئی جاننے والے ہیں جن سے نوجوانوں کی کانفرنس کے دوران میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان میں ڈاکٹر اور مسز میکس جوزف قابل ذکر ہیں جو جنوبی افریقہ واپس جا رہے ہیں اور جو باوجود سفید نسل کے ہونے کے تمام غلام قوموں سے ہمدردی رکھتے ہیں، ہم سب لوگ تیسرے درجے میں ہیں۔ مگر 'نورمنڈی' کا تیسرا درجہ بھی دوسرے جہازوں کے سیکنڈ کلاس سے کہیں بہتر ہے، اپنے کیبن میں میں اکیلا ہوں۔ اس لیے خوب اطمینان سے سامان پھیلا سکتا ہوں۔

نیویارک میں اتنی راتیں جاگ کر گزاریں کہ جیسے ہی جہاز روانہ ہوا میں اپنے کیبن میں جا کر لیٹ گیا۔ اس وقت کوئی صبح کے ساڑھے دس بجے تھے۔ کیبن میں کوئی پورٹ ہول نہیں ہے اس لیے بجلی بجھا دینے کے بعد بالکل اندھیرا ہو گیا۔ قریب ہی نیچے جہاز کی زبردست مشینیں ہیں۔ ان کی دھڑ دھڑاہٹ نے لوری کا کام دیا اور بہت جلد ہی میں سو گیا۔ آنکھ جب کھلی تو حسب معمول اندھیرا تھا، اٹھ کر روشنی کی، پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ (گھڑی میں کوک دینی بھول گیا تھا اور وہ گیارہ بجا کر بند ہو گئی

تھی) گھنٹی بجا کر ملازم کو بلایا جو فرانسیسی ہے اور انگریزی واجبی ہی واجبی جانتا ہے۔ اس سے پوچھا کہ کھانے کا وقت ہو گیا تو اس نے کہا کہ ہاں سب مسافر ڈائننگ روم میں جمع ہیں۔ جلدی سے منہ دھو کر کپڑے بدل کر کھانے کے کمرے میں پہنچا تب معلوم ہوا کہ دوپہر کا نہیں رات کا کھانا ہو رہا ہے۔

یہ جہاز فرانسیسی کمپنی کا ہے اور تمام دنیا میں اس سے بڑا یا اس سے زیادہ آرام دہ جہاز کوئی نہیں ہے۔ اس کا وزن 82 ہزار ٹن ہے۔ جب یہ خیال کیا جائے کہ ''کونٹے ورڈے'' جس سے میں بمبئی سے روانہ ہوا تھا اور جو اچھا بھاری جہاز سمجھا جاتا ہے فقط 22 ہزار ٹن وزنی ہے تب نورمنڈی کی جسامت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس جہاز پر تین چار ہزار مسافر سا سکتے ہیں مگر اس دفعہ تقریباً خالی ہے سوائے تیسرے درجے کے اور سب درجوں میں بہت کم مسافر ہیں۔ معلوم ہوا کہ نیویارک سے روانہ ہونے کے دو گھنٹے پہلے جب لوگوں نے صبح کے اخباروں میں یہ خبر پڑھی کہ یورپ میں جنگ کا امکان ہے تو سینکڑوں مسافروں نے اپنا سفر ملتوی کر دیا۔

ہندوستانی لڑکی:

یکم ستمبر — جہاز پر ہر شخص جنگ کے امکانات پر بحث کر رہا ہے۔ امریکن جو تجارت کی غرض سے یورپ جا رہے ہیں، پریشان ہیں کہ کبھی وہ جنگ کے طوفان میں نہ پھنس جائیں۔ جہاز کا اخبار جو روز شائع ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہٹلر چیکوسلوواکیا میں جنگی مداخلت کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ہر ملک سے فوجی نقل و حرکت کی خبریں آ رہی ہیں۔ ذاتی طور سے مجھے کوئی خاص پریشانی نہیں ہے۔ اخبار نویس کی اس سے زیادہ کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے کہ ایسے تاریخی اور نازک لمحے میں وہ موقعہ واردات پر موجود ہو۔ دن بھر میں تو اطمینان سے بیٹھا ہوا اپنے مضامین مکمل کرتا رہا۔ حالانکہ یہ بھی یقین نہیں ہے کہ جب تک ہم فرانس پہنچیں گے، ڈاک ہندوستان بھیجی جا سکے گی یا نہیں۔

ہمارے درجے کے مسافروں میں ایک ہندوستانی لڑکی بھی ہے جو بمبئی کی رہنے والی ہے اور کیمبرج یونی ورسٹی میں سائنس کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ گرمی کی چھٹیوں میں وہ امریکہ کی

سیر کرنے گئی ہوئی تھی۔ تمام مسافروں اور خصوصاً امریکنوں کو سخت تعجب ہے کہ ہندوستانی لڑکیاں اتنی تعلیم یافتہ اور آزاد ہو سکتی ہیں۔؟ وہ تو ہندوستانیوں کو اب تک وحشی اور جاہل ہی سمجھتے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ ایک بائیس برس کی ہندوستانی لڑکی نہ صرف فر اٹے سے انگریزی بولتی ہے بلکہ سائنس کی اعلیٰ تعلیم پائی ہے ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

شام کی چائے کے وقت چند امریکنوں نے مجھے اور اس لڑکی کو گھیر لیا اور ہندوستان، مہاتما گاندھی، کانگریس وغیرہ کے متعلق سوال کرنے شروع کر دیے۔ ان میں سے ایک امریکن ڈاکٹر تو ہندوستان سے بہت ہمدردی رکھتا ہے اور انگریزوں کی شہنشاہیت کا سخت مخالف ہے۔ مجھ سے کہنے لگا تم اگر کبھی اس سفر کے متعلق کتاب لکھو تو میرا ذکر ضرور کر دینا کہ ایک امریکن ہندوستان کی آزادی کا کتنا زبردست حامی ہے سو میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

ہیمنگوے:

یورپ کی صلیبی لڑائیوں CRUSADES میں عیسائیوں اور مسلمانوں کی فوجوں میں بھرتی ہونے کے لیے جوشیلے جوان دور دور سے آئے تھے۔ دونوں طرف مذہب کے نام لیوا (بلا قید رنگ و نسل) برسر پیکار تھے۔ آج بیسویں صدی میں مذہب کے بجائے سیاسی اور اقتصادی اصولوں کی ٹکر ہو گئی ہے۔ سوشلزم اور فاشیست کا مقابلہ ہے۔ اسپین میں مزدور، کسان اور طالب علم ہٹلر اور مسولینی کے زرخرید سپاہیوں سے جہاد کر رہے ہیں۔ کہنے کو یہ خانہ جنگی ہے مگر دراصل اسپین کے میدان میں ایک بین الاقوامی معرکہ ہو رہا ہے۔ اگر فاشی زمینداروں، سرمایہ داروں اور پادریوں کی مدد کے لیے ہٹلر اور مسولینی کھلے بندوں فوجیں اور ہتھیار بھیج رہے ہیں تو دوسری طرف بھی روپیہ اور ہتھیاروں کی کمی ہو مگر ہمدردوں اور رفیقوں کی کمی نہیں ہے۔ دنیا کے ہر ملک سے سوشلسٹ جوان مشکلوں کا مقابلہ کرتے ہوئے (گھر بیچ کر، ملازمت چھوڑ کر، پیدل چل کر، بغیر پاسپورٹ کے پہاڑوں کو عبور کر کے) اسپین کے کسانوں اور مزدوروں کی مدد کے لیے پہنچ گئے ہیں۔ اس بین الاقوامی فوج میں شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی، فلسفی بھی ہیں اور فلم بنانے والے بھی، انجینئر بھی اور اخبار نویس بھی وہ لوگ جنھوں نے ہمیشہ قلمی جنگ کی تھی۔ آج فاشیست

کے غول بیابانی کا مقابلہ کرنے کے لیے مشین گنیں چلا رہے ہیں۔ فلسفی اپنے فلسفہ کو جنگ کی کسوٹی پر پرکھ رہے ہیں اور شاعر اپنے خون سے انقلاب کے گیت لکھ رہے ہیں۔

ان بیسویں صدی کے مجاہدوں میں ارنسٹ ہیمنگوے کا نام ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ یہ امریکن ادیب اور افسانہ نگار شروع سے اسپین کی جنگ میں جمہوری فوجوں کی خدمت کر رہا ہے۔ اسی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ بین الاقوامی دستہ اتنا مضبوط اور طاقت ور ہو گیا ہے کہ کئی موقعوں پر اس نے فرینکو کی فوجوں کے چھکّے چھڑا دیے۔ چند ماہ ہوئے ہیمنگوے امریکہ روپیہ جمع کرنے آیا تھا اور اب اسی جہاز پر اسپین واپس جا رہا ہے۔ ہم لوگوں نے آج شام کو اس کی دعوت کی اور اپنے درجے میں اس کو باتیں کرنے کے لیے بلایا۔ کوئی دو گھنٹے تک گفتگو جاری رہی جس کے دوران میں ادب اور لٹریچر کا تذکرہ کم اور جنگ کا ذکر زیادہ رہا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص جس نے اپنی عمر ادبی کام میں گزاری، اب دفعتاً ایک جنگی ماہر بن گیا ہے۔ ہیمنگوے نے نقشہ کھینچ کر ہمیں بتایا کہ اسپین میں جمہوری اور فاشی فوجوں کی مقابلتاً کیا طاقت ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر جمہوری فوجوں کو بہت جلد ہتھیاروں کا کافی ذخیرہ نہ ملا تو وہ فرینکو کا مقابلہ کامیابی سے نہ کر سکیں گے۔ مگر ان کے پاس ہتھیار کہاں سے آئیں۔ جب برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی نام نہاد حکومتوں نے ان کو قیمتاً بھی ہتھیار دینے سے انکار کر دیا ہے اور دوسری طرف ہٹلر اور مسولینی برابر سپاہیوں اور ہتھیاروں سے فرینکو کی مدد کرتے رہتے ہیں۔

جنگ:

3 ستمبر — آج صبح سے کسی نے یہ افواہ پھیلا دی ہے کہ ہٹلر کی فوجیں چیکوسلوواکیا میں پہنچ گئی ہیں اور یورپ میں جنگ شروع ہو گئی ہے ہر شخص پریشان نظر آتا ہے۔ دوپہر کے قریب ایک جرمن جہاز ہماری مخالف سمت میں جاتا نظر آیا تو سب لوگ اس کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ گویا حملہ کا امکان تھا، ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ دو دن ہوئے جنگ شروع ہو گئی ہے مگر جہاز والے ہم سے یہ خبر چھپا رہے ہیں۔

4 ستمبر — صبح کے 6 بجے جہاز انگلستان کی بندرگاہ ساؤتھ ہمپٹن کے باہر ٹھہرا اور سب

انگریز مسافر اتر گئے۔ بعض لوگ مجھ سے بھی کہنے لگے تم بھی یہیں اتر جاؤ مگر میں نے کہا، میرے لیے انگلستان میں کوئی خاص کشش نہیں ہے۔ سامنے انگلستان کا سرسبز اور شاداب ساحل تھا اور میں ڈک پر کھڑا دل ہی دل میں کہہ رہا تھا یہی وہ ملک ہے جو ہندوستان کی قسمت کا مالک بنا ہوا ہے، کیوں؟ اور کب تک؟"

فرانس:

ساؤتھ ہمپٹن میں جہاز آدھ گھنٹے سے بھی کم ٹھہرا۔ یہاں سے روانہ ہو کر ہم ساڑھے دس بجے کے قریب فرانس کی بندرگاہ لاہاور پہنچ گئے۔ ساؤتھ ہمپٹن جب ہم پہنچے تھے تو سخت سردی تھی اور کہرا چھایا ہوا تھا مگر فرانس کا ساحل دھوپ میں چمک رہا تھا۔ بندرگاہ پر کافی بھیڑ تھی اور لوگ ٹوپیاں ہلا ہلا کر اپنے دوستوں اور عزیزوں کا خیر مقدم کر رہے تھے۔

یہی ہے وہ ملک، میں نے سوچا جہاں نپولین جیسے جرنیل، روسو اور زولا جیسے انقلابی مصنف پیدا ہوئے۔ جہاں ادب اور آرٹ نے دنیا میں سب سے زیادہ ترقی کی، جہاں حسن اور حسن شناسی کو تقریباً مذہب کا درجہ ملا، جہاں آزادی اور انقلاب کا علم بلند ہوا۔"

جہاز کے قریب ہی پیرس کی ریل لگی ہوئی تھی۔ فوراً اس میں سوار ہو گیا۔ ایک امریکن لڑکا جس سے جہاز پر دوستی ہو گئی تھی میرے ہمراہ ہے اور ہم نے طے کر لیا ہے کہ پیرس میں ساتھ ہی کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ اس لڑکے کا نام 'پارکر' ہے اور وہ آرٹ کی تعلیم حاصل کرنے فرانس آیا ہے۔

پیرس:

سرسبز اور شاداب مرغزاروں اور کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے ہماری ریل شام کے چھ بجے پیرس کے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ نئے شہر میں اترنا جہاں کی زبان سے بالکل ناواقف ہوں عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مگر پارکر کو کچھ ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی آتی ہے اور میں بھی ڈکشنری کی مدد سے دو چار الفاظ بولنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک ہم سفر نے ایک ہوٹل کا نام بتا دیا تھا۔ ٹیکسی میں سوار ہو کر وہاں پہنچے۔ ٹیکسی تو یہاں سستی ہے، مگر ہوٹل کی شکل دیکھ کر ہی روح فنا ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا کسی شاہی محل میں آگئے ہیں۔ خیر اب تو آ ہی گئے۔ اس لیے ایک دن تو ٹھہرنا ہی ہوگا دو چھوٹے چھوٹے

کرے لیے۔ تب بھی معلوم ہوا کہ ایک دن کا کرایہ تقریباً بارہ روپے فی کس دینا ہوگا۔

پیرس کی شہرت کی وجہ یہاں کی رنگین تفریح گاہیں ہیں۔ ناچ گھر، کیبرے CABARE نائٹ کلب NIGHT CLUB اور قحبہ خانے۔

میں نے اور پارکر نے طے کیا کہ سب سے پہلے پیرس کی ان تفریح گاہوں کی سیر کرنی ہے۔ ہوٹل میں کپڑے بدل کر اور کھانا کھا کر سیر کے لیے روانہ ہو گئے۔

ننگا ناچ:

رقص عریاں تو ایک شاعرانہ اور حسین منظر کا خیالی نقشہ پیش کرتا ہے مگر روزمرہ کی زبان میں اس کو ننگا ناچ کہیے تو کراہیت آتی ہے۔ پیرس کے سب سے زیادہ مشہور ناچ گھر FOLIES BERGERE میں جا کر ہم نے تماشہ دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس جگہ کو آرٹ یا حسن سے دور کی بھی مناسبت نہیں ہے۔ اسٹیج پر آدھی ننگی، تین چوتھائی ننگی اور پوری مادر زاد ننگی لڑکیوں کے گروہ آ کر اچھل کود کرتے رہے۔ نہ ان کے ناچ میں کوئی ہم آہنگی تھی نہ کوئی معنی۔ نہ حرکت میں حسن، نہ موسیقی میں ترنم، نہ جنت نگاہ، نہ فردوس گوش ہاں انسانی جسم کی ادنیٰ ترین نمائش تھی۔ ایک قسم کا جوش اور بے خودی ضرور تھی مگر جوش حیوانی تھا اور بے خودی ایسی تھی جیسی کہ افریقہ کے جنگلی آدم خوروں کے ناچ میں ہوتی ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ ننگی عورتوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر معلوم ہوا کہ برہنگی حسن میں اضافہ نہیں کرتی بلکہ رہی سہی خوب صورتی کو بھی زائل کر دیتی ہے۔ یہ ننگی عورتیں نسوانی حسن کے نمونے نہیں بلکہ گوشت کے حرکت کرتے ہوئے لوتھڑے معلوم ہوتی تھیں، ممکن ہے یہ نظارہ بعض لوگوں کی جنسی خواہشات کو تسکین دیتا ہو۔ ہم دونوں کا تو جی متلانے لگا۔

اس ناچ گھر میں ایک بات دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ تماشائی تقریباً تمام غیر ملکی تھے۔ انگریز، امریکن، جرمن، ہندوستانی، عرب مگر ہزار میں شاید پندرہ بیس بھی فرانسیسی نہیں تھے۔ دوسرے ناچ گھروں وغیرہ میں بھی یہی حال دیکھا۔ اصل بات یہ ہے کہ فرانسیسی خود اتنے عیاش نہیں ہیں جتنا کہ وہ سمجھے جاتے ہیں۔ بعض ہندوستانیوں نے جو مدت سے فرانس میں رہتے ہیں مجھے بتایا کہ عام فرانسیسیوں کی اخلاقی حالت انگریزوں اور امریکنوں وغیرہ سے کہیں بہتر ہے۔ مگر اس

دعوتیں بھی اڑائیں۔ لاہور کے ڈاکٹر وحید اور کلکتہ کے ڈاکٹر گھوش کی خاص نوازش رہی۔ وحید صاحب کے ہاں مدت کے بعد سموسے کھانے کو ملے اور ہندوستان کی یاد تازہ ہوگئی۔

کارآمد شعبے:

وحید صاحب اور گھوش صاحب سے باتیں کرنے پر معلوم ہوا کہ گو، امن قائم کرنے میں انجمن اقوام بالکل ناکام ثابت ہوئی ہے۔ مگر اس کے دوسرے شعبے کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً بین الاقوامی مزدوروں کا دفتر INTERNATIONAL LABOUR OFFICE ایسا محکمہ ہے جو دنیا کے مزدوروں، ان کی مزدوری اور ان کے دوسرے مسائل کے متعلق مفید معلومات جمع کرتا ہے اور اس کی سالانہ کانفرنس میں مختلف حکومتوں، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے نمائندے جمع ہوتے ہیں۔ اس کانفرنس کی وجہ سے دنیا کے مزدوروں کی تکالیف میں تھوڑی بہت کمی ضرور ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے شعبوں میں نشہ آور چیزوں کی روک تھام کے متعلق کام ہوتا ہے۔ کوڑھ اور دق جیسی مہلک بیماریوں کے علاج کے لیے تحقیقات ہوتی ہیں اور لاکھوں غریب الوطن لوگوں کی امداد کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔

تین سوئٹزرلینڈ:

21 ستمبر۔ سوئٹزرلینڈ بھی عجیب ملک ہے۔ اتنا چھوٹا ہے، جیسے ہندوستان کا معمولی سا ایک صوبہ، پھر بھی یہاں تین مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جرمن، فرانسیسی اور اٹالین اور اب ایک چوتھی پرانی زبان بھی زندہ کی جارہی ہے۔ تین مختلف نسلیں آباد ہیں اور تین مختلف مذہبوں کے پیرو بستے ہیں۔ رومن کیتھولک، پروٹسٹنٹ اور یہودی۔ پھر بھی سوئزرلینڈ متحدہ ملک ہے۔ سوس قوم ایک ہے۔ آپس میں کوئی جھگڑے نہیں ہوتے اور نہ کوئی یہ کہتا ہے کہ سوئٹزرلینڈ خودمختار ہونے کے قابل نہیں ہے۔ پارلیمنٹ میں تین زبانوں میں تقریر ہوتی ہیں۔ ریل کے ٹکٹ تین زبانوں میں چھپے ہوتے ہیں اور ہر پڑھا لکھا کم از کم دو زبانیں بول سکتا ہے۔

کل دوپہر کو میں جنیوا سے روانہ ہوا۔ جنیوا سوئٹزرلینڈ کے فرانسیسی حلقے میں ہے۔ تین گھنٹے کے بعد ریل جس علاقہ سے گزری وہاں جرمن بولی جاتی ہے۔ اسٹیشنوں پر جرمن میں نام لکھے ہوتے ہیں۔ اب میں زورچ کے شہر میں ہوں اور یہاں بھی جرمن بولی جاتی ہے۔ مگر یہاں

کے باشندوں میں جرمنی اور ہٹلر کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ نازی چھوٹی آزاد قوموں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔

زورچ میں میں اپنے ایک قلمی دوست PEN-FRIEND کا مہمان ہوں جس سے پانچ برس پہلے طالب علمی کے زمانے میں خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ مدتوں تک ایک دوسرے کو خطوط کے ذریعہ جان کر واقعی ملاقات کرنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔

زورچ سوئٹزرلینڈ کی گھڑیوں کے کارخانوں کا سب سے بڑا مرکز ہے یہاں سے ہزاروں گھڑیاں روزانہ دنیا کے ہر ملک کو بھیجی جاتی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ بہت سی گھڑیاں بنتی یہاں ہیں مگر ان پر "MADE IN ENGLAND" "MADE IN FRANCE" وغیرہ لکھ کر بھیجا جاتا ہے۔

گھڑی سازی کے علاوہ سوئٹزرلینڈ کی سب سے بڑی صنعت دودھ مکھن اور پنیر کی ہے۔ جنیوا سے زورچ تک، میں دیکھتا آیا کہ تمام ملک میں سرسبز چراگاہوں میں گائیوں کے ریوڑ کے ریوڑ چر رہے ہیں، یہ گائیں سوئٹزرلینڈ کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ ان کو ہندوستان کی طرح گندے سڑے باڑوں میں نہیں رکھا جاتا بلکہ ان کے لیے صاف ستھرے روشن اور ہوا دار مکان بنے ہوئے ہیں۔ تعجب ہے کہ ہندوستان میں جہاں گائے کو ایک مقدس ہستی سمجھا جاتا ہے اتنی بری طرح سے رکھا جاتا ہے اور برخلاف اس کے یہاں ان کی اتنی آؤ بھگت ہوتی ہے۔

ہم اور وہ:

22 ستمبر — آج صبح زورچ سے وینس کے لیے روانہ ہوا۔ زورچ سے چند اسٹیشن بعد سوئٹزرلینڈ کا اٹالین علاقہ شروع ہوگیا۔ یہاں اٹالین زبان بولی جاتی ہے اور اطالوی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ بہت دیر تک میں یہ سوچتا رہا کہ اگر تین مختلف نسلیں سوئٹزرلینڈ جیسے چھوٹے سے ملک میں صلح اور شانتی سے رہ سکتی ہیں تو ہم ہندو اور مسلمان ہندوستان میں امن سے کیوں نہیں رہ سکتے۔ اگر جرمن اور اٹالین اور فرانسیسی زبانوں کے بولنے والے اس ملک میں ایک دوسرے کی مخالفت نہیں کرتے تو آخر ہم ہندی اردو کے جھگڑے کیوں کھڑے کرتے ہیں۔ اگر یہاں یہودی، رومن، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دوسرے کا سر نہیں پھوڑتے تو آخر ہم ہی فرقہ پرستی کی وبا میں کیوں مبتلا ہیں؟

☆ عام لوگ آپس کے میل ملاپ میں اتنا ہی تکلف برتتے ہیں جتنا کہ لکھنؤ والے۔

☆ لندن کے شام کے اخبار گھنٹہ بھر میں ہوائی جہاز سے یہاں پہنچ جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔

☆ ہر تیسرا آدمی جو آپ کو سڑک پر نظر آتا ہے وہ انگریز ہوتا ہے یا امریکن۔

☆ ننگا ناچ دیکھنا یا سڑک پر بیٹھ کر شراب پینا عیب نہیں سمجھا جاتا مگر اتوار کو گرجا نہ جانا گناہ ہے۔

☆ شاہی محلوں کے باغات میں انقلاب پرستوں کے مجسمے نصب ہیں اور کالجوں کے برابر میں قحبہ خانے ہیں۔

☆ لمبے لمبے بالوں والے آرٹسٹ ہر جگہ بیٹھے نظر آتے ہیں اور بہانہ ملتے ہی آپ کے ساتھ کھانا کھانے یا شراب پینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

☆ بعض قہوہ خانوں میں سینکڑوں قیمتی اور نادر تصویریں لگی ہیں جو بھوکے مصوروں نے کھانے اور شراب کے عوض کوڑیوں کے مول بیچ دیں۔ پیرس کو پیرس والے پیرس نہیں کہتے 'پاری' کہتے ہیں۔

جنیوا:

19 ستمبر — رات کو پیرس سے روانہ ہوا اور صبح کو سوئزرلینڈ کے مشہور شہر جنیوا پہنچ گیا۔ چھوٹا سا خوب صورت شہر ہے۔ جھیل کے کنارے پہاڑیوں سے گھرا ہوا۔ اگر نینی تال اتنا صاف ستھرا ہوتا تو ہندوستان کا جنیوا کہلایا جا سکتا ہے۔

جنیوا ایک تاریخی شہر ہے۔ یہاں کشیدہ کاری کا کام بہت اچھا ہوتا ہے، یہاں کی بنی ہوئی گھڑیاں دنیا بھر میں بکتی ہیں۔ مگر اس شہر کی شہرت ان وجوہات سے نہیں ہے بلکہ اس لیے کہ یہ انجمن اقوام یعنی LEAGUE OF NATIONS کا صدر مقام ہے۔

آج کل یہاں پچاس قوموں کے نمائندے آئے ہوئے ہیں کیونکہ لیگ اسمبلی کا جلسہ ہو رہا ہے۔ ہر بڑے ہوٹل پر ان تمام ملکوں کے جھنڈے لگے ہوئے ہیں جن کے نمائندے وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پہلے ہی روز میں اخبار کے نمائندے کی حیثیت سے لیگ اسمبلی کا جلسہ دیکھنے گیا۔ عمارت شاندار ہے اور بس۔ وہی پرانی طوطے کی طرح رٹی ہوئی تقریریں سننے میں

آ ئیں۔ اسپین اور چین کے نمائندوں نے اپنی مظلوم قوموں کی فریاد سے کسی قدر گرما گرمی پیدا کر دی۔ مگر موٹے موٹے پیٹ بھرے سیاست داں ان تقریروں کو سن کر پھر اپنے گدے دار کوچوں پر ٹانگیں پسار کر اسی طرح سو گئے جس طرح نئی دہلی میں اپنی اسمبلی کے ممبر سو جاتے ہیں۔ انجمن اقوام کو جگانے کے لیے تقریروں کی نہیں شاید ایک عالمگیر انقلاب کی ضرورت ہے۔

انجمن اقوام کے بیکار محض ہونے میں اگر کوئی شبہ تھا تو وہ یہاں آ کر دور ہو گیا۔ اسپین کے نمائندے نے کیا خوب فقرہ کہا۔ ''پنجرہ نیا اور پرندہ مردہ'' دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے یہ انجمن قائم کی گئی تھی۔ حبش کو اٹلی ہڑپ کر گیا اور اس انجمن کے کان پر جوں نہ رینگی۔ جرمنی اور اٹلی کی سازشوں سے اسپین کا خاتمہ ہو گیا اور یہاں تقریریں ہی ہوتی رہیں۔ جاپان چین کو ہڑپ کیے جا رہا ہے اور یہاں ہمدردی کا کوئی ریزولیشن بھی پاس نہیں ہوا۔ جرمنی چیکوسلوواکیا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہضم کر رہا ہے اور دنیا بھر کو جنگ کی دھمکیاں دے رہا ہے مگر لیگ کے نمائندے اطمینان سے سگار پی رہے ہیں۔

ہندوستان سے تین نمائندے آئے ہیں نام نہاد نمائندے، سر سلطان احمد، سر این۔ این سرکار۔ سر شنم سکھم چیٹی۔ سب اچھے معقول آدمی ہیں۔ ہم ہندوستانی اخبار نویس ان کی بڑی خاطر کرتے ہیں۔ مگر ہندوستان کی آواز لیگ کے ایوان میں پہنچانے سے معذور ہیں۔ کہتے وہی ہیں جو برطانوی نمائندے ان کو بتا دیتے ہیں۔ جدھر وہ ہاتھ اٹھاتے ہیں ادھر ہی یہ ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔

جواہر لال:

پنڈت جواہر لال نہرو بھی چند روز کے لیے جنیوا آئے ہوئے ہیں، کئی بار ملاقات ہوئی۔ پہلے روز میں نے غلطی سے پوچھ لیا۔ ''کیا آپ بھی لیگ اسمبلی کا جلسہ دیکھنے جائیں گے'' بس بگڑ گئے۔ کہنے لگے۔ ''تم سمجھتے ہو میں اس لغو اور لچر جماعت کا جلسہ دیکھنے جاؤں گا۔'' پھر بعد میں ان کی قیام گاہ پر ملا تو بہت دیر تک بین الاقوامی سیاست پر باتیں کرتے رہے۔ مجھ سے امریکہ اور نوجوانوں کی کانفرنس کا حال پوچھتے رہے۔ میں نے پہلی بار جواہر لال کو سوٹ پہنے دیکھا۔ گورا رنگ ہونے کی وجہ سے بالکل یورپین معلوم ہوتے ہیں۔

لیگ کے دفتر میں چار ہندوستانی ملازم ہیں۔ ان سب سے ملاقات ہوئی۔ کئی کے ہاں

بروم فیلڈ پیرس سے پندرہ میل کے فاصلے پر ایک نہایت خوب صورت گاؤں اور سان لی SEN LHEIS میں رہتے ہیں۔ گو وہ امریکن ہیں مگر سال کا زیادہ عرصہ پیرس میں گزارتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب جی چاہتا ہے دنیا کا سفر کر آتے ہیں۔ بروم فیلڈ کے ایک ناول "THE RAINS CAME" ہی کی پچاس ہزار جلدیں فروخت ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا فلم بھی بن گیا ہے اور اس کا کافی معاوضہ ملا۔ اس لیے بروم فیلڈ کافی آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں مگر میاں بیوی دونوں حد درجہ مہمان نواز اور ملنسار ہیں۔ تمام امریکنوں کی طرح صاف گو اور سادہ مزاج اور بے تکلف ہیں۔

مجھے دونوں نے پہچان لیا بلکہ اپنے البم میں ہم لوگوں کی وہ تصویریں بھی دکھائیں جو انھوں نے علی گڑھ میں لی تھیں۔ گھنٹوں ہندوستان کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ ہمارے ملک سے ان دونوں کو بے حد محبت ہے۔ اس قدر کہ اپنے مکان کی دیواروں پر مسز بروم فیلڈ نے ہندوستان کے رنگین نظارے پینٹ کر رکھے ہیں۔

فرانسیسی شہنشاہیت:

بروم فیلڈ کے ساتھ میں فرانسیسی شہنشاہیت کا ایک تماشہ دیکھنے گیا۔ سان لی میں فرانس کی مراقشی اور افریقی فوج کی چھاونی ہے۔ اس فوج کا سالانہ معائنہ اور گھوڑ دوڑ وغیرہ کے کھیل تھے۔

ہندوستان میں ہم لوگوں کو عام طور سے یہ نہیں معلوم کہ انگریزوں کی طرح فرانس کی سلطنت بھی افریقہ اور ایشیا میں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ گو فرانس کے مقبوضات میں کوئی ہندوستان جیسا زبردست ملک تو نہیں ہے مگر پھر بھی شمالی افریقہ میں فرانس کا جھنڈا ہزاروں مربع میل پر لہراتا ہے۔ ان ملکوں میں بھی قوم پرستوں کے ساتھ برا سلوک ہوتا ہے۔ وہاں بھی سودیشی صنعتوں کو تباہ کر کے فرانسیسی سرمایہ داروں کے لیے میدان صاف کیا جاتا ہے وہاں بھی فرانسیسی حاکموں کو بیجا اور جابرانہ اختیارات حاصل ہیں اور ملکی آبادی پر اکثر ظلم ہوتا ہے۔

مگر انگریزی شہنشاہیت اور فرانسیسی شہنشاہیت میں ایک بڑا فرق ہے انگریز اپنی سلطنت میں ہمیشہ حاکموں کی طرح الگ تھلگ رہتے ہیں۔ غیر ملکیوں سے کبھی سماجی اور ذاتی تعلقات نہیں پیدا کرتے۔ نہ اپنی خاص وضع قطع اور قومی خصوصیات چھوڑتے ہیں۔

لطیفہ:

مشہور ہے کہ انگریز افسر افریقہ کے جنگل میں بھی رات کو کھانا کھانے اکیلا بیٹھتا ہے تو رواج کے مطابق کھانے کا کالا لباس ضرور پہنتا ہے۔ اس کے برخلاف فرانسیسی جو مقبوضات اور نوآبادیات میں سرکاری افسر یا تاجروں کی حیثیت سے جاتے ہیں وہ وہاں کے لوگوں کا لباس اور آہستہ آہستہ ان کی دوسری عادتیں اور خصوصیات اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ مراقشی اور الجیرین عورتوں سے شادی کر لیتے ہیں۔

سان لی کی چھاؤنی میں دیکھا کہ مراقشی فوج کے فرانسیسی افسر بھی وہی وردی پہنتے ہیں جو ان کے سپاہی۔ یعنی لال ترکی ٹوپی، شلوار نما پاجامہ اور عبا۔ ان سپاہیوں کی شہسواری اور تلوار کے کھیل دیکھنے کے لیے ہزاروں تماشائی جمع تھے۔ یہ کالی فوج پیرس میں دو غرض سے رکھی گئی ہے۔ اول تو اپنی سلطنت کی شہرت کرنے کے لیے تاکہ ہر ایک کو یاد رہے کہ فرانسیسی افریقہ کے ملکوں پر بھی حکومت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ فرانسیسی حکومت کو یہ بھی خطرہ ہے کہ کبھی ملک میں سوشلسٹوں یا کمیونسٹوں نے انقلاب پیدا کیا تو ممکن ہے فرانسیسی فوج ان کے ساتھ ہو جائے، ایسی حالت میں یہ کالی فوج سفید سرمایہ داروں کی حفاظت کرے گی۔

انوکھا شہر:

پیرس وہ شہر ہے۔ جہاں:

☆ سڑکوں اور گلیوں کے نام نہ صرف بادشاہوں، وزیروں، جرنیلوں اور سیاست دانوں کے نام پر رکھے جاتے ہیں بلکہ شاعروں، ادیبوں اور فلسفیوں کے نام پر بھی۔

☆ فحش تصویریں گرجاؤں کی سیڑھیوں پر بکتی ہیں۔

☆ لوگ بلا تکلف پولیس والے سے قحبہ خانوں کا پتہ دریافت کر سکتے ہیں۔

☆ شراب کھانے کے ساتھ مفت ملتی ہے۔ مگر پانی مشکل سے ملتا ہے اور اکثر اس کی قیمت دینی پڑتی ہے۔

☆ موٹریں اور گاڑیاں سڑک کے بائیں بازو کے بجائے دائیں بازو چلتی ہیں۔

کمرے سے کپڑے آئے اور یہ حضرت ہوٹل میں داخل ہو پائے۔ بیوی کو انھوں نے اپنے کپڑے گم ہونے کی کیا وجہ بتائی یہ نہیں معلوم مگر سب سے زیادہ دلچسپ قصہ پنجاب کے ایک مشہور اردو شاعر کا ہے جو ایک ناچ گھر میں تماشہ دیکھنے گئے اور برہنہ لڑکیوں کا غول کا غول دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔

امن یا جنگ:

13 دسمبر— کل رات ایک تاریخی رات تھی۔ امن یا جنگ؟ اس سوال کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ تمام دنیا اور خصوصاً پیرس کی آبادی ہٹلر کی تقریر کا انتظار کر رہی تھی۔

شام کے پانچ بجے سے پیرس والے اپنے اپنے گھروں سے نکل کر یا سڑکوں پر گھوم رہے تھے یا ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں بیٹھے ہوئے انتظار کی گھڑیوں کو باتیں کر کے کاٹ رہے تھے۔ جابجا مختلف سیاسی خیالات کے ماننے والوں میں بحث مباحثے جاری تھے، سرمایہ دار اور دوکاندار، کلرک اور طالب علم، آرٹسٹ اور مزدور، سپاہی اور حسن فروش عورتیں ہر ایک کے دماغ میں صرف ایک سوال چکر لگا رہا تھا۔ امن یا جنگ؟ دس بارہ دن سے تمام دنیا کے سامنے یہ سوال درپیش تھا اور آج اس کا جواب ملنے والا تھا۔

کئی دن سے سپاہیوں سے بھری ہوئی ریلوے ٹرینیں مغربی سورچے کی طرف جا رہی تھیں۔ فوج میں بھرتی ہونے کے اعلان جابجا لگے ہوئے تھے۔ ہر گھر میں حکومت کی طرف سے شائع شدہ ہدایات لگی ہوئی تھیں کہ ہوائی حملہ کی صورت میں شہریوں کو کیا کرنا چاہیے اور جہازی کمپنیاں آپ کو ٹکٹ فروخت کرتے وقت یہ شرط لگاتی تھیں۔ ''کہ اگر اس وقت تک جنگ نہ شروع ہوگئی۔'' میں چند اور لوگوں کے ساتھ موٹر میں شہر کے تاریخی مقاموں کی سیر کو گیا ہمارے گائڈ GUIDE نے وہ گرجا دکھایا جس پر پچھلی جنگ میں جرمن گولے آ کر پڑے تھے۔ جب ہم نے گرجا کی دیوار میں گولوں کے سوراخ دیکھے تو سب جنگ کے ہیبت ناک امکانات کا خیال کر کے دفعتاً خاموش ہو گئے اور آج آخر کار یہ معلوم ہی ہو جائے گا کہ امن یا جنگ؟

سات بجے کے قریب شام کے اخباروں میں ہٹلر کی تقریر شائع ہوئی۔ لوگ جو انتظار

کرتے کرتے تقریباً دیوانے ہو گئے تھے۔ اخبار بیچنے والے لڑکوں پر اس طرح جھپٹے جیسے بھوکے بھیڑیے شکار پر گرتے ہیں۔ مگر یہ تقریر پڑھ کر کسی قدر مایوسی ہوئی، نہ جنگ کا فوری اعلان تھا نہ امن کا وعدہ مگر اس وقت پیرس والے ہٹلر کی تقریر کے سیاسی پہلوؤں پر غور نہیں کر رہے تھے۔ اس وقت تو بس یہی خیال تھا کہ فی الحال جنگ نہیں ہوگی۔ ایک مہینہ، ایک ہفتہ یا ایک دن کچھ عرصہ کے لیے امن ضرور رہے گا۔ عورتیں جو اپنے بیٹوں یا شوہروں کی جدائی کے خیال سے ہراساں بیٹھی ہوئی تھیں عارضی امن کی خبر سن کر خوشی کے آنسو رو دیں۔ ناچ گھر، قہوہ خانے اور ہوٹل جشن منانے والوں سے بھر گئے۔ ہر طرف سے گانے کی آواز سنائی دی۔ کل جو بھی ہو، آج تو کم از کم خوشی منانے کے لیے، محبت کرنے کے لیے، شراب پینے کے لیے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہنسنے بولنے کے لیے، اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر گپ مارنے کے لیے وقت تھا۔

یہ تو رات کا حال تھا، آج صبح سورج کی روشنی میں ہٹلر کی تقریر پڑھ کر یقین نہیں ہوتا کہ امن کی گھڑیاں دراز ہوں گی۔ اخباروں میں پھر ہٹلر کی فوجوں کی نقل و حرکت کی خبریں ہیں۔ جنگ کا منحوس سایہ یورپ پر ابھی تک چھایا ہوا ہے۔

بروم فیلڈ:

پیرس کا قیام مسٹر اور مسز لوئی بروم فیلڈ LOUIS BROMFIELD سے ملاقات کے لیے بھی یادگار رہے گا۔ مسٹر بروم فیلڈ ایک مشہور امریکن مصنف اور ناول نویس ہیں، چھ برس پہلے میں ان سے علی گڑھ میں ملا تھا، جہاں وہ ہندوستان کی سیر کے دوران میں ہفتہ بھر کے لیے ٹھہرے تھے، اس کے بعد وہ ہندوستان کئی بار گئے اور کل ملا کر دو برس مختلف شہروں میں قیام کیا، ہر قسم کے ہندوستانیوں سے ملے اور ہر طبقے میں اپنے دوست بنائے۔ یہاں تک کہ بڑودہ میں خاص شہر کے وسط میں ایک مکان لے کر بالکل ہندوستانی طرز پر چھ مہینے تک رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک ناول "THE RAINS CAME" کے نام سے لکھا جو ہندوستان کی ایک فرضی ریاست کے متعلق ہے۔ اس ناول کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بروم فیلڈ کو ہندوستان اور ہندوستانیوں سے کتنی ہمدردی ہے اور ان کے سماجی مسئلوں کا انھوں نے کتنی گہری توجہ سے مطالعہ کیا ہے۔

مسولینی کا ملک:

سہ پہر کو ریل اٹلی کی سرزمین میں داخل ہوئی۔ سرحد پر سب مسافروں کے سامان کی تلاشی ہوئی۔ میرے ساتھ جو انگریزی زبان کے اخبار تھے وہ سب شبہ کی نظر سے دیکھے گئے اور ضبط کر لیے گئے۔ فاشی اٹلی میں انگریزی ادبی رسالے بھی مشتبہ سمجھے جاتے ہیں۔ سچ ہے کہ فاشی اور نازی راج میں پریس اور پبلک کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔

اسی سرحد کے اسٹیشن پر خود مسولینی کے چہرے نے میرا استقبال کیا۔ دیواروں پر اٹلی کے اس جابر حکمراں کی تصویریں جا بجا لگی ہوئی تھیں، ہر اخبار کے پہلے صفحہ پر یہی تصویر نظر آتی تھی۔ آگے نکلا ہوا خوفناک جبڑا۔ فاشی سلام کے انداز میں ہاتھ اٹھا ہوا۔ کوئی شبہ نہیں کہ اب میں مسولینی کی حکومت میں ہوں۔ جا بجا فوجی یونیفارم پہنے نوجوان افسر اکڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، بات چیت کرنے میں کرخت، غیر ملکیوں سے ان کا سلوک اتنا خراب ہے کہ ایک امریکن ہم سفر نے کہا کہ جی چاہتا ہے دوسری ٹرین سے واپس چلا جاؤں۔ میں نے سوچا کہ کیا یہ فرعون بے سامان جن کو بات کرنے کی تمیز نہیں یونان اور روم کی تہذیب کے جانشین ہیں۔

چھوٹا مسولینی:

میلان سے ریل بدل کر میں وینس کے لیے روانہ ہوا۔ ٹرین میں دو تین اٹالین ہم سفر مل گئے جو انگریزی جانتے تھے، دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ان میں سے ایک تو مسولینی کا زبردست حامی تھا، برطانیہ اور فرانس کا سخت مخالف' آخر ہم نے حبش پر قبضہ کر لیا تو کیا ہوا آخر برطانیہ نے بھی تو آدھی دنیا میں اپنی سلطنت پھیلا رکھی ہے۔' میں نے اس سے کہا کہ برطانیہ کی سلطنت بھی خاتمہ کے قریب ہے اور شہنشاہیت کا پورا نظام بہت جلد فنا ہو جائے گا۔ یہ سن کر وہ خوش نہیں ہوا اور کہنے لگا کہ سفید قوموں کے لوگ ہمیشہ سیاہ قوموں پر حاکم رہیں گے۔

جب تک یہ شخص چلا چلا کر اور ہاتھ ہلا کر مجھ سے باتیں کر رہا تھا باقی مسافر خاموش بیٹھے اس کو سن رہے تھے۔ مگر ان کی خاموشی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی رائے سے متفق نہیں ہیں۔ جب اس نے زور شور سے یہ کہا کہ مسولینی نے اٹلی کے غریبوں کی بڑی خدمت کی ہے تو میں نے

ان سے پوچھا کہ یہ صحیح ہے۔ مگر انھوں نے نہ ہاں کہا نہ نہیں۔ ہم سیاسی باتیں نہیں کرنا چاہتے مسولینی کے غلاموں کو آزادیٔ رائے نصیب نہیں ہے۔

وینس

24 ستمبر ــ دنیا بھر کے لوگوں کی عادت ہے کہ پرانے شہروں اور پرانی عمارتوں کی خواہ مخواہ پوجا کی جاتی ہے۔ جہاں کہیں پرانی اینٹوں کا ڈھیر نظر آیا شاعر اس کی شان میں قصیدے لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ وینس کی بڑی تعریف سنی تھی۔ ''جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا'' پرانے، گندے، اندھیرے مکان، تنگ و تاریک گلیاں اور تمام شہر میں سبزی مائل گندے پانی کی نہروں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ شاید اسی کا نام شہری حسن ہو، مجھے تو غربت اور گندگی کا مظاہرہ معلوم ہوا۔ عام لوگوں کی حالت...... ان کے پھٹے پرانے میلے کپڑے اور ان کے بوسیدہ مکان...... دیکھ کر ہندوستان کا دھوکا ہوتا ہے۔ بھک منگوں کی کثرت، ہر گلی کے نکڑ پر بیکاروں کے غول کے غول، ایک بیکار جو تھوڑی بہت انگریزی جانتا تھا میرے ساتھ ہولیا۔ کہنے لگا اگر تمھیں راستہ نہ آتا ہو تو میں تمہیں بندرگاہ، اسٹیشن یا ہوٹل جہاں جانا ہو وہاں پہنچادوں، مجھے بندرگاہ کا راستہ معلوم تھا۔ مگر باتیں کرنے کے لیے اس کو ساتھ لے لیا۔

بیکار کی کہانی:

راستہ میں میں نے اس سے پوچھا تم کیا کام کرتے ہو۔''

''کچھ نہیں۔''

''کب سے بیکار ہو؟''

''دو سال سے''

''حکومت کچھ مدد کرتی ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

''پھر کیسے گزارا کرتے ہو؟''

''اسی طرح غیر ملکی مسافروں کی ترجمانی کر کے۔''

''تمہاری طرح اور کتنے لوگ اس شہر میں بیکار ہیں۔؟''

''ہزاروں۔ دیکھتے نہیں ہو ہر گلی کے نکڑ پر بیکاروں اور بھکاریوں کی بھیڑ۔''

''مسولینی کی فاشیست کے متعلق تمھارا کیا خیال؟''

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اس نے ادھر ادھر گھبرا کر دیکھا کہ پولیس کا کوئی جاسوس ہمارا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے مگر گلی خالی تھی۔ صرف چند میلے کچیلے بچے نالی کے پاس کھیل رہے تھے۔ بیکار اٹالین نے نفرت سے تھوک کر کہا: ''کیا خیال ہے میرا، غریبوں اور مزدوروں کے قاتلوں کے متعلق کیا خیال ہو سکتا ہے۔ ملک کی تمام دولت فوج پر خرچ ہوتی ہے۔ لاکھوں غریبوں کو بھرتی کر کر کے افریقہ کے ریگستانوں میں مرنے کے لیے بھیج دیا جاتا ہے تاکہ مسولینی کی سلطنت کی شان بڑھے۔''

وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ دور سے ایک سپاہی آتا نظر آیا۔ بیکار نوجوان نے فوراً لہجہ بدل کر کہنا شروع کیا: ''یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ وینس دنیا کے خوب صورت ترین شہروں میں ہے۔ وہ آپ کے سامنے سینٹ مارکس کا شاندار گرجا ہے۔''

مسولینی کے وعدے:

اتنے عرصے میں ہم بندرگاہ پر پہنچ گئے، ہندوستان سے جہاز آکر کھڑا ہی ہوا تھا۔ میں نے کچھ پیسے دے کر اپنے اٹالین دوست کو رخصت کیا اور خود اپنے ہندوستانی دوست انور قریشی کی تلاش میں چلا، جہاز سے مسافر اتر ہی رہے تھے، نہ صرف انور سے ملاقات ہوئی بلکہ درجنوں ہندوستانی طالب علموں سے جو سب تعلیم کی خاطر انگلستان جا رہے ہیں۔ کئی علی گڑھ کے پڑھے ہوئے لڑکے ملے اور بندرگاہ ہی پر گلے ملنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

بین الاقوامی سیاسی حالت خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے وینس میں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ خیال کیا اور سب نے طے کیا کہ پہلی ٹرین سے پیرس چل دینا چاہیے۔

انور سے معلوم ہوا کہ اسی جہاز پر کئی سو اٹالین سپاہی مساوا سے آئے ہیں جو اٹالین مشرقی افریقہ کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ مگر تمام مسافروں کے ساتھ ان کو نہیں اتارا گیا۔ گھنٹہ بھر بعد جب بندرگاہ کا علاقہ تقریباً خالی ہو گیا تب ان سپاہیوں کو جہاز سے اترنے کی اجازت ملی۔ میں اور انور ایک طرف کھڑے ان کو دیکھتے رہے۔ افریقہ کی گرمی سے ان کے چہرے جھلسے ہوئے تھے۔ ان

کی وردیاں میلی اور ڈھیلی ڈھالی تھیں۔ ان میں سے اکثر بیمار معلوم ہوتے تھے۔ بعضوں کو اسٹریچر پر ڈال کر لایا گیا۔ ہم نے سنا کہ جب سپاہیوں کے دستے افریقہ کی نوآبادیات بھیجے جاتے ہیں تو ان کے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ مگر جب مسولینی کی ہوس کے یہ شکار واپس آتے ہیں تو ان کو چپکے سے چوروں کی طرح جہاز پر سے نیچے اتارا جاتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے، ان میں سے ہر ایک مسولینی کے فاشی نظام کی ناکامیابی کا زبردست ثبوت ہے۔ مسولینی نے اپنی قوم سے وعدہ کیا تھا کہ حبش کو فتح کرنے کے بعد ملک میں خوش حالی ہو جائے گی اور ہر بیکار کو کام مل جائے گا۔ مگر یہ وعدے اتنے ہی غلط ثابت ہوئے جیسے ہٹلر کے اپنی قوم سے کیے ہوئے وعدے، ان دونوں کا ایک دن ایک ہی حشر ہونے والا ہے۔

انگلستان:

28 ستمبر — وینس سے سیدھے پیرس اور پیرس سے سیدھے ہم لندن آ گئے۔ رود بار انگلستان کو ایک چھوٹے سے اسٹیمر میں عبور کیا۔ جس میں ہچکولوں کی وجہ سے سر میں خوب چکر آئے اور اکثر مسافر قے کرتے رہے۔ ڈوور کے ساحل کو دیکھ کر وطن پرست انگریزوں پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ مگر ہم چاک کی ان سفید چٹانوں کو دیکھ کر فقط یہ سوچتے رہے کہ کیا یہی وہ ملک ہے جس کے باشندے ہندوستان پر حکمراں ہیں۔ بالکل وہی کیفیت جو ساؤتھ ہیمپٹن کا ساحل دیکھ کر مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ ڈوور سے ریل میں سوار ہوئے۔ چار گھنٹے تک ایک ادھیڑ عمر کا انگریز جو شکل سے کوئی معمولی درجے کا تاجر یا کلرک معلوم ہوتا تھا میری برابر کی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ مگر مجھ سے ایک بار بھی بات نہیں کی، یہ انگریزی تہذیب ہے کہ بغیر تعارف کسی سے بات نہ کی جائے۔ برخلاف اس کے امریکہ میں جب کبھی میں نے ریل میں سفر کیا ایک دو ہی گھنٹے میں تمام مسافروں سے دوستی ہو جاتی تھی۔ شام ہوتے لندن پہنچے اور چند دوستوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے بورڈنگ ہاؤس میں قیام کیا۔

لینڈ لیڈی:

29 ستمبر — ہندوستان میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستانی طالب علم جو انگلستان تعلیم کی خاطر جاتے ہیں، وہ شریف انگریز گھرانوں میں رہ کر انگریزی معاشرت اور تمدن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ 'لینڈ لیڈی' کو ہم ایک باوقار مشفق اور مہربان خاتون سمجھتے تھے جو ایک ماں کی طرح

ہندوستانی طالب علموں کی نگرانی کرتی ہے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ بعض درمیانے درجے کی بیواؤں نے اپنے گزر اوقات کے لیے اپنے مکانوں میں ہندوستانی لڑکوں کو رکھنا گوارا کر لیا ہے۔ عام طور سے وہ خود جاہل اور بدتمیز ہوتی ہیں اور ان کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح بدھو ہندوستانی نوجوانوں سے زیادہ سے زیادہ پیسہ اینٹھا جائے۔ یہ بیچارے جو ہر انگریز اور انگریزی چیز سے مرعوب رہتے ہیں، لینڈ لیڈی سے بھی خوف کھاتے ہیں اور ان کی تجارتی اغراض کو انگریزی تہذیب پر محمول کرتے ہیں۔ آپ کسی دوست کو اپنے ساتھ کھانے کی دعوت نہیں دے سکتے اور اگر چائے کے دوران میں کوئی آجائے اور اس کے لیے ایک خالی پیالی منگائی جائے تو آپ کے بل میں چار آنہ کا اضافہ ہو جائے گا۔ بھلا ہو ہماری غلامانہ ذہنیت کا کہ ایک صاحب جو دو سال سے لندن میں مقیم ہیں مجھ سے کہنے لگے۔ ''ارے بھئی تم نہیں جانتے۔ انگریزی تہذیب یہی ہے۔ ہماری لینڈ لیڈی تو، اس کالڑکا ایک دن کے لیے ٹھہرنے کو آجائے تو اس سے بھی کرایہ وصول کرتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لعنت اس تہذیب پر۔''

کالا آدمی:

5 اکتوبر— لندن میں چند روز کے بعد ہی اپنی کھال کے رنگ کا احساس ہونا شروع ہو گیا۔ میں سمجھتا تھا کہ اب تو شاید سیاہ و سفید کی تمیز جاتی رہی ہوگی۔ مگر نہیں انگلستان کے مہذب ملک میں ہندوستانیوں، حبشیوں، چینیوں اور تمام رنگین قوموں کے لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو اب سے پہلے ہندوستان میں اچھوتوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ زبان سے تو بہت کم لوگ کہتے ہیں مگر جس طرح انگریز آپ کو دیکھتے ہیں۔ جس طرح زمین دوز ریل اور بسوں میں ایک ہندوستانی کے برابر والی سیٹ خالی رہتی ہے۔ جس طرح ایک ہندوستانی کے آتے ہی ہوٹلوں میں ایک کمرہ بھی خالی نہیں رہتا۔ وہ صاف صاف جتا دیتے ہیں کہ ہندوستانی ایک گھٹیا نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا قرب انگریزوں کو گوارا نہیں ہے۔

آج صبح میں اور چند دوست کسی مکان کی تلاش میں نکلے جہاں بہتر اور سستے کمرے مل سکیں۔ ایک مکان کے باہر بورڈ لگا تھا۔ ''ہوادار کمرے کرائے کے لیے خالی ہیں'' ہم نے دروازہ

کھٹ کھٹایا۔ایک نوکرانی نکل کر آئی۔

''ہم کمرے دیکھنا چاہتے ہیں'' میں نے کہا۔

''یہاں کوئی کمرہ خالی نہیں۔'' اس نے بدتمیزی سے جواب دیا اور دروازہ دھڑ سے بند کر لیا۔ہم آگے چلے۔

ایک اور مکان پر بورڈ نظر آیا۔''کرائے کے لیے کمرے خالی ہیں۔ یہاں بھی دستک دی۔ مالک مکان خود نکل کر آیا۔ یہ زیادہ صاف گو تھا۔اس نے کہا'' کمرے خالی ہیں مگر ہندوستانیوں کے لیے نہیں۔''

اسی طرح ہم نے دس بارہ مکان دیکھے مگر کہیں بھی ہمیں پناہ نہ ملی۔ تھکے ماندے واپس آئے اور سلطنت برطانیہ، اخوت، مساوات اور جمہوریت وغیرہ کے متعلق سوچتے ہوئے سو گئے۔لندن میں کالا آدمی نہیں چاہیے۔

لندن:

28 اکتوبر— مجھے لندن آئے پورا ایک مہینہ گزر گیا۔ایمان کی بات یہ ہے کہ نہ مجھے یہ شہر پسند آیا نہ میں نے اس کو اچھی طرح دیکھنے کی کوشش کی۔ممکن ہے کہ اپنے سیاسی عقیدوں کی وجہ سے میں لندن کے خلاف تعصب میں مبتلا ہوں۔ممکن ہے لندن میں خوب صورت عمارتیں ہوں۔مگر میں نے تو صرف دھوئیں سے کالے ہوئے بدصورت اور یکساں مکانوں کی قطاریں دیکھیں۔ممکن ہے یہاں بھی دل چسپ، رحم دل، مہمان نواز اور کالے گورے کی تفریق کو نہ ماننے والے انسان بستے ہوں مگر میں ان سے نہیں ملا(سوائے مشہور ناول نویس مس ایتھل مینن کے جو آرٹسٹ ہے اور سوشلسٹ۔ اس لیے لندن کی نمائندگی نہیں کر سکتی) ممکن ہے لندن کی زندگی میں بہت سی دلچسپ خصوصیات ہوں۔مگر میں ان کو کیسے دیکھ سکتا جب کہ میں نے زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزارا اور زیادہ باہر اس لیے نہیں نکلا کہ سڑک یا ہوٹل یا تھیٹر جہاں بھی جاؤں گا میرا کالا رنگ میری تحقیر کرائے گا۔

بہر حال لندن وہ شہر ہے جہاں:

☆ دنیا کا بدترین کھانا ملتا ہے۔صبح شام سوائے ابلے ہوئے گوشت اُبلے ہوئے آلو اور ابلی

ہوئی گو بھی کے اور کچھ نہیں نظر آتا۔ تمام شہر میں بہترین کھانا ہندوستانی ہوٹلوں میں ملتا ہے جو کافی تعداد میں ہیں۔

☆ زمین کے نیچے ریلوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اس ریل کا انتظام حیرت انگیز ہے۔

☆ بھیک مانگنا جرم ہے۔ مگر دھیلے کی دیا سلائی کی ڈبیا دو آنے میں فروخت کی جا سکتی ہے۔ سڑک کے کنارے اپاہج اور مفلس آرٹسٹ اپنی بنائی ہوئی تصویریں آٹھ آٹھ دس دس آنہ میں فروخت کرتے ہیں۔

☆ وزیر اعظم جو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا حکمراں ہے، ایک تنگ گلی میں ایسے چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے جس میں ہندوستان کے وائسرائے کا بینڈ ماسٹر بھی رہنے سے انکار کر دے گا۔

☆ بادشاہ اور ملکہ کی موٹر جب بازار سے گزرتی ہے تو وہ انتظام نہیں کیا جاتا جو ہمارے ملک کے گورنروں کے لیے کیا جاتا ہے۔

☆ ہائڈ پارک میں جا کر جس شخص کا جی چاہے تقریر کر سکتا ہے۔ اگر اس کو پانچ چھ سننے والے مل جائیں۔ اس کے بعد وہ اخبار میں وہ خبریں اور رائے پڑھ سکتا ہے جو لارڈ بیور برک اس کو پڑھوانا چاہتے ہیں اور ریڈیو پر وہ تمام باتیں سن سکتا ہے جو B.B.C کے لکھ پتی کرتا دھرتا اس کو سنانا چاہتے ہیں۔ اس کو کہتے ہیں آزادیِ رائے۔

☆ 'صفائی پسند' انگریز دن میں صرف ایک بار منہ دھوتے ہیں اور ہفتے میں ایک بار نہاتے ہیں۔ قمیض کا کالر روز تبدیل کرتے ہیں مگر قمیض جب پسینہ میں سڑ جائے تب ہی بدلی جاتی ہے۔ چھ چھ مہینے ایک ہی کالی پتلون میں گزار دیتے ہیں۔

☆ اخباروں میں زیادہ تر خبریں قتل، ڈاکے، زنا، بدکاری کے متعلق ہوتی ہیں۔ ہر قتل کی واردات کی تفصیل شائع کی جاتی ہے اور ہندوستان کی اہم ترین خبریں ایک دو سطروں میں ٹال دی جاتی ہیں۔

○

چوتھا حصہ

بیس دن میں سات ملک

ہیل ہٹلر:

پیرس 5 نومبر — سمندر کے راستے تو ہندوستان سب ہی واپس جاتے ہیں۔ میں خشکی کے راستے جا رہا ہوں۔

شام کو چھ بجے پیرس سے ریل روانہ ہوئی۔ زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ ایک کونے میں میں دبک کر سو گیا۔ رات کے کوئی بارہ بجے تھے کہ ایک کرخت آواز نے جگا دیا۔

ہیل ہٹلر!

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک جرمن فوجی افسر وردی پہنے خوفناک مونچھوں پر تاؤ دیئے کھڑا ہے اور ہیل ہٹلر کے نعرے لگا رہا ہے۔ موجودہ جرمنی میں ہر شخص کے دماغ اور ہر شخص کی زبان پر ہٹلر سوار ہے۔ سلام علیک نمستے، کورنش کے بجائے ہیل ہٹلر ہی کہنا پڑتا ہے۔ جس کے معنیٰ 'ہٹلر زندہ باد' سمجھئے۔ میں ہٹلر زندہ باد کیوں کہتا۔ میں نے افسر کے سلام کا جواب مہاتما گاندھی کی جے سے دیا۔ وہ سمجھا۔ یہی میرے ملک کا دستور ہوگا اس لیے کوئی اعتراض نہ کیا اور

معائنے کے لیے پاسپورٹ طلب کیا۔ سامان کی تلاشی لی تو اس کو بڑا تعجب ہوا کہ میرے پاس ایک چھوٹے سے اٹیچی کیس (جس میں چند قمیص اور دورات کے سونے کے پاجامے اور لکھنے پڑھنے کا سامان ہے) اور ٹائپ رائٹر کے سوا کوئی سامان ہی نہیں۔ اپنا باقی سامان میں نے بار برداری کے جہاز سے ہندوستان روانہ کر دیا تھا۔ ورنہ اس ریل کے سفر میں بڑی دقّت ہوتی۔

ریل کوئی آدھ گھنٹے تک جرمنی کی سرحد پر کھڑی رہی اور فوجی افسروں نے نہایت سختی اور بدتمیزی کے ساتھ مسافروں کے پاسپورٹوں اور سامان کا معائنہ کیا۔ اس ملک میں داخل ہوتے ہی معلوم ہو گیا کہ یہاں فوجی حکومت ہے اور غیر ملکیوں کو نفرت اور حقات کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

نازی شہر:

میونچ۔ 6 نومبر — صبح کے ساڑھے چھ بجے ریل یہاں پہنچی۔ میں نے جرمن انگریزی ڈکشنری کی مدد سے اسٹیشن کے ہوٹل میں ناشتہ کیا اور سامان اسٹیشن ہی پر چھوڑ کر شہر کی سیر کو نکلا۔ ہر جگہ جھنڈے، ہر جگہ سواستیکا کے نشان، ہر جگہ ہٹلر کی تصویریں۔ اس کو کہتے ہیں شخصی حکومت، اس کو کہتے ہیں ڈکٹیٹرشپ۔

میونچ کا شہر پرانا مگر صاف ستھرا اور خوب صورت ہے۔ اتوار ہونے کی وجہ سے آج شہر پر خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ سردی خوب ہے، مگر آسمان صاف ہے اور دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ ہزاروں برس سے یہ شہر جرمن تمدن اور آرٹ کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کی تاریخی عمارتیں، آرٹ گیلریاں اور باغات قابل دید ہیں۔ مگر آج میونچ ہٹلر کی نازی بربریت کا گہوارہ ہونے کی حیثیت سے مشہور ہے۔ میں نے وہ زمیں دوز شراب خانہ جا کر دیکھا جہاں ہٹلر نے تقریریں کر کے اپنی نازی پارٹی کو قائم کیا تھا۔ اس شہر میں ان نازیوں نے کئی بار قتل و غارت کا بازار گرم کیا ہے اور پرسوں اسی قسم کے کسی کارنامے کی یادگار منائی جائے گی۔ اسی لیے تمام شہر کو نازی جھنڈوں اور نشانوں سے سجایا گیا ہے۔ ہر جگہ وردیاں پہنے ہوئے فوجی افسر اور نازی پارٹی کے ممبر اکڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک آرٹ گیلری کو میں دیکھنے گیا۔ مصوری کے نادر اور نایاب نمونوں سے بھری ہوئی ہے مگر ان کو دیکھنے والا میرے سوا ایک اور آدمی تھا جو شکل سے کوئی یہودی

مُصوّر معلوم ہوتا تھا۔ نازی حکومت میں جنگ، قتل وخون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ آرٹ کو تباہ کیا جاتا ہے، لٹریچر کو جلایا جاتا ہے۔

ہندوستانی طالب علم:

گھومتا گھامتا میں طالب علموں کے ایک ہوسٹل میں پہنچ گیا۔ یہاں زیادہ تر غیر ملکی طالب علم رہتے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ چند ہندوستانی بھی ہیں۔ تلاش کر کے ان کو ڈھونڈ نکالا۔ پہلے تو وہ بڑے تپاک سے ملے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں جب ان کو معلوم ہوا کہ اخبار بمبئی کرانیکل کا نمائندہ ہوں تو ان سب کو کوئی نہ کوئی کام یاد آ گیا۔ ایک نے کہا: 'مجھے لائبریری جانا ہے۔' دوسرا بولا: '' معاف کیجیے آپ ایسے غلط دن آئے جب مجھے اپنے پروفیسر سے ملنے جانا ہے۔ ورنہ آپ کو ضرور شہر کی سیر کراتا۔ دو تین لڑکے رہ گئے اور مجھ سے ہٹلر اور نازی حکومت کی تعریف کرنے لگے۔ جب میں نے ان کے نقطۂ خیال کی تردید کی اور ہٹلر کے ظلم اور جبر کا ذکر کیا تو وہ بہت گھبرائے اور کوئی بہانہ کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب میرے ہم قوم مجھ کو اکیلا چھوڑ گئے تو میں نے چند امریکن طالب علموں سے دوستی کی۔ ان میں سے بھی چند ہٹلر کے موافق تھے مگر اس وجہ سے انھوں نے میرا بائیکاٹ نہیں کیا بلکہ ہر طرح سے میری مدد کی اور میرے ساتھ جا کر شہر کی سیر کرائی۔''

شام کو میں ایک موٹر بس میں مضافات کی سیر کو گیا۔ میونچ کے قریب ہی ایک پہاڑی پر برکٹس گاڈن BERCHTESGADEN کا چھوٹا سا خوب صورت گاؤں ہے۔ اس جگہ ہم نے ہٹلر کا وہ بنگلہ دیکھا۔ جہاں چیمبرلین صاحب نے یورپ کے امن کو جرمن کے خونخوار حکمراں کے ہاتھوں بیچ دیا۔

وی آنا:

وی آنا 7 نومبر ـــ رات میونچ سے روانہ ہو کر صبح وی آنا پہنچا۔ کسی زمانے میں یہ شہر یورپ کی سب سے بڑی سلطنت کا دارالخلافہ تھا۔ آسٹریا کے شہنشاہ آدھے یورپ پر حکومت کرتے تھے۔ آج آسٹریا ہٹلر کے جرمنی کا ایک صوبہ ہے۔ وی آنا پر اسی طرح برلن سے حکومت کی جاتی ہے۔

جس طرح دہلی پر لندن سے۔ وی آنا پرانی تاریخی عمارتوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر قدم پر عظیم الشان محل، شاندار عمارتیں، باغات، مجسمے اور دوسری تاریخی یادگاریں نظر آتی ہیں۔ پچھلے سال تک دنیا کے کونے کونے سے سیاح وی آنا کی سیر کو آتے تھے۔ اس شہر کی آدھی آبادی کا دارومدار سیاحوں کی آمدورفت پر تھا۔ جب سے آسٹریا پر ہٹلر نے قبضہ کرلیا ہے، سیاحوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ملک کی اقتصادی زندگی پر بھی جرمن سرمایہ داروں اور جرمن حکومت کا تسلط قائم ہو چکا ہے۔ آسٹریا کی وہی حالت ہے جو یورپین حکومتوں کی ایشیائی اور افریقی نوآبادیات اور مقبوضات کی ہے۔

یہودی:

وی آنا میں بہت سی دکانیں بند ملیں۔ ان پر بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے جبراً ان کو بند کرا دیا ہے کیونکہ ان کے مالک یہودی تھے۔ یہودیوں کی چند چھوٹی چھوٹی دکانیں اب بھی ہیں مگر ان پر بھی پوسٹر لگے ہیں جن میں جرمن نسل کے شہریوں کو تاکید کی گئی ہے کہ یہاں سے کوئی خرید وفروخت نہ کریں۔ میں جان بوجھ کر ایک یہودی کی دوکان میں تصویریں خریدنے کے لیے گھس گیا۔ جب باہر آیا تو ایک باوردی نازی نوجوان نے مجھے نہایت کرخت لہجے میں ڈانٹنا شروع کیا مگر ''زبان یارمن ترکی'' والا مضمون تھا۔ اس لیے میں نے جرمن ڈکشنری نکالی اور اس سے یہ الفاظ کہہ کر کہ ''میں جرمن نہیں بول سکتا۔'' چھٹکارا پایا۔

تمام شہر کی سڑکوں کے کنارے دونوں طرف چلنے پھرنے والوں کے آرام کے لیے درختوں کے نیچے بنچیں پڑی ہوئی ہیں۔ ان بینچوں پر موٹے موٹے سفید حرفوں میں لکھا ہوا ہے ''صرف آرین نسل کے لوگوں کے لیے۔'' کوئی ان بینچوں پر نہیں بیٹھ سکتا۔ میں نے دیکھا کہ ایک بڑھیا یہودن جو بازار سے ترکاری وغیرہ کا بھاری تھیلا لٹکائے آرہی تھی تھک کر ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ فوراً ایک سپاہی نے آکر اسے اٹھا دیا اور بُری طرح سے ڈانٹا۔ میں نے سوچا، کیا یہی مہذب یورپ ہے؟ کیا یہی جرمن تمدن ہے؟ ہندوستان میں ہم چھوت چھات اور ذات پات کی سختیوں کو دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور جرمنی میں نازی حکومت اسی چھوت چھات کو اختیار

کر رہی ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ نازیوں نے جرمنی اور آسٹریا کے یہودیوں پر کیا کیا ظلم ڈھائے ہیں۔ ان کو قتل کیا گیا ہے، جیلیں یہودیوں سے بھر دی گئی ہیں۔ ان کو بے گھر، بے در کر دیا گیا ہے۔ ان کی دوکانوں اور کاروبار کو ضبط کر لیا گیا ہے۔ مگر پھر بھی اس بڑھیا کا بینچ سے اٹھایا جانا، مجھے ایک ناقابل برداشت ظلم محسوس ہوا۔ وی آنا میں بہت سے خوب صورت مناظر دیکھے۔ خصوصاً شہر کے باہر باغات کا منظر نہایت دل کش ہے۔ مگر میں نے طے کر لیا کہ اب پھر کبھی وی آنا نہ جاؤں گا۔ جب تک وہاں بوڑھی یہودی عورتوں کو شہر کی سڑکوں کے کنارے بینچوں پر بیٹھنے کی اجازت نہ ہوگی۔

ہنگری:

8 نومبر — وی آنا سے بوڈاپسٹ کا فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ شام کو وی آنا سے روانہ ہوا اور رات کو نو بجے ہنگری کے سب سے بڑے شہر بوڈاپسٹ پہنچ گیا۔ راستے میں ایک ہم سفر نے ایک ہوٹل کا نام بتا دیا تھا۔ فوراً ٹیکسی کر کے وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ شہر کے سب سے بڑے اور مہنگے ہوٹل میں پہنچ گیا ہوں۔ تین رات کا جاگا ہوا تھا۔ اس لیے ہمت نہ پڑی کہ اتنی رات گئے کوئی سستا ہوٹل تلاش کروں۔ ایک چھوٹا سا کمرہ (تقریباً دس روپے روز پر) کرائے پر لیا اور کھانا کھا کر جو صاف اور نرم بستر پر لیٹا تو صبح کے نو بجے آنکھ کھلی۔

بوڈاپسٹ دراصل ایک شہر نہیں دو شہر ہیں۔ دریائے ڈینیوب کے ایک کنارے پر بوڈا آباد ہے اور دوسرے کنارے پر پسٹ۔ ہنگری میں زیادہ تر جپسی قوم کے لوگ آباد ہیں۔ جن کی شکل و صورت بہت کچھ ہم ہندوستانیوں سے ملتی جلتی ہے۔ کھانے میں بھی ہماری طرح مصالحہ پڑا ہوتا ہے اور چٹ پٹا ہوتا ہے۔

اس شہر کا چڑیا گھر تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اس کو جا کر دیکھا۔ واقعی نہایت خوب صورت اور دل کش باغات میں جانوروں کو رکھا گیا ہے۔ شام کو دریا کے کنارے بھی بہت خوب صورت سماں ہوتا ہے۔

ہنگری کا سب سے بڑا قومی مسئلہ ہندوستان کی طرح زمینداری کا ہے۔ تمام ملک کی زمین پر بڑے بڑے زمینداروں کا قبضہ ہے جو غریب کسانوں پر طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں۔

دولت سمٹ کر چند سو خاندانوں میں آ گئی ہے اور باقی تمام آبادی بڑی مفلسی کی زندگی گزارتی ہے۔

سیاسی صورت حال یہ ہے کہ ہٹلر اور مسولینی دونوں ہنگری کے سیاست دانوں پر خوب روپیہ صرف کر رہے ہیں اور نازی اور فاشی پروپیگنڈا زوروں پر ہو رہا ہے۔ حکومت نازی قسم کی ہے اور مزدوروں اور کسانوں پر کافی سختیاں جائز رکھتی ہے۔ مگر پھر بھی جرمنی اور اٹلی سے خائف ہے۔ کبھی ایک طرف جھکتی ہے اور کبھی دوسری طرف۔ ہنگری کو شکایت ہے کہ پچھلی جنگ میں اس کے بعض صوبے رومانیہ کے حوالے کر دیے گئے تھے۔ ان کی واپسی کا مطالبہ آج کل زور شور سے ہو رہا ہے اور ہٹلر اور مسولینی کے ایجنٹ دونوں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

رومانیہ:

10 نومبر — بوڈاپسٹ میں دو دن قیام کرنے کے بعد رات کی ٹرین سے روانہ ہو کر آج صبح رومانیہ کے سب سے بڑے شہر بکارسٹ پہنچا۔ بکارسٹ پہنچنے سے پہلے ہی ٹرین میں سے تیل کے کنوئیں نظر آئے۔ کہیں کہیں دیکھا کہ فالتو تیل کے جوہر بن گئے ہیں۔ رومانیہ میں تیل کی کثرت ہے۔ کیونکہ ملک غریب ہے اس لیے برطانیہ، فرانسیسی، امریکن اور جرمن سرمایہ داروں نے تیل کے ٹھیکے لے رکھے ہیں۔ ان تمام ملکوں کو رومانیہ کے اس تیل کی سخت ضرورت ہے خصوصاً جرمنی کو۔ اس لیے کہ ہٹلر کی جنگی مشینوں کے لیے تیل یہیں سے دریائے ڈینیوب کے راستے جاتا ہے۔ اگر کسی دن رومانیہ یورپ کی خانہ جنگی میں پھنسا تو اس کی وجہ یہی فالتو تیل ہوگا۔ تیل کے چشموں کو جنگ کی آگ سے دور ہی رکھنا چاہیے۔ معلوم نہیں کس وقت بھڑک اٹھیں۔

ہنگری میں بھی مفلسی ہے مگر رومانیہ میں جو حالت دیکھی وہ اس سے بھی ابتر ہے۔ دسمبر کی سردی میں کسانوں کے غریب بچے، میلے چیتھڑوں میں ٹھٹھرتے ہوئے ریلوے اسٹیشنوں پر سیب بیچنے آتے ہیں۔ ان کے چہروں پر بھوک اور مصیبت کے نشان پڑے ہوئے ہیں، بکارسٹ خاصا اچھا شہر ہے۔ مگر یہاں بھی جہالت، غربت، گندگی اور بھک منگوں کی کثرت ہے۔ ہندوستان کے بعد اگر میں نے کسی ملک میں اتنی مفلسی دیکھی ہے تو وہ رومانیہ ہے۔

ہنگری کی اقتصادی حالت کے ذمہ دار وہاں کے زمیندار ہیں۔ رومانیہ میں زمینداروں

سے زیادہ خون چوسنے والی جماعت فوجی افسروں کی ہے جو ہر جگہ بھڑکدار وردیاں پہنے اکڑتے نظر آتے ہیں۔ ملک کی دولت کا زیادہ حصہ ان کی رنگ رلیوں پر خرچ ہوتا ہے۔

نازی پروپیگنڈا کی وبا رومانیہ میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ اکثر سیاست داں اور حکومت کے بڑے افسر ہٹلر سے تنخواہ پاتے ہیں۔ نازی خیالات رکھنے والی کئی جماعتیں بھی ہیں۔ جن کے ممبر شورش کرتے رہتے ہیں۔ تعلیم برائے نام ہے۔ اخبارات کی آزادی سلب ہے۔ جاسوسوں کے خوف سے کوئی زبان نہیں کھول سکتا۔ مزدور اور کسان منظم نہیں ہو سکتے۔ غرض پورا نازی ماحول موجود ہے مگر بادشاہ کیرول CAROL یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ برطانیہ کا ساتھ دے یا جرمنی کا۔ دونوں حکومتوں سے ساز باز ہو رہی ہے۔ جب تک رومانیہ میں تیل کے ذخیرے موجود ہیں۔ سب حکومتوں کی آنکھیں اس ملک پر لگی رہیں گی۔

مگر آج ایسی خبر ملی ہے جس سے فی الحال تمام دنیا کی توجہ ترکی کی طرف مبذول ہوگئی ہے۔ آج صبح موجودہ ترکی کا معمار، ترکوں کا محبوب لیڈر اور حکمراں اتاترک کمال اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

میں پہلی ٹرین سے استنبول کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔

استنبول:

11 نومبر — جہاز آہستہ آہستہ درّہ دانیال کے درمیان سے گزرتا ہوا بندرگاہ کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ جہازوں پر اور ساحل کی عمارتوں پر جو جھنڈے لگے ہیں وہ سب سرنگوں ہیں۔ ترکی میں کمال اتاترک کا ماتم ہو رہا ہے۔

استنبول جس کو بچپن میں ہم قسطنطنیہ کہا کرتے تھے بالکل ایشیائی وضع کا شہر ہے جو کئی پہاڑیوں پر آباد ہے۔ تنگ پتھریلی سڑکیں، پرانے مکانات، مسجدوں کے گنبد اور مینار مگر لباس بالکل مغربی ہے۔ ترک اور یورپین میں تمیز کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ ترک بھی گورے چٹے ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں کسی گلی میں کوئی ضعیف عورت سیاہ برقع پہنے نظر آ جاتی ہے۔ ماضی کی ایک یادگار۔ ورنہ عام طور سے عورتیں یورپ اور امریکہ کی طرح آزاد پھرتی ہیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ پردہ کرنا جرم ہے۔ مگر ہاں زبردستی کسی عورت کو پردہ کرنے پر مجبور کرنا ضرور جرم ہے۔

استنبول کی اونچی نیچی گلیوں میں، ہوٹلوں میں، چائے خانوں میں جدھر بھی جاؤ بس ایک ہی ذکر ہے، اتاترک۔ ایک اسکول کی لڑکی نے مجھ سے کہا افسوس ہے آپ ہمارے ملک میں اس وقت آئے جب ہم اپنے باپ کا ماتم کر رہے ہیں۔ باپ کا ماتم! ہر طرف میں نے یہی فقرہ سنا۔ اتاترک کی موت فقط ملک کے حکمراں اور محبوب رہنما کی موت نہیں ہے بلکہ ہر ترک مرد اور عورت اور بچے کے لیے ذاتی سانحہ ہے۔ واقعی کمال اتاترک — لڑکوں کا باپ — تھا۔!

مسجدیں:

استنبول میں تاریخی مقاموں کی کمی نہیں ہے۔ کسی زمانے میں عیسائیوں کی مشہور زیارت گاہ تھی۔ دنیا بھر سے عیسائی یہاں کے گرجاؤں کی زیارت کرنے آتے تھے۔ پھر مسلمانوں کا دور دورہ ہوا۔ ہر خلیفہ نے مسجدیں اور محلات تعمیر کیے۔ یہ مسجدیں واقعی قابل دید ہیں ان کے گنبد ہماری مسجدوں کے گنبدوں سے مختلف ہیں۔ ہمارے ہاں پیاز کی شکل کے گنبد ہوتے ہیں اور یہاں بیٹھے بیٹھے، آدھے کٹے ہوئے، سیب جیسے مینار پتلے اور مخروطی اور اکثر ایک ہی مسجد میں فقط ایک ہی مینار۔ میں نے دیکھا کہ باوجود اس قدر مغربیت کے اب بھی استنبول کی مسجدوں میں نمازیوں کی کمی نہیں ہے۔ نماز عربی ہی میں ہوتی ہے مگر خطبہ ترکی زبان میں پڑھایا جاتا ہے۔ لاطینی رسم الخط عام طور سے استعمال ہوتا ہے یہاں تک کہ مسجدوں میں اوقات نماز بھی اسی رسم الخط میں لکھے ہوتے ہیں۔

ہندوستانی بھائی:

دنیا کے کسی کونے میں جاؤ۔ ہندوستانی وہاں موجود ہوں گے میں 'آیا صوفیہ' دیکھنے گیا۔ کسی زمانے میں یہ عیسائیوں کا گرجا تھا۔ جس کی زیارت کو تمام یورپ سے لوگ آتے تھے۔ جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ مگر یہ بات غور طلب ہے کہ گرجا کو مسجد بنانے پر بھی مسلمان فاتحوں نے مصوری کے ان نایاب شاہکاروں کو تباہ نہیں کیا جو اس گرجا کی دیواروں پر لگے ہوئے تھے بلکہ ان پر کپڑا چڑھا کر ان کو چھپا دیا گیا۔ موجودہ ترکی حکومت کے حکم سے یہ عمارت آج نہ گرجا ہے نہ مسجد بلکہ صرف ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ دیواروں پر سے کپڑا ہٹا دیا گیا ہے اور کئی سو سال پرانی رنگین تصویریں آج

بھی قابل دید ہیں۔

'آیا صوفیہ' کے باہر تقریباً ایک درجن پیشہ ور رہنماؤں GUIDES نے گھیر لیا جو غیر ملکی سیاحوں کو شہر کی تاریخی عمارتوں کی سیر کراتے ہیں۔ میری شکل سے ان کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ میں کس ملک کا رہنے والا ہوں۔ اس لیے بیک وقت انھوں نے مجھ سے انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی، اٹالین، فارسی اور عربی میں گفتگو شروع کر دی۔ میں نے مذاق میں پوچھا ''کوئی ہندوستانی بھی جانتا ہے۔'' ایک آواز آئی '' کیوں نہیں۔ میں دہلی کا رہنے والا ہوں۔'' کوئی ساٹھ برس کی عمر کا ایک دبلا پتلا چھوٹا سا شخص جو اوروں کی طرح یورپین لباس پہنے ہوئے تھا۔ گروہ سے الگ ہوکر میرے پاس آیا اور بڑے تپاک سے ملا۔ اس کا نام محمود ہے اور وہ ہجرت کی تحریک کے زمانے میں ہندوستان چھوڑ کر افغانستان، ایران اور شام ہوتا ہوا ترکی آ گیا تھا۔ جب سے یہیں مقیم ہے۔ شادی بھی ایک ترکن سے کر لی ہے اور کئی بچے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو غازی محمود کہتا ہے کیوں کہ اناطولیہ کی لڑائی میں کمال کی فوج میں وہ بھی شامل تھا۔ حالانکہ اس کو اتنا عرصہ ترکی میں رہتے ہوئے ہو گیا ہے مگر پھر بھی ہندوستان واپس جانے کی حسرت ہے۔ مجھ سے کہنے لگا۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ جب میرا ملک آزاد ہو جائے گا تب ہی واپس جاؤں گا۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ اس انتظار میں عمر نہ تمام ہو جائے۔'

انگورا:

استنبول سے رات کو روانہ ہوکر صبح سویرے میں انگورا پہنچا۔ استنبول تاریخی مقام ہے۔ وہاں ہر عمارت پرانی ہے۔ گلیاں تنگ اور اونچی نیچی ہیں برخلاف اس کے انگورا اتنا نیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کل ہی بن کر تیار ہوا ہے بلکہ ابھی مکمل طور سے تیار بھی نہیں ہوا۔ سینکڑوں عمارتیں ابھی زیرِ تعمیر ہیں۔ استنبول میں پرانا مشرقی اثر اب بھی نظر آتا ہے۔ مگر انگورا بالکل ایک مغربی شہر ہے۔ عمارتیں، لوگوں کا لباس، طرز رہائش غرض ہر لحاظ سے انگورا اور کسی یورپین یا امریکن شہر میں تمیز کرنا مشکل ہے۔

آج سے پندرہ برس پہلے انگورا خشک ریگستان میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ آج یہ ترکی کا

دارالخلافہ ہے۔ گورنمنٹ کے تمام دفتر، پارلیمنٹ کی عمارت، غیر ملکی سفارتخانے سب یہیں پر ہیں۔شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک پہاڑی کی چوٹی پر کمال اتاترک کا مکان ہے۔ جہاں سے نئی ترکی کا یہ معمار اپنے بنائے ہوئے شہر کو بڑھتا اور آباد ہوتا ہوا دیکھا کرتا تھا۔ انگورا کو دارالخلافہ بنانے میں کمال کی بڑی مصلحت تھی۔ استنبول میں پرانے خلافت کی دور کی روح سمائی ہوئی تھی۔ وہاں کی آبادی قدامت پسند اور کمال کی اصلاحات کی مخالف تھی۔ وہاں درباریوں کی کثرت تھی اور مستعدی سے کام کرنے والوں کی کمی۔ نئی ترکی کے لیے ایک نئے شہر کی ضرورت تھی اور اس لیے انگورا تعمیر ہوا۔ شہر کے بیچوں بیچ ایک چوراہے پر کمال اتاترک کا مجسمہ نصب ہے، گھوڑے پر سوار رات اور دن اپنے شہر اور اپنے ملک کی خبر گیری کرتا ہے۔ اس مجسمہ کے چار کونوں پر ترکی کی جنگ آزادی کی یادگار کے لیے ترکی سپاہیوں کے مجسمے ہیں۔ ان میں سے ایک عورت کا مجسمہ ہے جو اپنے کاندھے پر ایک بڑا بم گولہ اٹھائے ہوئے چلی جا رہی ہے۔ یہ ان بہادر عورتوں کی یادگار ہے جنہوں نے اپنے بھائیوں اور شوہروں کے دوش بدوش اپنے ملک کی آزادی کی خاطر جنگ میں حصہ لیا اور اپنی جانوں کی قربانی دی۔ موجودہ ترکی کی عورتوں کو سیاسی اور سماجی میدانوں میں جو برابری اور آزادی آج حاصل ہے وہ انھوں نے اپنا خون بہا کر حاصل کیا ہے۔

تعلیم:

ترکی میں سب سے زیادہ حوصلہ انگیز منظر بچوں اور بچیوں کے گروہ ہیں جو صبح کو اسکول جاتے نظر آتے ہیں۔ ہر شہر، قصبہ اور گاؤں میں بچوں کی تعلیم لازمی ہے اور مفت ہے۔ کتابیں بلکہ اسکول کا مخصوص لباس بھی حکومت مہیا کرتی ہے۔ جوں جوں تعلیم پھیلتی جاتی ہے ترکی میں قومی زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ رہی ہے۔ نہ صرف عوام کی تمدنی حالت بہتر ہوتی جاتی ہے بلکہ ان کی اقتصادی حالت میں بھی نمایاں ترقی نظر آتی ہے حکومت کی طرف سے ملک کے کونے کونے میں کارخانے کھولے جا رہے ہیں۔ زراعت کو نئے سائنٹیفک اصولوں پر ترقی دی جا رہی ہے۔ آبپاشی کے انتظام سے ریگستانوں میں پھلوں کے باغ لگائے جا رہے ہیں۔ غرض آزاد ترکی ترقی

کے راستہ پر ہے۔ کاش کہ میرے ملک والے بھی ترکی کی مثال سے سبق حاصل کرلیں۔

ترکی۔شام۔عراق:

انگورا سے رات کو روانہ ہوا۔ میرے ہم سفر ایک ایرانی اور ان کی بیوی ہیں جو سوائے فرانسیسی اور فارسی کے کوئی زبان نہیں جانتے ہیں، میں فارسی برائے نام ہی جانتا ہوں اور فرانسیسی کے تو دس لفظ بھی نہیں معلوم پھر بھی فارسی، اردو، انگریزی کو ملا کر اور اشاروں سے کام لے کر ان سے کافی دیر تک باتیں کرتا رہا۔

کھانا کھانے کی گاڑی میں چند امریکن نوجوانوں سے ملاقات ہوئی جو اسی راستے سے عرب جارہے ہیں۔ امریکن تیل کی کمپنیوں کو حال میں عرب میں ٹھیکے ملے ہیں اور یہ سب اسی سلسلے میں وہاں جارہے ہیں۔ تین انگریز بھی ہیں جو ایران جارہے ہیں۔ یہ بھی تیل کی کمپنیوں کے ملازم ہیں۔مگر اپنے قومی انداز میں دوسروں سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔نہ امریکنوں سے بات کرتے ہیں اور نہ مجھ سے۔مگر امریکنوں سے میری خوب دوستی ہوگئی۔ بے تکلف اور دلچسپ قسم کے نوجوان ہیں۔ ہندوستان کے متعلق بہت سے سوال کرتے رہتے ہیں۔جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے متعلق دنیا میں کتنی ناواقفیت ہے۔مثلاً ان میں سے ایک پوچھنے لگا کہ 'کیا بمبئی میں موٹریں ہوتی ہیں؟' میں نے مذاق میں جواب دیا:نہیں،ہم لوگ ہاتھیوں پر سوار ہوکر کام کو جاتے ہیں۔

اگلے روز سہ پہر کے پانچ بجے ہم شام کی سرحد پر پہنچے۔ ہمارے درجے میں آدھی درجن شامی گھس آئے اور چھت تک سامان لاد دیا۔فوراً ہندوستان کی یاد آئی۔ ان شامیوں میں مرد تو یورپین لباس پر ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور عورتیں سر سے پیر تک یورپین بلکہ فرانسیسی لباس میں ملبوس تھیں۔ رنگ گورا ہونے کی وجہ سے وہ بالکل اٹالین یا ہسپانوی معلوم ہوتی تھیں۔

رات کو آٹھ بجے ریل حلب پہنچی۔ یہ شام کا کافی بڑا شہر ہے۔ جو کسی زمانے میں اپنے آئینوں کے لیے مشہور تھا۔

صبح کو دو نوجوانوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک عراقی ہے جو انگلستان سے تعلیم ختم کر کے آرہا ہے۔ دوسرا شامی ہے، جو فرانس میں ہوائی جہاز کا کام سیکھ کر واپس آیا ہے۔ عراقی نے مجھے بتایا کہ گو اس کا ملک برائے نام آزاد ہے مگر ابھی تک برطانیہ کا اثر قائم ہے۔ عراق میں جتنا تیل نکلتا ہے اس کے ٹھیکے برطانوی کمپنیوں کو ملے ہوئے ہیں اور بصرہ برطانوی ہوائی راستوں کا زبردست مرکز ہے۔ شامی نوجوان سے معلوم ہوا کہ فرانسیسی گو اپنے آپ کو ایک جمہوری قوم کہتے ہیں مگر شام پر وہ اتنی ہی سختی کے ساتھ حکومت کرتے ہیں جیسے برطانوی اپنی نوآبادیات اور مقبوضات میں۔

نو بجے صبح ہم 'تل کوچک' پہنچے۔ ریل کی لائن یہاں ختم ہوگئی ہے۔ یہاں سے 'کرکوک' تک موٹر سے جانا ہوگا اور وہاں سے پھر ریل بغداد کے لیے ملے گی۔

'تل کوچک' سے روانہ ہونے کے ایک گھنٹہ بعد ہم نے شام کی سرحد کو پار کیا اور عراق میں داخل ہوئے۔ سڑک کیا ہے ریگستان میں موٹروں کی آمد ورفت سے ایک راستہ بن گیا ہے۔ اسی طرح اچھلتے کودتے ہم چلے جارہے ہیں۔

شام ہوتے 'موصل' پہنچے۔ رات کو ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ موصل ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں عراقیوں کی افسوسناک غربت کا پتہ چلتا ہے۔

اگلے روز صبح کو ایک بڑی لاری میں روانہ ہوئے جو خاص طور سے ریگستان کا سفر کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ اندر پینے کے پانی کا کافی ذخیرہ رکھا گیا کیونکہ راستہ میں کہیں اچھا پانی نہیں ملتا۔ دو چار گاؤں نظر آئے جہاں مفلسی موصل سے بھی بڑھی ہوئی نظر آئی۔

شام ہوتے 'کرکوک' پہنچے۔ یہاں تیل کے چشمے ہیں اور اس لیے انگریزوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ برطانوی سرمایہ داری کی چھاؤنیاں دنیا کے کس کونے میں نہیں ہیں۔

بغداد:

رات کو 'کرکوک' سے روانہ ہوکر صبح سویرے ریل بغداد پہنچی۔ شہر کو دیکھ کر مجھے تو ازحد مایوسی ہوئی۔ الف لیلہ کے قصے پڑھنے کے بعد بغداد کی موجودہ حالت دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ وہی

شہر ہے۔عمارتیں بھی نہ صرف شاندار نہیں ہیں بلکہ کوئی عربی یا مشرقی شان نہیں ہے۔ ہندوستان کا گھٹیا سا قصبہ معلوم ہوتا ہے۔ پہلی ہی دوکان پر سائن بورڈ نظر آیا۔''مخزن الہالی وڈ'' نوجوان عورتوں کو دیکھا کہ برائے نام برقعہ پہنے مزے سے منہ کھلے پھرتی ہیں اوران کے بناؤ سنگھار سے معلوم ہوتا ہے کہ عراق وعرب میں بھی ہالی ووڈ کا اثر موجود ہے۔

کربلائے معلیٰ:

بغداد سے ایک موٹر کرائے پر لے کر میں کربلائے معلیٰ کے لیے روانہ ہوا۔سڑک صحرا میں سے ہوکر گزرتی ہے۔ جہاں تک نظر جاتی ہے لق ودق ریگستان۔ دنیا کی سب سے بڑی ٹریجڈی یعنی واقعۂ کربلا کا منظر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اسی میدان میں حق و باطل کی لڑائی ہوئی تھی۔ یہیں بہتر خدا پرستوں نے ایک ظالم ڈکٹیٹر اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کیا تھا۔ کاش کہ دنیا کے ڈکٹیٹر اور جابر حکمراں اس واقعہ سے سبق حاصل کر سکتے۔ باوجود صاحبِ حکومت ہونے کے، باوجود اس کے لشکروں اور مال و دولت کے آج یزید کا نام لیوا دنیا میں ایک بھی موجود نہیں ہے۔ برخلاف اس کے امام حسین علیہ السلام کو ماننے والے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں ہر سال کربلائے معلیٰ کی زیارت کو آتے ہیں۔

کربلائے معلیٰ میں زیادہ تر زائر ہندوستانی ہی نظر آئے۔ امام حسینؑ کے روضے پر اتنا ہجوم تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔'خدام' کی وہی حالت دیکھی جو ہندوستان میں اجمیر وغیرہ کے مجاوروں کی ہے۔

بصرہ:

رات کو بغداد سے روانہ ہوکر ریل صبح سویرے بصرہ پہنچی۔ یہ عراق کی سب سے بڑی بندرگاہ ہونے کے علاوہ برطانوی ہوائی راستوں کا زبردست مرکز ہے۔ انگلستان سے ہندوستان۔ آسٹریلیا وغیرہ جو ہوائی جہاز جاتے ہیں وہ سب یہاں ٹھہرتے ہیں۔ پچھلی جنگ کے زمانے میں بہت سے ہندوستانی انگریزی فوجوں کے ساتھ یہاں چلے آئے تھے اوران میں سے کافی تعداد اب بھی یہاں آباد ہے۔ بصرہ میں عام طور سے ہندوستانی بولی اور سمجھی جاتی ہے اور

بندرگاہ پر زیادہ تر دوکانیں بھی ہندوستانیوں ہی کی ہیں۔

سہ پہر کو جہاز روانہ ہوا۔ یہ کراچی، بصرہ لائن کا چھوٹا سا جہاز ہے۔ جن بڑے بڑے جہازوں پر میں یورپ اور امریکہ میں سفر کر چکا ہوں ان کے مقابلے میں بالکل کھلونا معلوم ہوتا ہے۔ بغداد پہنچتے پہنچتے روپے بالکل ختم ہو گئے۔ اس لیے میں نے ڈیک کا ٹکٹ خریدا ہے۔ میرے ساتھ سوائے ایک کمبل کے اور کوئی بستر نہیں ہے، بصرہ سے ایک بوریا لے لیا ہے۔ مگر بھلا ہو بعض مہربان ہم سفروں کا کہ انھوں نے اپنے بستروں میں سے تکیہ، چادر، دری، سب کا انتظام کر دیا۔ اب میں مزے سے پاؤں پھیلا کر سو سکتا ہوں۔

اس سفر میں کوئی بات قابل ذکر نہیں پیش آئی۔ سوائے اس کے کہ میرے امریکن دوست جو اسی جہاز سے بحرین جا رہے ہیں اور فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہیں اکثر مجھ سے ملنے آتے رہتے ہیں۔ کل رات انھوں نے جہاز کے کپتان سے اجازت لے کر فرسٹ کلاس کے کھانے کے کمرے میں میری دعوت کی جس سے انگریز مسافروں کو سخت کوفت ہوئی۔

اس جہاز پر سفر کرنے سے معلوم ہوا کہ ہندوستانی حاجیوں اور زائروں کو جہاز کے سفر میں کتنی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس ڈیک پر میں ہوں اس کی لمبائی کوئی 60 فٹ اور چوڑائی 50 فٹ ہوگی۔ اتنی جگہ میں تقریباً 60 مسافر اپنے بستر جمائے ہوئے ہیں۔ تین گھوڑے، پانچ بھیڑیں اور درجنوں مرغیاں ہیں ہوٹل اور باورچی خانہ ہے۔ اس کے علاوہ اکثر مسافروں کا کھانا ان کی انگیٹھیوں پر پکتا رہتا ہے۔ سوئیزرلینڈ میں میں نے دیکھا کہ مویشیوں کے اصطبل کتنے صاف شفاف اور ہوادار ہوتے ہیں۔ ہم ہندوستانی مویشیوں سے بھی بدتر سمجھے جاتے ہیں اور افسوس یہ ہے کہ ہم کو مویشیوں کی طرح رہنے کی عادت بھی پڑ گئی ہے۔ جب ہی تو میرے اکثر ہم سفروں کو اس جگہ کی تنگی اور گندگی کا احساس ہی نہیں، شکایت کجا۔

ہندوستان کے ساحل پر اترنے سے پہلے ہی اس جہاز پر ہندوستان کا چھوٹا سا نمونہ مل گیا۔

پھر ہندوستان:

24 نومبر — آج صبح کراچی کی بندرگاہ پر جہاز لنگر انداز ہوا۔ پولیس والوں نے پاسپورٹ

کا معائنہ کیا۔ اسباب کی تلاشی لی، بہت سے سوال کیے۔

نام؟ باپ کا نام؟ پیشہ؟ کس غرض سے یہ سفر کیا؟ کراچی میں تقریر نہیں کرو گے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اب کیا شبہ ہے کہ میں ہندوستان واپس پہنچ گیا ہوں۔

ہندوستان:

ہندوستان — کراچی سے لاہور — اور لاہور سے پانی پت اور پانی پت سے بمبئی — برابر ریل گاڑی کی گڑگڑاہٹ میں یہی ایک لفظ سنائی دیتا رہا۔ ہندوستان، ہندوستان، ہندوستان، ہندوستان، ہندوستان جنت نشان، ہندوستان غلامستان۔

ہندوستان جہاں پانی کا بھی مذہب ہوتا ہے۔ ہندو پانی۔ مسلم پانی کی صدا ہر اسٹیشن پر سنی۔

ہندوستان جہاں دھوپ نکلتی ہے اور سورج نظر آتا ہے اور لندن کی طرح دن میں بھی اندھیرا نہیں چھایا رہتا۔

ہندوستان جہاں امریکہ سے بھی زیادہ امیر بستے ہیں اور رومانیہ سے بھی زیادہ مفلس۔

ہندوستان جہاں ریل میں مسافر جب کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو دوسرے ہم سفروں سے پوچھتے ہیں "آؤ بھائی۔ روٹی کھاؤ" اور انگریزوں کی طرح منہ پھیلائے خاموش نہیں بیٹھے رہتے۔

ہندوستان جہاں ایک وقت کا کھانا چار آنے میں بہت اچھا مل سکتا ہے۔ برخلاف امریکہ کے کہ جہاں ایک ڈالر میں (تین روپے میں) پیٹ مشکل سے بھرتا ہے۔

ہندوستان جو میرا وطن ہے۔ جس کی خوبیاں میری خوبیاں ہیں اور جس کی برائیاں میری برائیاں ہیں جو باوجود اپنی غلامی اور غربت اور جہالت کے دنیا کے بہت سے ملکوں سے بہتر ہے۔

جہاں علم کی کمی ہے مگر عقل کی کمی نہیں۔ جہاں لوگ غریب ہونے کے باوجود مہمان نواز ہیں۔ جہاں عوام میں پتھر کی مورتیوں کی پوجا ہوتی ہے مگر سونے کے سکوں کی نہیں۔ جہاں ایک لنگوٹی پوش فقیر کی عزت راجاؤں اور سرمایہ داروں اور سپہ سالاروں سے زیادہ ہوتی ہے۔

ہندوستان جس کا ماضی شاندار تھا اور جس کا مستقبل شاید اس سے بھی زیادہ شاندار ہوگا۔

پچیس ہزار میل کے سفر کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مجھے اپنے ملک سے کتنی محبت ہے۔

ریل پنجاب کے میدانوں پر دوڑتی جا رہی تھی اور کھڑکی کے باہر میری نگاہ کے سامنے غروب آفتاب کا منظر تھا۔ رنگ برنگ کے بادلوں نے آسمان کو چپ کا دوپٹہ پہنا رکھا تھا۔ کھیتوں میں کام کرنے کے بعد کسان ہل کاندھے پر رکھے بیلوں کو ہانکتے ہوئے آ رہے تھے اور دور کوئی بانسری بجا رہا تھا۔

اس ایک لمحے میں مجھے معلوم ہو گیا کہ سفر کی سب سے دلچسپ منزل آخری ہے۔ جب مسافر دنیا کی خاک چھاننے کے بعد گھر لوٹ آئے۔ یہی سفر کا انجام ہے اور یہی مسافر کا انعام۔

O

خواجہ احمد عباس (جون1914 - یکم جون1987) اردو کے متنوع منفرد ادیب ودانشور تھے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے، ناول بھی، ڈرامے ومضامین بھی لکھے اور فلم بھی، فلموں کے لیے مکالمے بھی لکھے اور ہدایت بھی دی، سفرنامے وسوانح بھی تحریر کیے اور اخبارات کے کالم بھی۔ وہ ایک نابغہ ادیب تھے اور تصنیف وتالیف ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے برسوں کی تلاش کے بعد ان کی تمام تر دستیاب تحریروں کو کلیات کی شکل دی ہے۔ 8 جلدوں پر مشتمل اس کلیات میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جو اردو اور ہندی میں الگ الگ عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک ڈرامہ ''لال گلاب کی واپسی'' جو بلٹز میں قسط وار شائع ہوتا رہا، ایک ساتھ پہلی بار شائع ہورہا ہے۔ فلمی دنیا کے ساتھ ساتھ ادبی شخصیات پر ان کے شائع شدہ مضامین کو بھی یکجا کردیا گیا ہے۔ یعنی پروفیسر ارتضیٰ کریم نے نہایت عرق ریزی سے خواجہ احمد عباس کے جملہ کام کو یکجا کرنے کا نہایت معرکۃ الآرا فریضہ انجام دے دیا ہے تاکہ موجودہ اور آنے والی نسل یہ جان سکے کہ ہمارے اکابرین نے سرمایۂ ادبِ اردو کے بیش بہا خزانوں کو کتنی عرق ریزی سے ہمارے لیے خلق کیا ہے تاکہ ہم اس تخلیقی میراث سے نہ یہ کہ صرف اخذ واستفادہ کریں بلکہ اس کو اور بیش بہا بنانے کی سعی بھی کریں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کو دنیائے ادب میں فکشن کے ناقد کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے انھیں کلاسیکی ادب سے خاص شغف ہے۔ کمیاب ونایاب متون کی تلاش اور اسے اہتمام کے ساتھ ادبی دستاویز بنانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ اردو دنیا موصوف کے جملہ مقالات وکتب سے بخوبی واقف ہے اور وہ داد وتحسین سے بھی نوازے جاتے رہے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

ISBN 978-93-87510-30-2
NCPUL
New Delhi

قیمت -/195 ₹
قیمت سیٹ -/1935 ₹